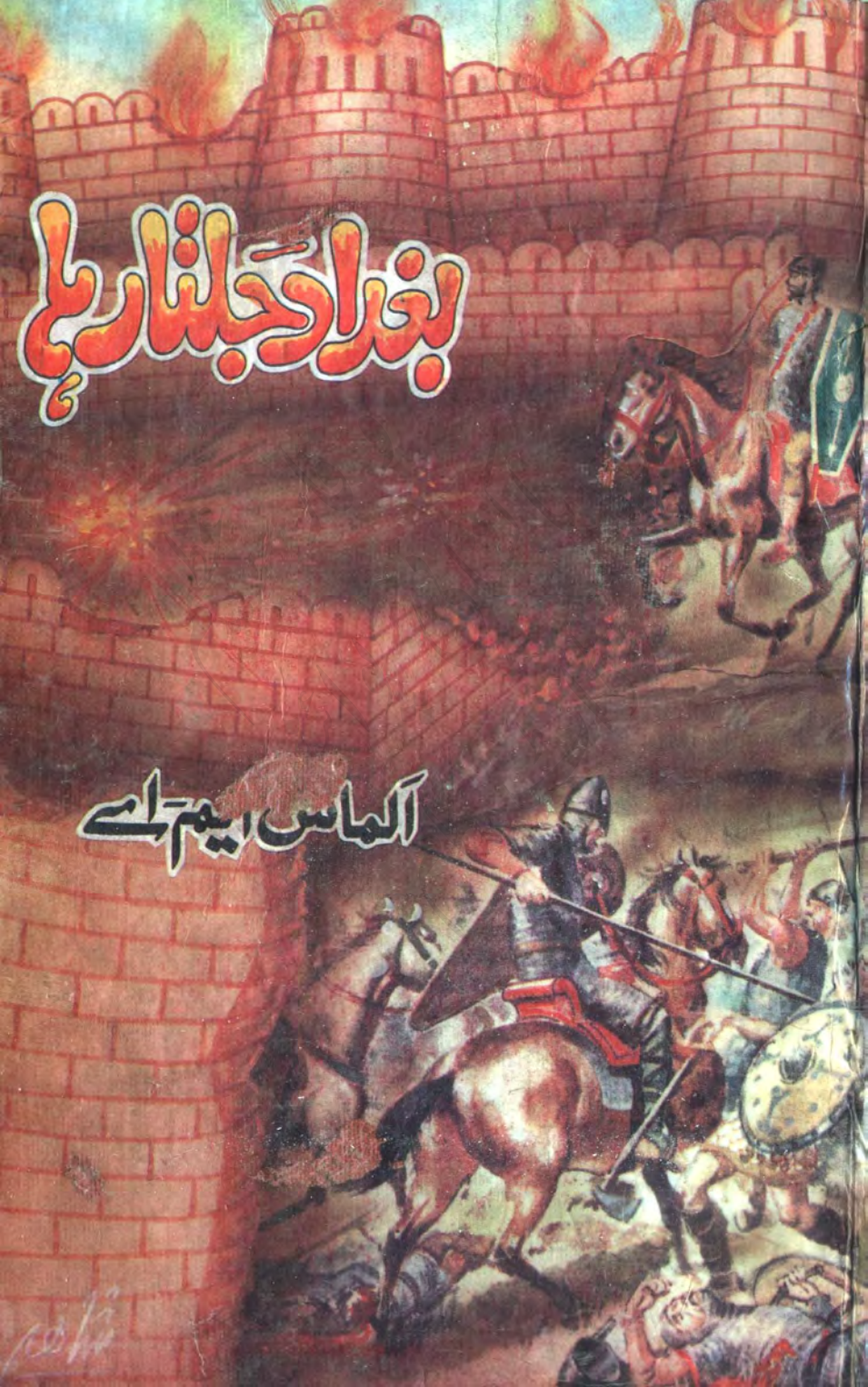


بغداد جلائی

آکماس ایم کے



①

چنگیزی ذہنیت

تیرہویں صدی عیسوی منگولوں کی قہر سامانیوں کے نام سے مشہور ہے۔
قہر سامانیوں کی یہ داستانِ اہم منگول وحشی چنگیز خان سے شروع ہو کر اس کے پوتے ہلاکو خان پر
عتم ہوتی ہے۔

خود پسند چنگیز خان کا تعلق منگول قوم سے تھا۔ منگول الگ الگ ٹبر یوں میں بٹے ہوئے تھے۔ یہ لوگ
چین کے شمال میں اور بھیل بیکال کے جنوب مشرق میں اونان اور کیرولان کے درمیان کی چراگاہوں میں مقامی
ٹبری سرداروں کی سرکردگی میں رہتے۔ چین کی کن حکومت کے سرحدی جنرل ان کو اس طرح منتشر رکھتے اور
روس کے ایک جنگجو یعنی تاتاریوں کو جو بھیل بویار کی چراگاہوں میں رہتا تھا، اس کو تنخواہ دیتے کہ وہ منگول
مزدوروں پر لگاتار حملے کرتا رہے۔

یہ منگول مریخیوں والے سردار ایسی پست حالت میں تھے کہ غلہ، کپڑے یا کوہنے کے ہتھیاروں کی فراہمی
میں یہ چینی تاجروں کے دست ٹکرتے۔

اسی قسم کے ایک پست خاندان میں اس سال جو منگولوں میں "خوگوش" کے نام سے پکارا جاتا ہے، ایک
کا پیدا ہوا جس کی مٹی میں بجے ہوئے خون کا ایک قطرہ تھا۔ دنیا میں یہ آیا تو اپنے ساتھ زندہ رہنے کی ہمت لایا۔
غیر خان کے قبیلہ کا نام کیا تھا اور قبیلہ والوں کی وجہ سے چنگیز خان کے خاندان کو قبیلہ سے خارج کر دیا تھا۔
برزخان جب شکار کھینے کے قابل ہوا تو اس کی ماں نے اسے سمجھایا:

"ہماری عزت کا یہ عالم ہے کہ ہمارے سایہ کے ساتھ ہمارا ساتھ دینے والا کوئی نہیں۔ ہمارا درد رست بھی

کوئی نہیں اور گھوڑے کی دم کے علاوہ ہمارے پاس کوئی کوڑا نہیں۔

چنگیز خان کے آباد اجداد "بورجی گون" کہلاتے تھے۔ یہ نیلے آنکھوں والے، دشت کی داستانوں کے باہر تھے۔ اس کی ماں اسے "بورجی گون" کی طاقت اور عظمت کی کہانیاں سناتی تھی۔ ان کی لٹکار سے پہاڑیاں گونج اٹھتی تھیں۔ ان کے ہاتھوں کی طرح مضبوط ہوتے اور وہ انسان کی فکر کو اس طرح مروڑ کے توڑ دیتے تھے جس طرح تیر کے دو ٹکڑے کیے جاتے تھے۔

جاٹوں کی ریخ بستہ راتوں میں یہ لوگ الاؤ بھلا کے اس کے کنارے ننگے بدن موتے تھے۔ ان پر انگارے بڑبڑ چٹنے لگے کرتے تھے اور یہ لوگ بغیر کوئی تاثر قبول کیے گھوڑے بیچ کے سوتے رہتے تھے۔

یہ جعبہ پیدا ہوا تو اس کے باپ نے اس کا نام "توجین" رکھا۔ اس نے اسے الٹ کر پٹ کے دیکھا اور اس کی نظر سب سے پہلے جس چیز پر پڑی اسی پر لڑکے کا نام رکھ دیا۔ یہ چیز یا تو کوہے کا ٹکڑا تھا یا لوہار جو ہسے کی کوئی چیز بنا رہا تھا۔ پھر کئی سال کے بعد خانہ بدوشوں نے اسے چنگیز خان کے ناک سے پکارنا شروع کیا۔

چنگیز ابھی شکار کھیلنے کے قابل بھی نہ ہوا تھا کہ دشمنوں نے اس کے باپ کو زہر دے کر مار دیا۔ اس زمانہ میں زیادہ تر امیر مغل زخاں جو کون خاندان کی خدمت پر مامور تھے، مکی وجہ سے منگول ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ توجین اور اس کا بھائی جو ہے اور اس طرح کے اور جانوروں کو پکڑنے کسی نہ کسی طرح بیٹ بھرتے تھے یا پھر بستے ہوئے چشموں سے چھیلیاں پکڑتے تھے۔ حالانکہ منگولوں میں چھیلیاں کھانا حرام سمجھا جاتا تھا۔

ایک بار اس کے ایک سوتیلے بھائی نے اس کی ایک بھلی چرالہ اس پر توجین نے اپنے ایک منہ بولے بھائی کا مدد سے اسے قتل کر دیا۔

توجین کے اس پہلے قتل کی تفصیل کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے کہ توجین اور اس کے منہ بولے بھائی نے "چور بھائی" کو ایک نیچے میں گھیر لیا۔ ان میں سے ایک سامنے کی طرف سے بڑھا اور دوسرا پشت کی طرف سے۔ سوتیلے بھائی ان دونوں کو جھک کرنے کی حالت میں دیکھ کر دو زانو ہو گیا اور توجین نے اسے تیر مار کر ختم کر دیا۔

یہ اس کی سفاکی کا پہلا نمونہ تھا۔

توجین کسی نہ کسی طور اس قدر پیٹ بھر لیا تھا کہ روح و جسم کا رشتہ بے قرار رہ سکے لیکن اس وحشی اور ظالم کے ہاتھوں متمدن دنیا کو جس قدر نقصان پہنچا اتنا نقصان گذشتہ بارہ سو سال میں (آٹا رین عیسوی سے) کسی اور وحشی کے ہاتھ سے نہ پہنچا تھا۔

لوگوں کو آج تک حیرت ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے شہروں کو آنکھوں سے دیکھا بھی نہ تھا اور جو کھانا پھٹا

نہ جانتا تھا اس نے ایشیا اور یورپ کا اتنا بڑا متمدن علاقہ کس طرح فتح کر لیا؟

لوگ چنگیز خان کو قہر خداوندی کہتے ہیں۔ اس معرکہ کو حل کرنے کے بجائے لوگ اسے مجزہ سمجھتے ہیں۔ منگول چنگیز خان کو جاودانی آسمان کی ایک روح کہتے ہیں۔

چنگیز متمدن معجزوں کا قائل نہ تھا۔ اس کی فتوحات میں شامل ایک ساتھی نے اس سے پوچھا:

"لوگ تمہیں ہیر و اور انہونی طاقت کا مالک سمجھتے ہیں۔ تمہارے ہاتھ میں ان فتوحات کی کیا کیا نشانیاں ہیں؟" چنگیز خان نے فوراً جواب دیا:

"زمین معجزوں کو مانتا ہے اور نہ نشانیاں کا قائل ہوں۔ میں اس مقام پر پہنچنے سے پہلے ایک بار پگندہ پیڑ چل رہا تھا۔ یہ پگندہ پیڑ ایک پل پر سے گزرتی تھی۔ وہاں چھ آدمی غصے قتل کرنے کے لیے چھپے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے اور کامیابی چڑھائیں۔ میں بے خوف تلواریں کھینچ کر ان کے مقابلہ پر ڈٹ گیا۔ انہوں نے مجھ پر تیر برسے لیکن ان کا کوئی تیر مجھے نہ لگا۔ میں نے ایک ایک کر کے ان سب کو قتل کر دیا اور آگے بڑھ گیا۔ واپسی پر جب میں اس پل پر سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ مقتول دشمنوں کے گھوڑے وہاں چر رہے ہیں۔ میں سب گھوڑوں کو ہٹا کر اپنے بچہ پر لے آیا۔"



چنگیز خان نے متمدن دنیا کو جس طاقت اور قوت سے زیر کیا وہ دراصل اس کی غیر معمولی "خود اعتمادی" تھی۔ زمانہ میں خود اعتمادی کا مطلب تھا کہ ہر مخالف سے مقابلہ کرنا اور اس پر فتح حاصل کرنا۔

ایک مرتبہ اس نے اپنے ساتھیوں سے سوال کیا:

"دنیا میں سب سے زیادہ اطمینان بخش چیز کیا ہے؟"

اس کے ساتھی کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے:

"تیر رفتار گھوڑے پر شکار۔ اس زمانہ میں جب گھاس ہری ہوا اور کھانسی پر شہباز بیٹھا ہو۔"

"نہیں۔ چنگیز خان نے رد کرتے ہوئے کہا:

"زندگی کا سب سے سرت بھرا لمحہ ہوتا ہے جب کوئی اپنے دشمن کو شکست دے چکا ہو۔ دشمن اس کے آگے آگے بھاگ رہا ہو اور وہ دشمن کی ہر چیز پر قبضہ کر چکا ہو۔ وہ اس کے وارٹوں کو بین کرتا ہے۔ دشمن کے گھوڑے اس کی ران کے نیچے ہوں اور دشمن کی حسین عورتیں اس کی آنکھوں میں ہوں۔"

بے شک۔ بے شک۔ اس کے ساتھیوں نے جواب دیا۔



چنگیز خان اور اس کے ساتھیوں کے چلنے کا انداز یہ ہوتا کہ ہر سوار کے پیچھے ایک نیزہ یا ایک خمیدہ تلوار لٹکتی ہوتی۔ دائیں طرف کھڑی یا پیچھے سینگوں سے کسی ہوتی کان اور بائیں جانب ترکش ہوتا جس پر ایک انگلیاں بہت آسانی سے پہنچ سکتی تھیں۔

دشت کے رہنے والے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ:

باب کا مرجانا اتنا برا نہیں

جتنا ماں کا مرجانا ہے۔

چنگیز خان کی ماں کسی اور قبیلے کی تھی اور جنگ میں قید ہو کر آئی تھی۔ اس کے باپ یوکائی سے اس کی اولاد ہوئی۔ یوکائی کو زہر دیا گیا تھا اس کے مرنے پر اس کی ماں نے بچوں کو کسی نہ کسی طرح پال کر زندہ رکھا۔ ان خورد سال بچوں کو اس کی ماں ان کے حیرانجی کی بھاری اور عظمت کی داستانیں سناتی تھی اور عزم اور محنت کا سبق دیتی تھی۔

چنگیز خان کی پہلی بیوی بورتانی اپنے جہیز میں سمور کا ایک کوٹ لائی تھی جو چنگیز خان کو دیا گیا تھا۔ پھر تاناریوں نے چنگیز کے قبیلے پر حملہ کیا۔ اس وقت چنگیز خان کا قبیلہ منتشر حالت میں تھا اس لیے تاناریوں سے شکست کھائی۔

تاناریوں نے قبیلے والوں کا تمام سامان لوٹ لیا اور کئی عورتوں کو بھی کپڑے کرے گئے۔ ان عورتوں میں چنگیز کی بیوی بورتانی بھی تھی۔ پھر جب چنگیز خان نے طاقت حاصل کی تو تاناریوں پر حملہ کر کے اپنی بیوی کو ان کے پیچھے سے چھڑا دیا۔

بورتانی جب واپس آئی تو اپنے ساتھ ایک حرامی بچہ بھی لائی۔

چنگیز خان نے اس بچہ کو اپنا سب سے بڑا بچہ بنا کے پالا اور اس کا نام جوچی خان رکھا۔

جب یہ لڑکا جوان ہوا تو چنگیز خان کے دوسرے بیٹوں نے جوچی کو اپنا بھائی ماننے سے انکار کر دیا۔ چنگیز نے اپنے لڑکوں کو بہت کھجایا کہ وہ جوچی کو اپنا بھائی مان لیں لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے۔

جھگڑے نے بہت طویل پڑا تو چنگیز خان نے جوچی کو مغربی علاقہ دے کر اسے قراقرم سے رخصت کر دیا۔

قراقرم منگولوں کا مرکز تھا اور وہیں خاقان یعنی منگولوں کا بادشاہ رہتا تھا۔ جوچی کو چنگیز خان نے یہ بھی حکم دیا کہ وہ قراقرم کو بھی واپس نہ آئے اور مغرب ہی میں اپنی سلطنت وسیع کرنے کی کوشش کرے۔

اس طرح چنگیز کی ناجائز اولاد مغرب میں منتقل ہو گئی اور اس نے وہاں ایک وسیع سلطنت قائم کی اور ان کا نام خاندان زریں خیل پڑا۔

یہ لوگ اپنے جیموں کے اوپر منہ سے پڑ لگاتے تھے۔ روس کے علاقہ میں ان کی حکومت تھی۔ جوچی خان کے مرنے کے بعد زریں خیل کی باگ ڈور اس کے بیٹے باتوخان کے ہاتھ میں آئی۔

باتوخان کا چھوٹا بھائی برقائی خان تھا جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ برقائی خان جنوبی علاقوں کا گورنر تھا اور چنگیز کے پوتے ہاکو خان نے اس کے علاقے سے گزر کر مصر جانے کی کوشش کی تھی۔ برقائی خان نے نہ صرف ہاکو خان کو راستہ دینے سے انکار کیا بلکہ فرج لے کر ہاکو خان کے مقابلے پر نکلا تھا۔

اس جگہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہمارا اصل موضوع "بغداد" ہے مگر بغداد تک پہنچنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے سرسری طور پر چنگیز خان کی فتوحات کا جائزہ لیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ چنگیز خان، بغداد کی سرحد تک پہنچنے کے بعد بغداد پر حملہ آور کیوں نہ ہوا۔ اور پھر اس کے پوتے ہاکو خان نے کن حالات میں خلافت عباسیہ کی جڑیں ہلکا کر رکھی تھیں۔

۱۱۷۹ء میں چین بیکان کے گرد بسنے والے سیکڑوں منگول قبائل نے چنگیز خان کو اپنا سردار چن لیا۔ چنگیز خان اگرچہ ایک نابالغ وحشی تھا لیکن اس نے وحشی منگولوں پر قابو پانے کے لیے اپنے دماغ کی صلاحیتوں کا بہترین طریقہ سے استعمال کیا۔ بارہ سال کے اندر اندر اس نے اپنے ارد گرد کے تمام علاقوں کو بزورِ شمشیر زیر کیا۔ چنگیز خان کا قول تھا:

جنگ میں شیروں کی طرح چھٹو اور

اس میں قریلوں کی طرح رہو۔

اس کا دوسرا قول تھا:

دن میں بوڑھے گرگ کی طرح حملہ کر دو اور

رات کو شہباز کی سی نظروں سے دیکھ کے دشمن پر چھٹو۔

چنگیز خان نے تمام عمر اپنے ان دونوں اقوال پر عمل کیا۔



منگول سپہ سالار کو بہت مقدس سمجھتے تھے۔ چنگیز خان کو اپنے سفر اہل کے قتل کا حال معلوم ہوا تو وہ بھڑک اٹھا۔ اس جیسے مزور اور وحشی منگول کے لیے اس کے انتقام کی ایک ہی صورت ہو سکتی تھی اور وہ تھی جنگ۔ چنانچہ اس نے اپنے اردو (شکر) میں جنگ کا اعلان کر دیا۔

خوارزم شاہ کا لشکر منگولوں کے لشکر سے بہت زیادہ تھا مگر چند ہی ہفتوں کی جنگ میں خوارزم شاہ کا عظیم لشکر تیز بہر ہو گیا۔ خوارزم کا بادشاہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اب اس کے پیچھے منگول اس طرح آ رہے تھے جیسے شکاری شکار کا پیچھا کر رہے ہیں۔ انہوں نے بحر کیسپین کے ایک جزیرے میں پناہ لی اور وہیں دہشت کے مارے انتقال کر گیا۔

خوارزم کا لشکر پھر مجتمع نہ ہو سکا۔ چنگیز خان نے اس یلغار میں شکار کے اڑا استعمال کیے۔ شتر فوج کیے جاتے یا ان سے دھوکے دے کر ہتھیار رکھ لیا جلتے۔ پھر چند دنوں میں شتر و گھوڑوں کے زمین کے برابر کر دیا جاتا۔

وحشی منگول بے بس انسانوں کے گروہ میں گھس جلتے اور تلواروں اور کلہاڑیوں سے انہیں اس طرح قتل کرتے جیسے بلی فصل کاٹی جاتی ہے۔ پیچھے دوڑ کر قتل کرنے والوں سے بچنے کے لیے ان کی طرف بھاگ دیتے تاکہ ان کی ریڑھ کی ہڈی پر ضرب لگا کر کٹائی سے توڑا جاسکے۔ مقابلہ کرنے والے مردوں کے سر پر کلہاڑی سے ضرب لگا کر توڑ دیا جاتا تھا۔ سفاکی کی یہ داستانیں اس قدر ہولناک ہیں جنہیں دہراتے ہوئے قلم کا پتہ ہے۔

غرضیکہ جہاں جہاں چنگیز خان پہنچا وہاں اس نے سفاکی، تباہی، بربادی اور بربیت کے اتنے گہرے نقشے چھوڑے کہ آئندہ ایک صدی تک وہ مقامات اور آبادیاں ان سے داغدار ہیں۔

خوارزمی لشکر منگولوں کی یلغار کو نہ روک سکا۔ شتر زادہ حمید بن سوج کے بھائی نکار منگول لوٹ مار کے بعد واپس چلے جائیں گے لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ منگول بھلائی کی طرف بڑھے۔ راستہ میں انہیں ان کا مقام پڑا۔ یہ حمید بن سوج تھے جن کے گورنر نے منگول تاجروں کو لوٹ کر انہیں قتل کر دیا تھا۔ چنگیز خان اس کے انتقام میں گورنر کو گرفتار کر کے اس کے کانوں میں چاندی گھسوا کے انڈیلوائی جس سے گورنر تڑپ تڑپ کے مر گیا۔

چنگیز خان کے تمام بیٹے اس یلغار میں شریک ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے ناجائز بیٹے جو جی خان نے بھی چند پر حملہ کر کے تباہی پھیلا دی۔

چنگیز خان انہیں تباہی کے بعد بخارا میں داخل ہوا۔ وہاں کی ایرانی فوج میدان چھوڑ بھاگی۔ اس کی تعداد بیس ہزار تھی۔

چنگیز خان کے سواروں نے ایرانی فوج کے ان بھاگنے والوں کو تیروں سے شکار کیا اور ان میں سے ایک ہزار نو سو سواروں کو بھی قتل کر دیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دشت کا یہ حاکم ممکن تھا کہ اپنی ملک و تاز کو دشت تک ہی محدود رکھتا لیکن اسے قد کی ستم ظریفی سمجھا جلتے یا پھر خوارزم شاہ کی نا عاقبت اندیشی کہ چنگیز خان کے علاقہ کا ایک منگول تاجروں کا قافلہ نہ صرف خوارزم شاہی علاقہ میں لوٹ گیا بلکہ انہیں قتل بھی کر دیا گیا۔

پھر جب چنگیز خان نے منگول تاجروں کے قتل کا معاملہ طلب کیا تو چنگیز خان کی سفالت کو دھنکا گیا اور یہی سبب بنا چنگیزی قیامت برپا ہونے کا۔

چین کے کتنے خاندان کا بادشاہ جو "زیر شہنشاہ" کہلاتا تھا، اس نے دیوار چین اس لیے تعمیر کرائی شمال مشرق میں آباد وحشی قبائل سے اس کی سلطنت محفوظ رہے لیکن جب چنگیز خان وحشی قبائل کا سردار بنا تو اس دیوار چین کو سفارت سے دیکھ کر کہا:

"فرزند آسمان کا لقب تو کسی بہت بڑے آدمی کو زیب دیتا ہے۔ یہ شخص جو کن حکومت کا مالک ہے یہ تو تخت پر بیٹھنے کے قابل بھی نہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے جنوب کی طرف تحو کر دیا۔

کتنے سپہ سالار اس پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ چنگیز خان نے ان پر حملہ کر دیا اپنے شہسواروں کی تیز رفتاری سے پورا قافلہ اٹھایا اور بڑے بڑے حلقوں میں چکر کاٹ کے چینیوں کی سہ فوج کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ قلعہ بند شہروں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا اور دیوار چین کا چکر کاٹ کر چینی میں قیامت ڈھاتا رہا اور جو کچھ آگے لگتا اسے لوٹ کے اسی راستے سے دیوار چین کے دوسری طرف پہنچ جاتا۔ چنگیز خان نے بہت جلد شمالی چین کو تہ و تاب کر دیا۔ اس کا ایک لشکر جنوبی چین کو روانہ ہوا تو وہ

وسط ایشیا کی سمت جو وہاں سے بارہ سو میل دور تھا۔

اس بوڑھے منغل کو خدا معلوم تجارت سے کیوں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس سلسلے میں اس نے منگول مغرب کی قریب ترین سلطنت خوارزم شاہ کے دربار میں بھیجا۔ خوارزم شاہ کی سلطنت اس زمانے میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ طاقتور سلطنت تھی مگر اس سلطنت کے سرحدی سوار نہایت بیوقوف تھے۔ منگول تاجروں کی بے جا بے جا سرحدی حکام نے ان کا مال و اسباب لوٹ لیا اور تاجروں کو قتل کر دیا۔

چنگیز خان کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے ایک سفارت کے ذریعے خوارزم شاہ کے دربار میں شکایت کی۔ خوارزم شاہ نے جب سرحدی حکام سے باز پرس کی تو اسے بتایا گیا کہ شمال کے بعض جاسوس خوارزم کے مشکوک حالت میں گھومتے رہے تھے انہیں گرفتار کیا گیا ہے۔ خوارزم شاہ نے مزید تحقیق کے بجائے چنگیز خان کو شکایت کر دی۔

چنگیز خان کے چار بیٹے تھے۔

جوجی (رجوچی) چغتائی اور تولوئی۔

جوجی خان جو چنگیز خان کا ناجائز بیٹا تھا وہ چنگیز کے حکم سے قراقرم سے ہمیشہ کے لیے مغرب میں چلا گیا تھا۔ اس نے روس کے علاقے میں ایک زبردست سلطنت بنائی تھی۔ یہ ذریعہ خیل کہلاتے تھے اور ان کے خیموں پر سنرے پر لہراتے تھے۔

چغتائی خان ذہین اور عقلمند تھا۔ مغل اسے اپنا بڑا بھتیجے اور مشورہ کرتے تھے۔

تولوئی چھوٹا بھائی تھا اور خاندانی الاؤ کا مالک تھا۔ مغلوں میں باب کے مرنے کے بعد سب سے چھوٹا بیٹا وراثت کا مالک ہوتا تھا۔

اوندائی خان کو سب بھائی چاہتے تھے۔ وہ بڑا بہادر لڑکھو صدر جو کاشترائی تھا۔

مغلوں کو گھوڑی اور خاص طور پر سفید گھوڑی کا دودھ بہت مغرب تھا۔ گھوڑی کے دودھ کو کئی کئی دن تک سٹرایا جلتا پھر اسے آگ پر پکاتے تھے۔ اس طرح وہ ایک قسم کی سمٹ اور تیز شراب ہو جاتی تھی جسے مغل بہت پسند کرتے تھے۔

چاروں بھائی اب چنگیز خان کی محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کے کان چنگیز خان کی آواز کو ترس گئے تھے۔ وہ یہ بھی محسوس کرنے لگے تھے کہ چنگیز خان کا کوئی جانشین ہو جسے اس کے ذریعہ خاندان کے سب شہزادے نامزد کریں۔ اس سلسلے میں چنگیز خان کا سب سے چھوٹا بیٹا تولوئی خان سب سے زیادہ فکر مند تھا چنانچہ اس نے بارہ برسوں ولی صغریٰ کے حوالے سے بل والے سال یعنی ۱۲۲۹ء میں جاڑوں کے آخر میں اپنے عزیزوں کے پاس چاروں طرف قاصد روانہ کیے کہ وہ ایک قزاق (مجلس مشورت) میں شرکت کریں۔

پس سپر سالار اور جنگجو سرانگھالی چین سے آئے لگے جہاں ابھی تک ہور ہی تھی۔ ایک چچا منچوریا کی طرف سے سفیر جاڑوں سے نمودار ہوا اور اپنے ساتھ تاراریوں اور مضبوط یادوتنگ کے سرداروں کو لیتا آیا۔

دشت روس کے مغربی جنگلوں سے جو تین ہزار میل دور ہے ایک جوان جس کا نام با تو تھا، اپنے بھائیوں کے ساتھ آیا۔ یہ آئندہ چل کے سائیں با تو خان کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا باپ جوجی خان، چنگیز خان کا ناجائز اولاد تھا۔ دشت روس کی زمینیں اور قریب اس کا ورثہ تھیں۔

چغتائی خان اپنے علاقہ سے آیا جو جنوب مغرب کے جاڑوں میں کوہ القاضی سے لے کر سمقذک دور دراز وادیوں تک پھیلا ہوا تھا۔ چنگیز خان کے زندہ بیٹوں میں یہ سب سے بڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایغوری، سرائخانی اور لمبے قد والے ترکمان آئے جو لہریا آباد سے پہنچے تھے۔

چنگیز خان نے مسجدوں کی بے رحمی کی۔ اپنی فتح کا جشن منانے کے لیے اس نے مسجدوں کے صحنوں پر اپنا مرکز قائم کیا، جہاں اس وحشی نے ایرانی عورتوں کی عصمتوں کو لوٹا، شراب کے قد سے انڈیلے اور ہر قسم عیاشی کے سامان کیے۔

سمقذ، بلخ، غزنہ، نیشاپور، دامغان، کاشان، رے وغیرہ کو ویرانہ بنا دیا گیا۔ تمام کی تمام آبادی ویرانہ تھی کی گئیں۔ مکانات جلا دیے گئے اور عورتوں کے کھلے عام عصمتیں لوٹی گئیں۔ مشہور ہے کہ نیشاپور میں چنگیز لٹروں نے کتے، بلیوں، کدو مار ڈالا اور انسانی سروں کے مینار تعمیر کرائے۔

محمد خوارزم شاہ اپنی جان بچانے کے لیے جگہ جگہ بھاگتا پھرتا تھا۔ آخر وہ مازندران پہنچا اور اسی مقام پر غلوں نے بوجھ تلے دب کر مر گیا۔ اس کے بیٹوں خصوصاً جلال الدین خوارزمی نے چنگیز خان کے ساتھ محرومی جنگ لڑی اور اسے خوب پریشان کیا۔ چنگیز خان اس شعلہ صفت جلال الدین کا پیچھا کرتا ہوا سندھ تک پہنچ گیا۔ پھر اس نے دریائے سندھ کے کنارے خوارزم شاہ کو گھیر لیا۔

جلال الدین خوارزم شاہ نے گرفتاری پر موت کو ترجیح دی اور ایک اونچے مقام سے دریائے سندھ کو گھوڑے کے چھلانگ لگا دی۔

آخر چنگیز خان برصغیر کی گریز برداشت کر سکا اور واپس چلا گیا۔ پھر ۱۲۲۷ء کو یہ مٹاک اور غازیگیر انسانی قتل و بربریت کی ہزاروں نشانیاں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

چنگیز خان کے انتقال نے مغلوں کو سکتہ میں مبتلا کر دیا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ چنگیز خان ہمیشہ زندہ اور وہ اس کے زیر سایہ متمدن دنیا کو یوں تباہ و برباد کرتے رہیں گے۔ انہیں چنگیز خان کے مرنے کا یقین نہ آتا تھا۔ اس لیے انھوں نے منادی کرادی تھی کہ کوئی شخص چنگیز خان کو مردہ نہ کہے۔ اگر کسی نے اسے مردہ کہا تو قتل کر دیا جائے گا۔

اس طرح دو سال کا عرصہ گزر گیا اور مغلوں کا کوئی نیا سردار اور خاقان مقرر نہ ہوا۔

باپ کے بعد گھر کا سب سے چھوٹا بیٹا جو مقدس الہی کا محافظ ہوتا ہے وہ باپ کا وارث بنتا ہے لیکن خان کا یہ ایرشہ تھا کہ خاقان کا فرض بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اوندانی کو چاہیے کہ اسے انجام دے مال و دولت اور فوجوں کی دیکھ بھال کا کام تولانی انجام دے۔ یہ اس کا قول تھا اور اس کا قول بھلایا نہیں جاسکتا۔

یہ بات خاموشی سے سب نے سن لی اور مان لی۔ کس اجنبی میں جرأت تھی کہ جدا غم کے قول سے سرتابی کرے۔

ایک اور سردار نے کہا:

”اس کا یہ بھی ایرشہ تھا کہ جس کو مشورہ کی ضرورت ہو وہ چغتائی کے پاس جلتے۔ جو دولت اور عیش آرام چاہتا ہو وہ اوندانی کے پاس جائے اور جو قوموں کو فتح کرنا چاہتا ہو وہ تولونی کا ساتھ دے۔“

تمام شہزادے گفتگو کرتے اور شراب پیتے۔ شراب میں اس قدر ہوش ہو جاتے کہ انہیں سدا دے کر ان کی بیویوں کے پاس پہنچایا جاتا۔

اس طرح چالیس دن گزر گئے مگر سوائے باتوں اور مے نوشی کے کچھ نہ ہو سکا۔ تولانی میں کسی عورت کو شریک ہونے کی اجازت نہ تھی۔ اوندانی کی بیوی تو را کینہ اور تولونی کی بیوی تو قطنی کی نظریں باہر کی طرف لگی رہتیں کہ دیکھیں تولانی میں کس کی حق میں فیصلہ ہوتا ہے۔

ادھر چغتائی اور تولونی، اوندانی کو سمجھا رہے تھے کہ وہ خاقان کا عمدہ قبول کر لے گروہ انکار کر رہا تھا۔ آخر تولانی کے شہزادوں کے سامنے تولونی نے اپنی تجویز پیش کر دی۔ اس نے پیار بھرے لہجے میں زور دے کر کہا:

”جاودانی آسمان کی طاقت سے ہمارے باپ نے خان اعظم اور خاقان کا منصب حاصل کیا اور اس کے حکم سے اس منصب کا وارث اوندانی ہے۔ اسے یہ عمدہ اور منصب فوراً قبول کر لینا چاہیے۔“

کم سخن چغتائی نے کھڑے ہو کر تائید کی:

”میں بھی اس کو منتخب کرتا ہوں جس کا نام تولونی نے پیش کیا ہے۔“

اوندانی نے انکار کرتے ہوئے کہا:

”یہ ٹھیک ہے کہ خاقان چنگیز خان کے حکم کو مانا نہیں جاسکتا لیکن اس وقت میرا ایک چچا اور بڑے بھائی زندہ ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میرا چھوٹا بھائی تولونی موجود ہے۔ معمول قانون کے مطابق سب سے بڑے گھرانے کا سب سے چھوٹا بھائی وارث ہوتا ہے جو مقدس آگ جلنے دکھتا ہے اور پھر یوریت (خاندان) پر حکومت کرتا ہے۔ چھوٹا بھائی چونکہ گھر پر رہتا ہے اس لیے وہ خاقان کی ایسی

چغتائی خان کا مسلمان اونٹوں پر تھا اور گاڑیوں میں بہت کے پاک جتے ہوئے تھے۔ یہ کم سخن قانون کا پابند۔ سخت مزاج اور اکیلا شراب پینے والا تھا۔ اسے نئی نئی مورتوں کی تلاش دیتی تھی۔ ایک جادوگر ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔

اوندانی خان دریائے نیچی سی کے قریب سے جو اس کا علاقہ تھا، اپنے کو خیمز اور ترک قبائلی سرداروں کے ساتھ آیا۔ اس کے ساتھی بھیڑیے کی کھال پہنتے تھے جن پر چاندی کا پھلکا کام ہوتا تھا۔ وہ چلتا تو اس پر شامیانہ تانا جاتا۔ نہایت خوش طبع مگر غصہ آتا تو پاگل ہو جاتا تھا۔

اس کے ساتھ اس کی بڑی بیوی تو را کینہ بھی جس کے دونوں بازو کڑوں کے بوجھ سے دبے جا رہے تھے۔ بھاری بھرکم رعب و اب والی عورت۔ اس کی وضع قطع مردانہ تھی اور صرف اوندانی کو وہ صبر نظر آتی تھی۔

چغتائی کے خشک مزاج اور تولونی کی متعقل طبیعت میں ایک چیز مشترک تھی۔ دونوں کی طبیعت حاکی نہ تھی اور وہ کسی اور کی بات نہ مان سکتے تھے۔ دونوں کی عمر تباہ کن لڑائیوں میں گزری تھی اور دونوں اوندانی کو بہت چاہتے تھے۔

تولونی جو مقدس آگ کا رکھوالا تھا نے بڑی مسرت سے کیر و لان کے پانی کے کنارے اپنے بھائیوں کا استقبال کیا۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:

”اے اے!۔ دیکھو تو اداؤلی آگ نہیں بجھنے پائی۔ اب بھی جل رہی ہے۔“

جب تمام مہمان آچکے تو تولونی نے میر بانی کے فرائض انجام دیے۔ اس نے شرابوں کے چھکڑے اور نیو نیوں دیے اور ترخانوں کو طلب کیا۔ مہمان دن بھر گھڑ دوڑ اور شکار دیکھتے رہے۔ رات بھر شراب پیتے رہے۔ گوشت کھاتے رہے۔ نہ کھایا جاتا تو قے کر دیتے اور پھر گوشت کھاتے کھاتے۔

مطرب ساز بجا رہے تھے اور معنی نغمے بکھیر رہے تھے۔

مہمان ناچ رہے تھے اور زمین پر لوکھڑا کر رہے تھے۔

زیادہ نیو نیوں (جادو گروں) کی رائے تولونی کے حق میں تھی کہ اسے خاقان بنایا جائے کیونکہ چنگیز خان نے فوج کا زیادہ حصہ اسی کے سپرد کیا تھا۔

وہ کہتے تھے:

”وہی سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ سیمینہ اور میسر کے سردار اس کے ملازم ہیں۔“

ایک سردار جو چنگیز خان کا مقرب خاص تھا کہنے لگا:

”جب جدِ عظیم چنگیز خان جس کی سولدو (روح) نیلے آسمان سے ہیں دیکھ رہی ہے، اپنے بیٹوں کی طبیعتوں پر غور کر رہا تھا تو کہیں وہ اوندانی کے متعلق سوچتا کبھی تولونی کے بارے میں۔ اگرچہ

باتیں سناتے ہیں جن سے قانون بنایا گیا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے میں خاقان کے تخت پر کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔



کسی اور کا انتخاب ہوتا تو ممکن تھا کہ تخت نشینی کے لیے نگواریں کھینچ جاتیں لیکن اس قروتائی میں ایک ایسا شخص موجود تھا جو ان سب سے زیادہ روشن دماغ سمجھا جاتا تھا۔

یہ تھا جینی فلسفی۔ یہ جو چیت مائی، جس نے اس قضیہ کو ختم کر دیا۔
کتے ہیں جب چنگیز خان نے یں لنگ شہ فرج کیا تو وہ اس فلسفی کے دراز قد اور بھاری آواز سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔

چنگیز خان نے اس سے کہا تھا:
چیت مائی، اہل کس اہل خا کے دشمن ہیں اس لیے کہ فوج کے میدانے ایک طرح سے تم لوگوں کا انتقام لے لیا ہے۔

چیت مائی نے فوراً جواب دیا:
"میرا باپ اور میں ہمیشہ کن خاندان کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں پھر ممان کے دشمن کیسے ہوئے؟
یہ صاف جواب چنگیز خان کو بہت پسند آیا اور اس نے اس نوجوان کو نوکر رکھ لیا۔ اس وقت اس کی عمر میں بائیس سال سے زیادہ نہ تھی اور اسے یں لنگ کی گورنری دی گئی تھی۔

چنگیز پیسے تو اس سے بخوم کی نالی حد تک مشورہ لینا تھا مگر چیت مائی نے اپنی فراست سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی ذہین اور عالم ہے۔

چنگیز خان نے اسے ساتھ رکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس عظیم اور سمجھ مراز فاتح کا کوئی مدد مقابل تھا تو یہی چیت مائی فلسفی تھا۔ وہ ان حشیوں کے دل اس طرح پڑھ لیتا تھا جیسے کتاب پڑھ رہا ہو لیکن وہ اسے نہ سمجھ پاتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ چیت مائی کنفیوشس کا پیروکار تھا اور ایک ایسے مہم لائحہ عمل کو دار کا پابند تھا جسے یہ وحشی سمجھنے سے بالکل قاصر تھے۔

ایک مرتبہ چنگیز خان ہالیہ کی ترائی میں لشکر کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ اس نے ایک رات خواب دیکھا۔ خواب میں اسے ایک عجیب جانور نظر آیا۔ اس کا جسم ہرن کا تھا لیکن دم بزرگ تھا اور اس کے صرف ایک میڈلگ تھا۔

چیت مائی، چنگیز خان کے ساتھ تھا۔ چنگیز خان بیدار ہوا تو اس نے چیت مائی کو بلا بھیجا۔

چیت مائی حاضر ہوا تو چنگیز خان نے کہا:

"میں نے خواب میں ایک عجیب مخلقت جانور دیکھا۔ اس کا جسم ہرن کا تھا مگر دم بزرگ تھا اور اس کے سر پر صرف ایک میڈلگ تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ وہ اپس جلاؤ۔ غوراً۔ وہ آدمیوں کی طرح باتیں کر رہا تھا۔"

چیت مائی نے جواب دیا:

"خواب میں نظر آنے والا جانور کی تو وہاں ہے۔ وہ زندہ انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ قتل و خون سے اسے نفرت ہے۔ خواب میں نظر آنا تمہارے لیے ایک تنبیہ ہے۔ تم خاقان ہو تمہارے پاس آسمان کی طاقت ہے لیکن دنیا کی زندہ آبادی تمہاری اولاد ہے۔ تم اس کے ذمہ دار ہو۔"

پتہ نہیں چنگیز خان نے اس کا کیا اثر لیا لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ جس راستے سے جا رہا تھا اس راستے سے کٹ کر وہ دوسرے راستے سے گیا۔

چنگیز خان کے اس معتد کے ساتھ دو اور مشیر بھی تھے۔ ایک عبد الجراح ایک مائل ترک اور چنگائی بغوری۔ یہ پڑھا لکھا آدمی تھے، مغربیوں نے اسے لقب دے رکھا تھا۔

مغل ان تینوں کی بہت عزت کرتے تھے جو اپنی بے خوفی کی وجہ سے قیدی سے وزیر کے عہدے تک پہنچتے تھے۔ تو لوئی تک لمبی مونچھوں والے فلسفی چیت مائی کی باتیں غور اور توجہ سے سنتا تھا۔

جب چالیس روز کے تذبذب کے بعد قروتائی میں پھر محبت و مباحثہ شروع ہوا تو چیت مائی نے کہا:

"کل آٹھویں چاند کی بائیسویں تاریخ ہے اور وہ خاقان کو نامزد کرنے کے لیے بڑا مبارک دن ہے۔
تو لوئی نے خاموشی سے سوچ کے سر ہلایا اور ہمزائے کے طور پر کہا:

"کوئی خاقان بننے کو تیار نہیں۔ ایک دن اور انتظار کر لیجئے دو۔"

"کل کے بعد پھر کوئی دن مبارک نہ ہو گا۔" چیت مائی نے زور دے کر کہا اور اجلاس کلی پر ملتوی کر دیا گیا۔

دوسرے دن جب قروتائی کا اجلاس شروع ہوا تو چیت مائی نے چغتائی سے مرگوشیوں میں کہا:

"تمہارے تم بے بڑے بیٹے ہو اور خاقان کی رعایا بھی ہو۔ اگر تم خاقان کے آگے مر نہ جھکاؤ گے تو اور کون مر جھکے گا؟"

چیت مائی نے اسے غلوں کا یہ قانونی نکتہ سمجھایا۔

چغتائی قانونی آدمی تھا۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ پھر چیت مائی اسے اودھائی کی طرف لے چلا تو اس کی

بچکا ہٹ دور ہو گئی۔

چٹائی کا:

ہم اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کر رہے۔ والدہ نے خود یہ حکم صادر کیا تھا کہ ان کی جگہ اوندائی تخت نشین ہو۔
جھٹکا بھارت ختم ہو گیا۔

تایا نے میں خاموشی چھائی۔

نہ تو کوئی کے حاتی بوسے اور نہ چٹائی کے طرفداروں کی آواز نکلی۔ چٹائی نے حیران حیران اوندائی ماریاں بازو کپڑا اور تو کوئی نے بڑھکے اس کا بایاں بازو کپڑا اور کہا:

”چل رہے ہیں۔“ اور سفید سفید دانت نکل کے ہنسنے لگا۔

اوندائی جو بچہ کی طرح وزنی تھا اور کسی طرح اٹھانہ چاہتا تھا۔ اس کا ایک چمبی جمع میں سے نکلا اور اوندائی کی کمر کپڑا لے لٹایا۔ اس طرح اس کے تینوں بڑے بڑے کپڑے کمر پر لے گئے اور زبردستی اسے صند پر بٹھایا گیا۔

چٹائی نے اپنی ٹوپی اتاری۔ پھر اپنی بیٹی کھول کر کانٹھے پر ڈال لی۔ اس کے بعد وہ تین بار اوندائی کے سامنے دوڑا تو ہوا۔ پھر اس نے اپنی کخت آواز میں اعلان کیا:

”اوندائی۔ اب تم خٹکان ہو۔“

ان الفاظ پر نویزوں، قبیلہ سرداروں نے اپنی ٹوپیاں اور پیشیاں اتاریں اور نئے خاقان کے سامنے سر جھکایا تو کوئی نے جلدی سے شراب کا جام ابھر اور بھائی کو پیش کیا۔ جو اب اس کا خاقان تھا۔

ابوہودیت الوک، خاندان زریں، دشت کے سرداروں، مغل قبیلوں، آجمنی خاقان چنگیز خان کی ذاتی فوج، محور کے بیہوش میں رہنے والی ماری فوج اور ان سے پرے ماری دنیا کا مالک اور آقا تھا۔ اوندائی نے بے تکلفی سے جام چڑھالیا۔

تو کوئی نے کہا:

”دیکھو اے میرے خاقان! اب تیرے آگے گردن جھکا رہے ہیں اور اپنے گلوں میں تیری غلامی کا طوق پہنے ہیں۔“

سب نے اوندائی کے خاقان ہونے کا نعرہ لگایا۔

ایک دربان باہر گیا۔ اس نے ایک جام سے چاروں سمت شراب چھڑکی۔ باہر والوں نے بھی اس کے ہاتھ کے نعرے لگائے۔

اوندائی نیلے آسمان کے سامنے دوڑا تو ہونے کے لیے ٹھہرے نکلا۔ حیرت سے اس نے چت مائی اور مجبور واپس کو سلام کرتے دیکھا۔



پھر قوت مائی میں موجود تمام مغل سرداروں نے قسم کھائی کہ وہ خاقان اوندائی خان، اس کے بعد اس کے بیٹوں اور پوتوں میں سے ہر ایک کے وفادار رہیں گے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ خاقان کا عہدہ ہمیشہ کے لیے اوندائی کے خاندان میں چلا گیا۔ اور تو کوئی اور چٹائی کی اولادیں خاقان کے عہدے سے محروم کر دی گئیں۔

اوندائی کی بیوی نے جب یہ سنا کہ وہ ملکہ ہو گئی ہے تو اس کا سر غرور سے بلند ہو گیا۔ تو اکیٹھ پہلے ہی سے مغرور تھی۔ اسی عہدے سے اسے اور مغرور کر دیا۔

برخلاف اس کے تو کوئی کی بیوی جس کے خیال میں قبائلی قانون کے مطابق یہ عہدہ اس کے شوہر کو ملتا چاہیے تھا۔ اس نے اپنا غم سینہ میں چھپا لیا اور بن سونر کے مغلوں کی خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے ٹھہرے باہر نکلی۔

مغلوں نے اسے نگلیں کے بجائے خوش دیکھ کر کہا:

”تو کوئی کی پہلی بیوی تو قطعی بڑی رعب دار عورت ہے۔ بیوی کے معاملہ میں تو کوئی بہت خوش قسمت ہے۔“

اوندائی جاہل تھا۔ وہی کیا، سب ہی مغل جاہل تھے۔ وہاں پڑھنے لکھنے کا رواج نہ تھا۔ اسے وہ دن یاد تھے جب اسے سمور میں لیٹ کے برف پر سونا پڑتا تھا اور کھانے کو صرف گھاس ملتی تھی۔ سبز گھاس کا وہ عہدہ سا بنا لیتا اور اس سے پیٹ بھرتا تھا۔ وہ اپنے حواض اور دونوں بھائیوں کے سوا کسی اور پر اعتماد نہ کرتا تھا اور چنگیز کی روح سے ڈرتا تھا۔

مغلوں تو م عجیب تھی تو اس کے طور پر لے عجیب نہ تھے۔

اوندائی خان نے پہلا حکم صادر کیا کہ چنگیز خان کی تین روز تک ضیافت مرگ کی جائے۔

پس ضیافت کی صورت یہ ہوئی کہ کھانے میں ابلا ہوا گھوڑے اور لگنے کا گوشت اور جھلا ہوا بکرے کا گوشت تین دن اور تین راتیں کھایا گیا اور پینے کے لیے گھوڑیوں کا دودھ اور شراب کے مائع چلتے تھے۔

جمالت اور عورت کی کم مانگی کا یہ عالم تھا کہ چالیس کنواریاں جن کا تعلق اعلیٰ خاندانوں سے تھا انہیں قیمتی چینی

کپڑے اور بیش قیمت جگہ لگاتے ہوئے زیورات پہنٹے گئے۔ پھر انہیں برخان کالہ دون (مغلوں کا قبرستان) میں لے جایا گیا۔ جہاں چنگیز خان کو بٹھا کے دفن کیا گیا تھا۔ پھر چالیس اہل حق گھوڑے سگوائے گئے اور قربانی کی رسم ادا کی گئی۔

معصوم اور بے قصور لڑکیوں کا لگا گھونٹ دیا گیا اور گھوڑے مار دیے گئے تاکہ یہ دوسری دنیا میں چنگیز خان کی خدمت انجا آسے سکیں۔

خاقان اوغدائی کے دو درمیں چین کی شہنشاہیت کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ اس جنگ میں اوغدائی اور سوبدائوں (مغل سپہ سالار) نے شمال اور مغرب کی سمت سے چین پر حملہ کیا اور اوغدائی کا بھائی تولوئی اپنے تیس ہزار کے لشکر کے ساتھ بڑی پیش قدمی سے جنوب میں پہنچ گیا۔ شہنشاہ چین کی تمام آواہیں شمال اور شمال مغرب میں تھیں۔ تولوئی نے جب جنوب سے حملہ کیا تو چینی بدحواس ہو گئے اور انھیں شکست ہو گئی۔ شہنشاہ چین نے تحائف پیش کر کے معصل خاقان سے صلح کر لی۔

اوغدائی اس جنگ سے واپس آ رہا تھا کہ کثرتِ مے نوشی کے سبب بیمار ہو گیا۔ اسی کی بیماری بہت بڑھ گئی تو چھوٹے بھائی تولوئی نے دعا مانگی کہ اوغدائی کی بیماری اسے مگ جلے اور اوغدائی اچھا ہو جائے۔ چنانچہ یہ حادثہ پیش آیا کہ اوغدائی اچھا ہو گیا اور تولوئی مر گیا۔

کہا جاتا ہے کہ اگر صدقِ دل سے کوئی ایسی دعا مانگی جائے تو اکثر و بیشتر قبول ہو جاتی ہے۔

اب مغل سپہ سالار سوبدائی کو ایک عظیم لشکر کے ساتھ مغرب میں فتوحات کے لیے بھیجا گیا۔ اس لشکر میں اوغدائی کے بیٹے تولوئی اور قائم و شریک ہوتے ہیں۔ تولوئی کی بیوہ قو قلی بھی اپنے بڑے بیٹے منگوخان کو جنگ کی عملی تربیت حاصل کرنے کے لیے سوبدائی کے ساتھ کر دیتی ہے۔

قراقرم کے اس لشکر میں ماٹیں باتو خان جو چنگیز خان کے ناجائز بیٹے جوچی خان کا بیٹا ہے، وہ بھی اپنے لشکر کے ساتھ آتا ہے۔ یہ دونوں لشکر دسی علاقوں میں گھس کر قیامت برپا کر دیتے ہیں مگر ۱۲۴۱ء میں اوغدائی خان کا بھی کھڑبے نوشی سے انتقال ہو جاتا ہے اور فتوحات کا سلسلہ کچھ عرصے کے لیے رک جاتا ہے۔



مغلوں کا نیا خاقان اوغدائی کا بیٹا تولوئی مقرر ہوتا ہے اور مغرب میں پھر فتوحات شروع ہو جاتی ہیں۔ مغل لشکر ہنگری کو تاراج کرتا ہوا دریائے ڈینیوب تک پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت باتو خان کو تولوئی کی بیوہ قو قلی کا

ایک پیغام ملا جس میں اس نے باتو خان کو خبردار کیا کہ خاقان تولوئی ایک زبردست لشکر کے ساتھ اُسے یعنی باتو خان کو مزادینے آ رہا ہے کیونکہ اس نے خاقان کی قوتِ ملی میں شرکت نہیں کی تھی۔

اوغدائی کے مرنے پر جب تمام مغل شہزادوں (جن میں باتو خان بھی شامل تھا) کو قراقرم میں نیا خاقان منتخب کرنے کے لیے طلب کیا گیا تھا تو باتو خان وہاں خود نہیں گیا تھا بلکہ اس نے اپنے بھائی برقانی خان کو قوتِ ملی میں شرکت کے لیے بھیجا تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ باتو خان اور اوغدائی خان کے بیٹوں تولوئی اور قائم و خان کے درمیان کئی بار ٹوٹو میں میں ہوئی تھی اس لیے باتو نے خود قراقرم جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

باتو خان کو تولوئی کے ارادوں کی اطلاع ملی تو اس نے بھی اپنے لشکر کا رخ قراقرم کی طرف کر دیا تاکہ وہ تولوئی کو روکے۔ یہی اس روک کے طاقت کا فیصلہ کر لے لیکن دنیا والوں، خاص طور پر مسلمانوں کو ابھی مغلوں کے ہاتھوں اور زیادہ تباہ و برباد ہونا تھا اس لیے مشرق اور مغرب کے یہ وحشی لشکر آپس میں نہ ٹکرائے اور خاقان تولوئی جو باتو خان کو مزادینے آ رہا تھا، راستے ہی میں مر گیا۔

اب مغلوں میں تیسرے خاقان کے انتخاب کا سوال اٹھا۔

تولوئی کی ماں تو را کینہ نے چاہا کہ خاقانی کا عہدہ اس کے خاندان میں رہے لیکن باتو خان جو اس وقت مغلوں کا سب سے بڑا شہزادہ تھا، اس نے خود خاقان ہونے کے بجائے تولوئی کی بیوہ قو قلی (جس نے اسے قاصد بھیج کر خطرہ سے آگاہ کیا تھا) کے بیٹے منگوخان کو خاقان بنانے پر زور دیا اور اس کی کوشش سے خاقانی تولوئی کے خاندان میں آگئی۔

اوغدائی کی بیوی اور تولوئی کی ماں تو را کینہ نے اپنے خاندان کے علاوہ دوسرے مغل خاندانوں کو بھی بہت پریشان کیا تھا۔ نئے خاقان منگوخان اور اس کی ماں بہنوں کو بھی تو را کینہ کے ہاتھوں بہت دکھ پہنچا تھا۔ اس لیے تو را کینہ اور اس کے بیٹوں اور اس کے خاندان والوں سے اچھی طرح بدلہ لیا گیا۔ منگوخان مغرب کی مہم چھوڑ کے اپنے لشکر کے ساتھ قراقرم واپس آ گیا۔

اور —

باتو خان اپنے لشکر کے ساتھ سرانے باتو نامی شہر جو اس نے اپنے ناک پر بٹا دیا تھا، میں واپس پہنچ گیا۔

خاقان مشرق منگوخان اور خاقان مغرب باتو خان میں ایک چیر مشترک تھی — وہ تھی ان دونوں کی عورتوں سے دلچسپی!

ان دونوں نے باقاعدہ عورتوں کے رجسٹر کھل رکھے تھے اور ایک پورا حکمہ خاقان کے لیے نئی ٹی عورتیں میا کرتا تھا۔

کیئے!

پہلے ہم باتو خان کی عیاشی اور بے لگائی کی کچھ جھلکیاں دیکھتے ہیں!

② قاف کی پری

باتو سائیں خان جھانسی اعتبار سے جس قدر بھاری بھر کم تھا، منقل و فراست میں بھی وہ اتنا ہی عظیم تھا۔ جب خاقان قویوق کے بعد نئے خاقان کے انتخاب کے لیے باتو خان کے نیچے میں قزاقی منعقد ہوئی تو باتو خان نے نہایت فزائلی سے منگو خاں کو خاقان منتخب کرا دیا۔ منگو خاں نے باتو خان کی دانائی کے صلے میں مغرب کی چراگاہوں کے وسیع میدانوں کا موروثی پردان اس کے نام لکھ دیا۔

اس طرح چنگیز خاں کی عظیم سلطنت مشرق اور مغرب کے دو ٹھنڈا ہوں میں بٹ گئی جن میں مغرب ایک نئی مافعلی باقی رہا۔

باتو خان چنگیزی دستور یا سائے تحت اب تک خیمہ نشین تھا۔ اس کا پڑاؤ ہمیشہ منخرک رہتا۔ اس پڑاؤ کے ساتھ اس کی سولہ بیویوں کے مریض اور مزین چھکڑے ہوتے اور بے شمار دانت تاؤں کے پھکنڈے بھی ان کے عقب میں ہوتے۔ باتو خان کو کثرت اولاد کے باعث اپنے بیٹوں کے نام بھی یاد نہ تھے۔ یہیں پرستی اور عیاشی میں وہ پچھلے خاقانوں سے دو قدم آگے تھا۔

اس خیمہ نشین منخل کو پتہ نہیں بیٹھے بیٹھے کیا سوچی کہ اس نے کم دیا کہ بھر کیسیں کے شمال میں دریائے واکا کے مشرقی کنارے پر ایک شہر آباد کیا جائے۔ منخل اردو کی سمجھ میں نہ آیا کہ ان کا ٹھنڈا باتو سائیں کیا چاہت

ہے؟

ایک منخل نویں نے پوچھا:

ٹھنڈا کی ٹھنڈے کیا مراد ہے؟ اگر شہر ہی میں رہا ہے تو روس کے طول و عرض میں سینکڑوں بڑے بڑے

علاشان اور خوبصورت شہر آباد ہیں۔ انھیں شہنشاہ کے لیے خانی کرایا جاسکتا ہے۔

باتو خاں نے اسے سمجھایا:

”ہمارا شہر ایک کچی نصیب کا بڑا ہے۔“

اس کی چھتیں کچھ نیچی نہ آياں مگر حکم شہر ہی کے تحت دریائے والگا کے ساتھ ساتھ سجاس میل لمبی اور چالیس میل پڑی کچی اونچی دیواروں کا احاطہ بنایا گیا۔

باتو خاں نے دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ وہ بولا:

”میں ہی ہمارا شہر ہے۔ اس کے چاروں طرف سجاس بڑے بڑے پھانک لگائے جائیں۔“

پھانک لگا دیے گئے تو سردار نے پوچھا:

”اس میں مکانات اور عمارتیں کس طرز تعمیر کی جائیں؟“

باتو خاں نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا اور کہا:

”یہ مکانات اور عمارتیں کیا ہوتی ہیں کیا ہم نے اپنے راستے میں گنے والے مکانوں، عمارتوں اور قلعوں کو مٹا نہیں کیا جس پر آثار کو ہمیں مٹانے کا حکم دیا گیا ہے انہیں ہم تعمیر کیسے کر سکتے ہیں؟“

آئین اردو (دوسری زین نیل) کے سردار جبریت سے باتو خاں کا منہ بند کر رہے تھے۔ کچی فصیلوں اور شہر کا تعلق اب تک ان کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ پھر یہ تعلق باتو خاں نے خود انھیں سمجھا دیا۔

باتو خاں نے حکم دیا:

”ان کچی فصیلوں کے اندر مغل اردو اور دوسری فوجوں کے تمام خیمے نصب کر دیے جائیں۔ خیمہ نشینوں کے اس شہر کو آج سے ”سراے“ کے ناکہ سے پکارا جائے۔“

سراے کا شہر آباد ہو گیا۔

اس شہر نے اتنی شہرت پائی کہ مشرق و مغرب کے تاجریاں کچھ نیچے آئے۔ سراے کی منڈی میں لاکھوں لاکھوں لاکھوں کے سودے ہوتے۔ یہی سراے ایک عظیم تجارتی مرکز اور باتو خاں کا دار الخلافہ بن گیا۔ یہ سب کچھ ہونے کا وجود اس میں بھیجے ہی نصب رہے عمارت بنانے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔

ساتھ باتو خاں کے حکم کے بغیر تو کتا بھی نہیں بھونک سکتا۔ یہ اس زمانے کی ایک عام کماوت ہے۔

باتو خاں دریائے والگا کے دائیں کنارے پر ایک خانہ بدوش حاکم کی طرح حکومت کر رہا تھا۔ وہ اپنے منہ علاقوں میں بہت کم جاتا تھا۔ اسے باج گزار دوسری میسوں سے بھی ملاقات کا شوق نہ تھا۔ وہ اپنے خاندان زیریں کے لیے ایک ہر بان مردار اور دوسروں کے لیے غلام شہنشاہ تھا۔

باتو خاں کا دستور تھا کہ وہ موسم بہار میں دریائے والگا کے کنارے بائیں پس جاتا اور پھر اپنی بیویوں اور دانشاؤں کے ساتھ مغرب کے مرغزاروں کا رخ کرتا۔ ان دانشاؤں کا ”ہر موسم میں اضافہ ہو جاتا۔“

اس کا حکم تھا کہ اس کا خیمہ بردار نافہ جس علاقے سے گزرے وہاں کے تھاکے مزدورین، بلاتجربیس عمر استقبال کرنا ہیں۔

جب تک اس کے چھترے کسی حسین مرغزار میں جا کر ٹھہر نہ جاتے، راستے کے دونوں طرف مردوزن سر بھٹکتے اس خوفناک ہستی کو کئی اکھیوں سے دیکھتے رہتے۔



باتو خاں کے چرم پوش چھترے شمال مغرب کی طرف رواں دواں تھے۔ ہر سال وہ مغرب کی طرف ہجرت اسی طرح کرتا تھا لیکن اس سال وہ شمال مغرب کی طرف جا رہا تھا۔ کسی مرغزار اور سبزہ زار کی تلاش میں۔ جہاں موسم بہار کی مرستیوں میں نشاۃ کی مجلسیں جماسکے سفر کرتے ہوئے پندرہ دن گزر چکے تھے مگر باتو کی پیش پست طبیعت کو اب تک کوئی مسامحہ نہ دیا تھا۔

شام کا جھٹ پٹا تھا اور سورج مغرب کی طرف تیزی سے چھک رہا تھا۔

باتو خاں کا چھترہ اسب سے آگے تھا۔ وہ چھترے میں اکیلا تھا صرف گاڑی بان چھترہ اٹاٹک رہا تھا۔ باتو نے شام کو تھکے ہی چھترے کی رفتار تیز کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی تمام چھتروں کی رفتار تیز ہو گئی۔

باتو خاں کو دور پر سے ایک پُر نشاط آواز دکھائی دے رہا تھا۔ وہ رات ہونے سے پیشتر وہاں پہنچتا جانتا تھا۔

یہ ایک اذنی ہوئی وصل کے پردے کی دوسری طرف باتو خاں کی نظر ایک لڑکی پر پڑی۔ اس کی نظر واقعی ایک جوہری کی نظر تھی۔

باتو خاں کا چھترہ اڑ گیا۔ باقی چھترے بھی چرخ چوں کی تیز آواز کے ساتھ ایک دم رگ گئے۔ عیال و دستے کے سپاہی گھوڑے بٹھا کر باتو خاں کے چھترے کے پاس پہنچ گئے۔ سامنے ایک تیرہ سال کی معصوم لڑکی، وہ باقی قوطیہ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ سر جھکائے استقبال کے لیے کھڑی تھی۔ اس نے گہرا کر سراٹھایا اور سامنے رکھ دیا۔

شہنشاہ مغرب باتو خاں اپنے ہماری جسم کو سنبھال چھترے سے اتر رہا تھا۔ اس کے چوڑے اور بھدے

سر کے پیچھے دو موٹی موٹی بالوں کی لمبی تھیں جن میں بے حد قیمتی جواہرات گندے ہوئے تھے۔ وہ گھٹیا سے سر پہنچے ہوئے نرم آنسو پیروں میں غمر مزی پر سے کی جو تپاں پہنے تھا۔ جسم پر چینی۔ ریشم کے زیور بے پر شیر کی کمال منڈھی تھی۔ مگر بند میں طمان مہر سا اور مر پر چکی ہوئی ٹوپی میں موتی جڑے تھے اور کمر میں چاندی کے دستے کی تار اور بیاں تھی۔

لڑکی کی آنکھیں غصے سے بند ہونے لگیں۔

باتو خاں آہستہ آہستہ قدم اکٹھا ہوا لڑکی نے اس پہنچا۔ اس کی سولہ بیویاں اور داشتائیں اس کے پیچھے آ رہی تھیں۔

باتو خاں نے نئی بیوی اور نئی داشتہ کے انتخاب کا ایک نیا طریقہ رائج کیا تھا۔ جب اس کی نظر انتخاب کسی کسی دوشیزہ پر پڑتی تو پہلے وہ اپنی سولہ بیویوں سے پوچھتا کہ اگر وہ پسند کریں تو ان میں ایک اور کا اضافہ کر دیا جلتے۔ اس کی بیویاں آہستہ آہستہ ہالاک ہو گئی تھیں۔ کیونکہ آٹھ سے بڑھتے بڑھتے اب ان کی تعداد دو گنی ہو گئی تھی۔ پہلے دو سال سے انھوں نے اس میں کوئی اضافہ نہ ہونے دیا۔ وہ ایک زبان ہو کر نئی لڑکی کو بیوی بنانے کے حق میں رات نہ دیتیں۔

بیویوں کے انکار کے بعد وہ داشتائوں سے اپنی سوال کرتا۔ داشتائیں فوراً رضا مند ہوجاتیں۔ اس لیے کہ یہ بات ان کی کمزور ترین ایک بڑی کوکھ میں کٹھن ہوتی۔ ان سے اپنی نعمت میں شامل کرنے سے انکار کیا نہ کہیں۔ باتو خاں نے اسے داشتہ بنایا۔ چہ وہ شہنشاہ کی مخالفت کیوں کریں۔

باتو خاں نے حسب دستور اپنی بیگمات سے سوال کیا:

”کیا خیال ہے۔ یہ ہماری بیوی بننے کے قابل ہے؟“

گلے ماحول میں پلنے والی یہ دیباقت ہر فی اس قدر باجوب نظر تھی کہ تمام بیویوں کے دل نے کہا کہ اس معری اور کا حسن شاہی آغوش کے لائق ہے۔ معصوم چہرہ، مسالچے میں ڈھلا ہوا جسم اور غرائی آنکھوں کی وحشیانہ چمک۔ اس قدر دیدہ زیب تھی کہ شہنشاہ و مغرب تو ان کے بیویاں اس کم سن جوانی کو گلے لگانے کے لیے جے ہو گئیں۔

مگر ”موکن“ برداشت کرنے کا جذبہ اس قدر نفرت انگیز اور شدید ہوتا ہے کہ جب انھوں نے رائے دے تو ان کی مرضی دو برابر حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس لیے کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

باتو خاں داشتائوں کے گروہ سے مخاطب ہوا:

”اس لڑکی کو ہم نے پسند کیا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم اسے اپنی بیوی بناتے مگر ہم اپنی دوسری بیویوں

دل آزاری نہیں کر سکتے۔ اب تم بتاؤ کیا تم اسے اپنے گروہ میں شامل کرنے پر آمادہ ہو؟“

باتو خاں خاں کا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ایک شوخ و چھٹی داشتہ آگے بڑھی اور اس نے دیباقت حسینہ کو گلے لگایا۔

خون سے لرزاں حسینہ خود کو نہ سنبھال سکی اور داشتہ کے ہاتھوں میں جھول گئی۔ کسی داشتہ نے اس کی مخالفت نہ کی۔

باتو خاں نے کاغذ دستے کے سردار سے پوچھا:

”یہ کونسا علاقہ ہے؟“

سردار گھبرا گیا۔ اسے اس علاقے کا نام معلوم نہ تھا۔ اس نے محض انداز سے کہا:

”شہنشاہ مغرب! اس وقت کم کیف کی حدود میں ہیں۔“

”اور یہاں کا حاکم کون ہے؟“ باتو خاں نے دوسرا سوال کیا۔

سردار نے فوراً جواب دیا:

”رئیس میخانہ! سردار نے یہ نام کسی سے سنا تھا۔“

باتو خاں نے حکم دیا:

”کیف کا ایک مال کا محصول معاف کیا جاتا ہے۔ ہاش تاش کو خبر کر دی جلتے اور واپسی پر رئیس کیف کو ہماری تسلیات کے لیے طلب کیا جلتے۔ اس لڑکی کی خاطر ہم اسے قدم، بوسی کا اعزاز بخشتے ہیں۔“

ہاش تاش (محصول وصول کرنے والے منشی کا نام تھا) ساتھ تھا۔ اس نے یادداشت کھولی۔ لکھا تھا:

”باتو خاں کا مایہ کردہ فی کسی محصول پانچ کھالیں ہیں۔ ایک کھال سیفدر، چھکی۔ ایک کال او مڑی کی۔ ایک پو

ایک سو در اور ایک کھال شمالی علاقے کے جیتے کی۔“

باتو خاں حکم دے کہ ایک قدم لڑکی کی طرف بڑھا لڑکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

باتو خاں نے کہا:

”اے حسن کی ملکہ! ہم نے تجھے اپنی داشتہ بنانے کی عزت بخشی ہے۔“

لڑکی غصے سے لرز رہی تھی۔

باتو نے پوچھا:

”میرا نام کیا ہے؟“

لڑکی خاموش رہی۔ قریب کھڑے ہوئے اس کے باپ نے جواب دیا:

تھیں۔ کیفی کی عمر تیرہ سال سے کسی طرح زیادہ نہ تھی۔ وہ شہنشاہ مغرب کی مسند کے سامنے ڈری ڈری کھڑی تھی اور شہنشاہ کی نظریں اپنے شکار پر تھیں۔
باتو خاں نے اشارہ کیا۔

ساتی لڑکیوں نے طلائی جاموں میں بدبودار دودھ انڈیلا۔ اس کے ساتھ ہی مار جھینٹے..... اور وحشی تازی نغے نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ طلائی جام خالی ہونے لگے۔
باتو خاں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ کیفی گھبرا کر پیچھے ہٹتی رہی۔ شہنشاہ مغرب گرجا۔ رعیت کی بیٹی ڈر کر کھڑی ہو گئی۔

ایک آہنی پنجہ اس کی گردن پر آیا۔
وہ کسی بے بس پرندے کی طرح پھڑپھڑائی۔
خیچے کی شمشیریں جھلٹیں جیسے خوف سے اکھیں بند ہو رہی ہوں۔
کیفی کے منہ سے ایک کراہ نکلی اور داستان بن کر رہ گئی!

کیفی صبح دیر تک سوئی رہی۔ اس کی آنکھ کھلی تو جسم کا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ کیفی کو جسم کے ٹوٹنے کے ساتھ یوں محسوس ہوا جیسے اس کی روح کے تاریک ٹوٹ رہے ہوں..... وقت گزرتا رہا اور کیفی اندر ہی اندر ٹوٹی اور کھرتی رہی۔

دو ہفتے کیفی، شہنشاہ مغرب کے خیمے میں رہی۔ اس کا یہ حال ہو گیا کہ کھڑی ہوتی تو چکر اٹھنے لگتے۔ اسے گھوڑی کا دودھ موافق نہ آیا کیوں باتو خاں اسے روزیہ مشروب خاص پینے پر مجبور کرتا۔ وہ مجبوراً کراہ کیسے کرتی..... وہ باتو خاں سے بہت ڈرتی تھی۔ وہی کیا پورا مغرب اس کے نام سے لرزہ برآمد تھا۔

آکر کیفی لڑکھڑاتے لگے۔ باتو خاں بھی اس کی بیماری سے سبب زار رہنے لگا۔ اب اسے نئے پرندوں کی تلاش ہوئی اور کیفی کو اس قید خانہ سے چھٹکارا ملا۔ اسے دوسرے خیمے میں بھیجا گیا اور اس کی جگہ دوسری داستانوں اور شہنشاہت نے لے لی۔

موسم ہمارا آہستہ آہستہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ خزاں نے اپنا چہرہ دکھایا۔ بہار نے سبز زار سے اپنا ڈیرہ اٹھایا۔ باتو خاں نے بھی خیر اٹھانے کا حکم صادر کر دیا اور پھر یہ قافلہ جس راہ سے آیا تھا اسی راہ سے موڑنے والی

اے شہنشاہ مغرب! اس کا نام کیفی ہے۔
"علاقہ کیفی کی کیفی..... یہ مجسم کیفی ہے۔ یہ کہتے ہوئے باتو خاں نے کیفی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
وہ سمجھ کر پیچھے ہٹی اور باپ کے گلے سے چٹ گئی۔

باتو نے بھیا تک قہقہہ بلند کیا اور اس کا شہنشاہ جیسا ہاتھ کیفی کی ہانک کھائی۔ ہنس چکا گیا۔
پوٹھے باپ کی آنکھوں سے دو قطرے ڈھلک کر جھریں دار رخساروں پر آ گئے۔ باتو خاں کیفی کو کھینچتا ہوا چھکڑے کے پاس لے گیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اسے اٹھا کر چھکڑے کے اندر اس طرح پھینک دیا جیسے بچہ گیند پھینکتے ہیں۔

چھکڑے پل پڑے۔
کیفی کی مٹی مٹی چھینیں، باپ کے کانوں سے ٹھکرا رہی تھیں اور اس کے لڑنے لڑنے کا آواز آسمان کی طرف اٹھ رہا تھا۔

سبز زار میں خیمے لگا دیے گئے..... ہر طرف آگ کے لاڈلے لٹے اور خیمے شمعوں سے جگمگانے لگے۔
باتو خاں کا بچہ ایک اونچی جگہ نصب کیا گیا۔ یہ طویل و لمبی اور بلند و بالا خیمہ پانچ ہزار گز کے رقبے پر محیط تھا۔ اس کے اطراف میں بیکات اور داستانوں کے خیمے تھے اور پھر کھانا صلیب پر محفوظ تھے اور دیگر ملازمین کی چھوٹی بڑی چھوٹی لڑائیاں تھیں۔

جب رات کی رافانے اپنی سیاہ زلفیں گھول کر وسیع سبز زار پر بکھیر دیں تو باتو خاں کے جگمگ کرتے خیمے میں شراب کا دھڑ دھڑا ہوا۔

بارہ لڑکیاں ساتی لڑکی کے لیے حاضر ہوئیں۔ ان کے ہاتھوں میں طلائی جام اور صرا جہاں تھیں۔ ان صرا جہوں میں مغلوں کا مرغوب مشروب گھوڑیوں کا دودھ بھرا تھا۔ ساتی لڑکیوں کے علاوہ دس اور لڑکیاں جن کے اعضاء کی شمعیں باریک لباس سے روکے نہ رکھتی تھیں، ہاتھوں میں ماز لیے ایک طرف بیٹھ گئیں۔

پورے خیمے میں قالیوں کا فرش تھا اور باتو خاں کا ڈھنچے کے سارے نیم دراز تھا۔ اس کے لیے دس قالیں اور پتلے رکھ کر ایک مسند سی بنا دی گئی تھی۔

باتو خاں آج بہت خوش تھا۔ یہ اس کے پڑاؤ کی پہلی رات تھی۔ بہار کی پہلی رات۔ وہ اس لیے بھی خوش تھا کہ اس نے جنگل سے لاجواب بھول کا انتخاب کیا تھا۔ ایک ایسا بھول جس کی کچی بنیاں ابھی غنچے کی بند آغوش میں مضمت

پہنچ گیا۔

کچھ ہی دن بعد ملاحظہ ہونے کے بعد دار نے باؤخان کو رئیس کیف مینائل کی یاد دلانی کرائی۔ باؤخان نے اس کی طبی کا حکم دے دیا۔

ایک تیز رفتار قاصد کیف روانہ ہو گیا اور رئیس کیف کو پھر سے دربار میں شہنشاہ مغرب کا یہ پیغام پہنچا: "یہ مناسب نہیں کہ تم خاقان اور باؤخان کی سرزمین میں رہو اور حاضر ہو کر ان کے آگے تسلیمت نہ عرض کرو۔"

دربار کیف پر سناٹا مٹا دی ہو گیا۔ مینائل نے قاصد کو عزت سے رخصت کیا اور جلد حاضری کا وعدہ کیا اور کہ جانے کے بعد رئیس کیف نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔ فیصلہ حکم کے سوا اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ آخر مینائل اپنے گورنر قید و رکوع تھے کہ گزراں و زماں سرائے کی طرف چلا۔

مینائل کے کانوں تک یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ دربار میں جو امیر رئیس یا سردار حاضر ہوتا ہے اسے باؤخان کے پیچھے کے باہر دیکھتے ہوئے دو الٹوں کے درمیان سے گزرا جاتا ہے۔ پھر اسے غیر مرمی دیوتاؤں کے آگے سر جھکا کر

کیف کا یہ نوجوان رئیس جلد درخوردار تھا۔ اس کی رگوں میں شاہی خون تھا۔ پھر اس نے یہ بھی سنا تھا کہ دربار مذہب پرستوں زاہدوں کا یہ خیال ہے کہ جو کافروں کے آئینہ کدوں کی دکھتی ہوئی آگ سے گزر کر غیر مرمی دیوتاؤں کے آگے سر جھکا کر اس کی درجہ جہنم میں شدید عذاب سے دوچار ہوتا ہے۔

جوان عمر اور خود دار رئیس کے سامنے دہری راستے تھے۔ یا تو وہ انکار کر کے ایک باعزت موت کا سہارا پہنچائے یا پھر مذہب سے انحراف کر کے اپنی روح کو دوزخ میں بھیجنے پر آمادہ ہو جائے۔

اس پر ایک عجیب تہذیب کا عالم غاری تھا۔ اس کے دل و دماغ میں کش مکش ہو رہی تھی۔ جب وہ اسی دروازے میں داخل ہوا تو بھی اس کا دماغ کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر رہا۔

باؤخان کسی کی سمجھ بڑی کا منظر دیکھنے کے لیے خیمے سے کبھی راکھ نہ ہوندا وہ اسے کوئی اہمیت نہ دیتا۔ اس کوئی آئے والے کو تمام مراحل سے گزرا کر باؤخان کو مطلع کر دیتے۔ اسے سمجھ کرنے والوں کے صرف آنے جانے کی خبر مطلب تھا۔ اس سے اس کے وقار اور ان کا کوئی تکیں ملتی اور بس۔ اس کے حکم سے آج تک نہ کسی نے سرتابی کی اور سجدے سے انکار۔

جب کیناز مینائل رئیس کیف کے آنے کی خبر باؤخان کو اس کے خیمے میں پہنچی تو بے ساختہ کہنے لگا: "کہ وہ رئیس کیف کا دیدار کرے۔ وہ کیف کی رہنے والی خدی اور رئیس کیف اس کا بادشاہ تھا۔"

کیف اس وقت باؤخان کے خیمے میں دوسری بیگمات کے ساتھ موجود تھی۔ کیفی کو بیگم کا درجہ حاصل نہ تھا۔ بیگم اسے دشاؤں سے بلدتقا دیا گیا تھا۔ جب باؤخان اپنی بیگمات کو خیمے میں بلاتا تو کہیں کو بھی گئے کا حکم ہوتا۔ کیفی نے ڈرتے ڈرتے باؤخان سے کہا:

"شہنشاہ کی اجازت ہو تو میں رئیس کیف کو دیکھ لوں؟"

باؤخان نے ایک لمحہ میں تھا۔ وہ مسکرایا اور بولا:

"تو بھی تو کیف کی ہے۔ اپنے بادشاہ کو دیکھنا چاہتی ہے لیکن تجھے یہ دیکھ کر انخوس تو نہ ہو گا کہ تیرا بادشاہ ہمارے اور ہمارے دیوتاؤں کے آگے سر جھکائے گا؟"

کیفی نے معصومیت سے جواب دیا:

"یہ میں کیسے کہہ سکتی ہوں۔ جب دیکھوں گے تب معلوم ہو گا۔"

باؤخان اس کی معصومیت سے بے اثر انخوس ہوا اس نے کہا:

"اچھا چل۔ آج تیری خاطر ہم اور ہماری تمام بیگمات تیرے ساتھ چلتے ہیں اور ہم خود دیکھیں گے رئیس کیف کو مسجدہ کرتے دیکھ کر تیرے دل پر کیا گزرتا ہے؟"

کیفی نے ذرا ہمت سے جواب دیا:

"شہنشاہ کو بھلا کسی کے دل کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ دل کا حال تو بس آسمان پر رہنے والا ہی جان سکتا ہے۔"

باؤخان ذرا ٹھٹھا اور کہا:

"تو تو عقل مندوں کی سب باتیں کرتی ہے۔ تجھے کیسے معلوم ہو گا کہ وہ لوں کا حال جو دانی آسمانی پر رہنے والا جانتا ہے؟"

"میرے باپ نے بتایا تھا مجھے۔" کیفی مختصر جواب دے کر خاموش ہو گئی۔ دراصل باپ کا نام زبان پر آتے ہی اس کا دل افسردہ ہو گیا اور آنکھیں بھی پھر آئیں۔

باؤخان کی تیز نظر نے اس کی کیفیت جان لی اور نرمی سے کہا:

"کیفی! تجھے شاید اپنا باپ بہت یاد آتا ہے۔ فکر مت کر۔ ہم اسے بلوانے آج ہی حکم دے دیں گے۔"

"نہیں شہنشاہ ایسا نہ کیجئے۔"

کیفی کے آنسو ٹپک رہے تھے:

"اب میں اس سے دوسرے جہم میں لوں گی۔ اس جہم میں تو اس کا اور میرا رشتہ اسی دن ٹوٹ گیا تھا جس دن

آپ نے مجھے اپنے پچھڑے میں پھینکا تھا۔

باتو خاں نے اسے کئی جواب نہ دیا اور بھاری قدم اٹھاتا ہوا باہر کی طرف چلا۔ تاہم بیویاں اور کیفی اس کے جلو میں تھیں۔

شہنشاہ مغرب باتو خاں نیچے سے برآمد ہوا تو نیویں نے بڑھ کر اس کے سر پر سرخ طرے دار چھڑ (چتر) اتار دیا۔ نیچے سے ذرا آگے دو آتش کدے دھک رہے تھے جن کے درمیان سے مجددہ کرنے والوں کو پیسے گزارنا پڑتا تھا۔ آتش کدوں کے دوسری طرف درباریوں کے لیے تالینوں کا فرش تھا۔ باتو کے باہر آتے ہی تمام اعمامین سلطنت اور مغل خانوادے احتراماً کھڑے ہو گئے۔ ان درباریوں میں خاقان وقت منگو خان کا داروغہ چی (گورنر) بھی تھا جو باتو کے دربار میں خاقان کی نمایندگی کرتا تھا۔ لیکن اسے سوائے دم شکاری کے حساب کتاب میں رلنے دینے اور منگو خان کے دربار میں بیٹھے جانے والے تحائف کے انتخاب کے اور کوئی حق حاصل نہ تھا۔

باتو خاں اور رئیس اعظم کیناز مینائیل نے ایک دوسرے کو پسے کھینچ کر دیکھا تھا۔ وہ آج پہلی بار ایک دوسرے کے سامنے آئے تھے۔

باتو خاں نے حکم دیا کہ رئیس کیف کو آتش کدوں کے قریب لایا جائے۔

کیناز مینائیل اور فیڈورالواؤ کے قریب آگے بڑھ کر باتو خاں نے ایک کے ہاتھ دواؤ میوں کو الٹا کر پاس دیکھا تو سوال کیا:

”ان میں دوسرا آدمی کون ہے؟“

باتو خاں بڑا جانبدار آدمی تھا۔ وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے باجگزار رئیس کیف کو نہیں پہچانتا۔ اسی لیے اس نے یہ مبہم سوال کیا تھا۔

ایک نیویں نے بٹے خرمے فیڈورکا ہاتھ پکڑتے ہوئے جواب دیا:

”یہ رئیس کیف کا گورنر فیڈور ہے۔ اس کی گنجائش ہے کہ یہ بھی تسلیات پیش کرنے کا خواہش کرے۔“

باتو خاں نے غصے سے مینائیل کو دیکھا اور کہا:

”رئیس کیف بتایا جائے کہ پہلے اسے دونوں آتش کدوں کے درمیان سے گزانا ہے۔ پھر مشرقی جانب چلا ہمارا خاقان منگو خان اپنے پائے تخت قراقرم میں بیٹھا ہے اور دھمکے کے اسے مجددہ کرنا ہے۔ اس کے بعد ہمارے غیر مرقی دیوتاؤں کے آگے جبہ ساقی کرنا ہوگی۔“

باتو خاں اس قدر مغرور تھا کہ وہ ایک ریاست کے والی سے براہ راست گفتگو کرنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ وہ بالواسطہ احکام دے رہا تھا۔

جہاں تک دونوں الٹاؤں کے درمیان سے گزرنے کا تعلق تھا اس کی حقیقت یہ تھی کہ منگول شاہانوں (ساحروں) کا یہ خیال تھا کہ اگر آتش کدوں کے درمیان سے گزرنے والے کے پاس کوئی خطرناک قسم کا طسم یا غیر مرقی ہتھیار ہو تو اس کے گرد و تاؤں کے حکم سے اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

دربار پر سکوت طاری تھا۔ سب کی نظریں مینائیل اور فیڈور پر لگی تھیں۔

مینائیل نے آہستہ سے پوچھا:

”فیڈور تیرا کیا خیال ہے؟“

اور فیڈور نے بڑے استقلال سے جواب دیا:

”اے رئیس کیف۔ اگر کسی کی روح جہنم واصل ہو جائے اور اس کے بدلے میں اسے تمام کالم کی یادداشت بھی مل جائے تو کیا فائدہ؟“

کیناز مینائیل کی رون فرمے اگر گئی۔ اسے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کیفی کی آواز بلند ہوئی۔ وہ اس وقت شہنشاہ باتو خاں کے بائیں طرف بہت قریب کھڑی تھی۔

کیفی نے درخواست کی:

”اے شہنشاہ مغرب، مجھے اجازت دے کہ میں اپنے رئیس سے کچھ باتیں کر لوں۔“

باتو خاں نے اس کی درخواست منظور کر لی۔

کیفی نے دوسری درخواست کی:

”میرا دارورئیس کے قریب سے ہٹایا جائے۔“

شہنشاہ نے اس کی یہ بات بھی مان لی اور ہنس کر کہا:

”اے کیفی گھبرا۔ جب نیزا رئیس دربار سے رخصت ہوگا تو اس کا مرتبہ نیلے آسمانوں تک بلند ہوگا۔“

مغلی نیویں، فیڈور اور کیناز مینائیل سے دس دس گز دور ہٹ گئے۔

کیفی آہستہ آہستہ قدم اٹھتی ہوئی رئیس اور گورنر کے پاس پہنچ گئی۔ مینائیل اور فیڈور صرست سے کیفی کو دیکھ رہے تھے۔

کیفی نے ایک نظر ادھر ادھر ڈالی پھر عام روسی زبان کے بجائے اس نے کیف کی مقامی زبان میں مینائیل کو مخاطب کیا اور کہا:

”اے شاہ کیف۔ میں تیری ادنیٰ دعا ہوں اور تجھے سلام پیش کرتی ہوں۔“

مینائیل بولا: ”اے ہمدرد لڑکی۔ جلد بتاؤ کون ہے اور یہاں تک کیسے پہنچی تاکہ مرنے سے پہلے میں تیرے

خصوص بھرے الفاظ کا شکریہ ادا کروں۔

زمین کی کیفیت: کیفی نے کہا شروع کیا،

وقت کم ہے اسی لیے آپ میری بات نہیں کیف میرا وطن ہے اور مجھے زبردستی اٹھا کر باتو خان کی داستان شروع بنایا گیا ہے۔ مجھ پر جو سمیت چکی ہے اسے چھوڑ دوں اور اپنی جان کی فکر کریں۔ میری خواہش بلکہ میری التجا ہے کہ آپ باتو خان کا حکم مانیں ورنہ یہ درد سے آپ دونوں کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔

میخائیل نے پوچھا:

”مگر تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں شمشادہ کے حکم کی سرتابی کرنے والا ہوں۔“

کیفی نے کہا:

”شہادت کا سزا کرکھنے والوں کے چہرے لکھی کتاب ہوا کرتے ہیں۔ لے بادشاہ۔“

میخائیل نے کہا:

”مقتدر لڑکی! تیرا خیال درست ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ شمشادہ کے علاوہ کسی اور کے آگے سر نہ جھکائیں گے۔“

”اے شاہ۔ تیرے جذبے پر فرمان ہونے کو میرا بھی دل چاہتا ہے۔“ کیفی نے کہا:

”اپنے باپ سے بچنے کے بعد میں جس کرب سے گزری ہوں اس سے میں ہی خوب واقف ہوں لیکن تو اپنی جان نہ گنوا۔ میرے باپ نے مجھے بتایا تھا کہ بادشاہ رعایا کا باپ ہوتا ہے۔ اسی لیے میں ڈرتی ہوں کہ تم اچانک ٹوٹکیت کی رعایا تیرے بعد میری ہی طرح خون کے آنسو بہائے گی۔“

میخائیل اس دھاتی لڑکی کے بلند پایہ خیالات سے بڑا متاثر ہوا اور کہا:

”اے بہادر لڑکی۔ ہم تیرے شہرے کے شکر گزار ہیں کیونکہ تو ہمیں معاف کر دے۔ ہم غیر مرنی وقتوں کے سامنے سر نہیں جھکائیں گے اور نہ مشرق کی جانب سہوہ کریں گے۔“

کیفی کی آس ٹوٹ گئی۔ وہ ایک لمحہ کچھ سوچتی رہی پھر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک پیدا ہوئی۔

اس نے کہا:

”اے شاہ کیف! میں تیرے اٹلی فیصلے کے آگے دیوار نہیں بننا چاہتی لیکن اب تو مجھے بھی اجازت دے کہ جس راستے پر تُو چل رہا ہے میں بھی اسے اختیار کروں کیونکہ یہی حق کا راستہ ہے۔“

میخائیل اور فیڈور نے حیران سے کیفی کو دیکھا۔

باتو خان ان باتوں سے تنگ آگیا تھا۔ اس نے زوردار آواز میں کہا:

”کیفی! اپنی بکواس بند کر اور واپس آ جا۔ میخائیل کو اپنا کام کرنے دے۔“

کیفی دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بغل سردار پھر میخائیل اور فیڈور کے سر پر ہسپتہ لگے۔

کیفی نے دور کھڑے کھڑے میخائیل کو آواز دے کر کہا:

”اے رئیس! ان درندوں کے ہاتھوں شہادت پانے کے بجائے آگ کا راستہ زیادہ عظیم ہے۔ اس راستے میں تُو مجھے اپنے ساتھ پائے گا۔“

میخائیل مسکرایا۔ پھر اس نے شیر کی طرح گرج کر باتو خان سے کہا:

”یسا یوں کو نریب نہیں ویتا کہ وہ اناڈ کے درمیان سے ہو کر گزریں یا پادری کے سوا کسی اور کے آگے اپنا سر جھکائیں۔“

شمشادہ مغرب، باتو خان کو غصہ آگیا۔ وہ دھاڑا:

”اے ذلیل کیڑے۔ تو نے ہمارے حکم سے سرتابی کی کیسے جرات کی۔ تو تعین کرے گا تو ہم اپنے ہاتھ سے تجھے ریاست بخشیں گے اور اناکار کرے گا تو قتل کیا جائے گا۔“

باتو خان کے خاندان سے کے ایک افسر نے جس کے دل میں شاید رعیت کا کچھ درد تھا، میخائیل کے کان میں سرگوشی کی:

”میخائیل! احتیاط کر موت تیرے سر پر کھل رہی ہے۔“

کیناز میخائیل نے باتو خان کو جواب دیا:

”ہم شمشادہ مغرب کے آگے ضرور جھکائیں گے کیونکہ خدا نے اسے سلطنت عطا کی ہے مگر ہم اور چیزوں کے آگے سر نہ جھکائیں گے۔“

باتو خان غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے سرداروں کو اشارہ کیا۔ دو بغل سردار میخائیل اور فیڈور پر جھپٹے۔ جب وہ قریب پہنچے تو میخائیل اور فیڈور نے اس زور سے ان کے پیٹ پر لاقی رسید کی کہ وہ اپنا تاقزن برقرار نہ رکھ سکے۔ درباریوں کو ان دونوں پر بڑی حیرت ہوئی۔ مغلوں کے نام سے لاپننے والے اس وقت ان کا مقابلہ کر رہے تھے۔

دو اور بغل سردار ان پر حملہ آور ہوئے۔

باتو خان نے حکم دے رکھا تھا کہ جن کی رگوں میں شاہی خون ہو انھیں قتل نہ کیا جائے بلکہ اس طرح ختم کیا جائے کہ ان کا خون زمین پر نہ گر سکے۔ کیونکہ جگہیری ”یاسا“ کے مطابق ایسا کرنے سے جاودانی عاقبتیں ناراض ہو جاتی ہیں۔ مغل اسی وجہ سے خنجر اور تلوار استعمال کرنے سے گریز کر رہے تھے۔

مغل میخائیل اور فیڈور سے لپٹ گئے۔ ایک مغل نے میخائیل کو زمین پر گرادیا اور اسی کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔

قرب تھا کہ مثل، میناٹیل کے دل پر گھونٹے مار مار کر اس کا خاتمہ کر دے کہ کیفی کا نازک ہاتھ اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک مثل مردانہ کم رنگ پہنچا پھر اس نے تیزی سے اس کی کمر میں اڑا ہوا خنجر نکالا اور ناک کراس مثل پر کھینچ مارا جو میناٹیل کے سینے پر سوار تھا۔ کیفی کا پھینکا ہوا خنجر مثل کی پشت میں بیوست ہو گیا۔ اس کی گت دھیلی ہوئی اور میناٹیل آزاد ہو گیا۔

جبرت کی ایک لہر باتو خاں اور اس کے درباریوں کے سروں سے گزر گئی۔ کیفی نے بھگتے ہوئے کہا،

”ریش کیف اب مقابلے کا رہے۔ آگ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

میناٹیل نے پھر بھی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے مثل کے پیٹ میں دھڑکھڑکھٹو کر گھونٹ دی جو اسے اپنے اوپر سوار ہونے والے مثل سے ٹلی ٹھنڈا فیدو کرنے کی طرح خود کو مثل حکم آور سے چھڑایا۔

اب ان تینوں کا رخ الاڈ کی طرف تھا۔ میناٹیل نے آگ کے قریب پہنچ کر باتو خاں کو یوں دیکھا جیسے وہ اس کی شہنشاہت کا مذاق اڑا رہا ہو۔ پھر ایک اونچی زندقہ لگا کر آتش کہ سے میں کود گیا۔ آگ کے شعلوں کی چاور نے آہوئی مار کی طرح میناٹیل کو چھپایا۔

میناٹیل کے بعد کیف نے بھی خود کو زندقہ آتش کہ دیا۔ اس نے باتو خاں کی طرف دیکھا بھی پسند نہ کیا۔ اوپر جاں نثار گورنر فیدو نے خود اپنے کے پر عمل کیا۔

تین جانیں اپنی آن پر قربان ہو گئیں۔ یہ تمام باتیں اتنی تیزی سے ہوئیں کہ کسی کو کچھ سوچنے سمجھنے یا کہنے کا موقع ہی نہ ملا۔ تمام دربار دیلمے ہیرت میں غرق تھا۔

باتو خاں کو ہوش آیا تو اس نے دیکھتے ہوئے شعلوں کو دیکھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے شعلوں کے دوش پہ کیفی کا نازک جسم اوپر کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اوپر ہی اوپر پھر جیسے وہ جاودانی آسمان کی پتلیوں میں گم ہو گیا۔

میناٹیل اور اس کے ساتھیوں کا یہ دردناک قصہ فور و گردوں کے صحیفے میں درج ہے جس میں کینا ز میناٹیل کو شہیدوں میں شمار کیا گیا ہے۔

جو کچھ ہوا۔ خود باتو خاں کو بھی اس کا جھوس تھا اس نے اپنے خیمے کے آگے جٹنے والے الاڈ بند کر دیے اور مشرق کی طرف منہ کر کے سجدہ کرنے کی دم بیختم کر دی۔

دراصل میناٹیل اور کیفی کی موت کے بعد وہ تو ہم پرستی کا شکار ہو گیا تھا۔ مثل یوں بھی تو ہم پرست واقع ہوئے تھے لیکن اب تو باتو خاں نے بستے ہوئے پانی میں ہاتھ دھونا بھی بند کر دیا۔ اسے یہ دم پیدا ہو گیا کہ ہاتھ دھونے سے پانی گندہ ہو جائے گا اور پانی کی رو حیں ناراض ہو جائیں گی۔

موسم سرما میں جب دریا سٹے دار کا پیر برف کی موٹی تر جم جاتی اور اس کے بیٹے مشرقی کنارے پر آ کر باتو کی خیمہ گاہ کے سامنے الاڈ جلاتے اور باپ کو گپ شپ کرنے کے لیے بلاتے تو باتو خاں گھبرا کے مرضی کا ہنسا را کے کہ معذرت کر لیتا۔ حالانکہ وہ دن میں اپنے شہبازوں اور کا فوری شاہ مینوں سے تنگوار کھیلنا تھا۔ اسے الاڈ سے نفرت ہو گئی تھی کہ پھر وہ آگ کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود باتو خاں افسردہ تھا۔

جب رات کو وہ قایم کی مسند پر چپٹ لیٹتا اور میں حسین کینز میں اس کے جلدی جسم پر منگ کی مالتش کرتیں تو وہ آنکھیں بند کیے کیے ان سے پوچھتا،

”کیا دنیا میں کیفی سے زیادہ خوبصورت اور ہاد کوئی اور لڑکی ہے۔“

کینز میں جو کم کر اسے دیکھتیں، ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

باتو خاں کو کوئی عسکری طاقت شکست نہ دے سکی لیکن وہ ذہنی محاذ پر شکست کھا گیا۔ جب اسے کیفی بہت یاد آتی تو وہ اپنی سولہ شکایت اور تمام ادب و تہذیب کے ساتھ اپنے خیمے میں بلایت۔ پھر وہ باری باری ان کی آنکھوں میں جھانکتا۔ ان کے جسم کے ایک ایک عضو کو ٹوٹتا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ کسی کو تلاش کر رہا ہو لیکن وہ ناکام رہتا۔ اس کا دل سنگ اٹھتا۔ جھلاہٹ بڑھ جاتی اور وہ دیوانوں کی طرح انھیں دھکے دے کر اپنے خیمے سے باہر نکال دیتا۔

پھر اسے بیاس محسوس ہوتی۔ گھوڑی کے دودھ کی مرا حیاں اور بالٹیاں محاصرہ کی جاتیں۔ کینز میں سارا پھیر تین اور نقص کرتیں۔ یہ نقص اس وقت تک جلدی رہتا جب تک باتو خاں بدوش ہو کر بے مدد نہ ہو جاتا۔



باتو خاں نے نیکے ڈھلنے کا حکم دیا۔ جنوبی دریاؤں کے دہانوں پر تنگ کا حساب درست کرنے کے احکامات صادر کیے۔ کوہ لیو رال کی چاندی کی کانوں کی جانچ پڑتال شروع کرائی۔ ان تمام کھجیڑوں کا مقصد اس کے پیش نظر خود کو معدوم رکھنا اور سکون حاصل کرنا تھا لیکن وہ اس میں بھی ناکام ہوا۔ اس کا دل ان مشغلوں سے جلدی پھاٹ

ہو گیا۔ اب بھی بہارتی لیکن باتو خاں کے چھڑے مغرب یا شمال مغرب کا رخ نہ کرتے۔

کیسی کو مرے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ اب وہ کیسی کو بڑی حد تک بھول چکا تھا۔ کیسی نے غیر محسوس تازہ باتوں
خلاف پر چھڑا تھا۔ اس نے اسے زندہ صفت اور حسی بنا کر رکھ دیا۔

ایک دن باتو خاں نے تمام سرداروں کی اپنے بیٹے میں دعوت کی۔ ان سرداروں میں مغل خاندانوں کے
علاوہ پنجابی سردار بھی شامل تھے۔ یہ لوگ اپنی شجاعت اور تھوڑی وجہ سے مغل فوج میں شامل کیے گئے تھے۔ مثلاً اب
گھوڑی کے دو وہ کتے تھے قانون کے فرسٹ پر فریڈ سے سبواپے گئے۔ جو بھورت کینزوں نے جام و ساعر لنگر دے دی۔
ساز چھڑے اور مغلخوں کے بھون پر جنگی نئے لہانے لگے۔ قاصدوں نے بھاؤ بتائے۔ مغل میں رنگ مغل لگیا۔

اس ناؤ نوش کا ابھی پہلا دور چلا تھا کہ شمشاد مغرب باتو خاں کی پاٹ ولرا آواز سے نیم گاہ کا پٹا اٹھی جانے لگی۔
نے اپنے بزرگ مغل شمشاد کو حیرت اور خوف کے طے جلے جذبات سے دیکھا۔

باتو خاں نے غلطی جا میں ہراسہ اگھوڑی کا دو وہ قانون پر الٹ دیا اور اعلان کیا:

”اے مغل خاندان اور یا سکا کے پرستار وہم نے مغرب میں امن کا اعلان کر کے اپنی حدود میں جنگ و ہرج
ممنوع قرار دے دیا تاکہ ہماری رعایا سکون سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہے اور خان اعظم چنگیز خاں کی سولہ کے
حق میں دھارکتی رہے لیکن ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہمارے حکوم امیروں اور رئیسوں نے ہمارے اس مخلص بھرے اعلان
کا غلط مطلب لیا اور ہمیں کمزور سمجھنے لگے۔ ان میں خود مری اور سرکشی بڑھ گئی ہے۔ ہم ”یا سکا“ کا حکم ماننے میں۔ شان اعظم
کا بھی یہی قول تھا کہ سرکشیوں کا سرکشی دور۔ ان کے سردوں کے مینار کھڑے کو دو اور آبادیاں تیس ہنس کر دو۔۔۔۔۔۔ اب ہم
پھر ہم قول پر عمل کریں گے۔ ہم یورپ پر یلغار کریں گے۔ عیسائی مذہب غلط ہے۔ یہ مذہب
دشمن کو معاف کرتا ہے۔ یہ بات ”یا سکا“ کے خلاف ہے۔ ہم ایسے مذہب کو برداشت نہیں کر سکتے اس لیے حکم دیا جاتا ہے
کہ لشکروں کی از سر نو تربیت ہو اور بلغار کی تیاری کی جائے۔“

باتو خاں خاموش ہوا تو مغل خاندانوں، شامانیوں اور نویوں نے شور مچا چاکرا اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ ان میں
وہ مغل زیادہ خوش تھے جس کی فطرت ہی جنگجو یا نہ تھی۔ لوٹ مار قتل و غارتگری ان کا محبوب مشغلہ تھا مگر کچھ سمجھنے والے مغل
ایسے بھی تھے جو باتو خاں کے اس اعلان سے خوش نہ تھے۔ یہ بوڑھے مغل چنگیز خاں کی یلغار کے بعد باؤں اور تھوڑے

تباہ کاریاں دیکھ چکے تھے۔ وہ روس اور مغرب کا امن بنا کر نہیں چاہتے تھے۔ ان کا شہر مغلے مشرق اور مغرب
ایک عظیم تاج قرار دیتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مغل عیسائیت کو ختم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ عیسائیت، مغلوں کے
لیے ایک مضبوط فیصل کا کام دے رہی تھی۔ عیسائیوں نے مسلمانوں سے مذہبی جنگ چھڑ رکھی تھی اور مسلمان ہی مغلوں کے
سب سے زیادہ طاقتور دشمن تھے۔ مغل یہ جانتے تھے کہ چنگیز خاں نے مسلمانوں کو سب سے زیادہ تباہ کیلئے اور یہ

سب سمجھتا کہ مصر میں پناہ گزین ہیں۔ اگر عیسائیوں کو ختم کیا گیا تو مسلمانوں کی طاقت اور بڑھ جائے گی۔

یہ سب کچھ سوچے سمجھنے کے باوجود یہ بوڑھے مغل، باتو خاں کے سامنے زبان نہ کھول سکے۔ جب باتو خاں نے
نئی دلی سے پوچھی تو وہ مخالفت نہ کر سکے اور خاموش رہے لیکن اس اعلان کی سب سے پہلے جس نے مخالفت کی وہ دربار
اقرب کا دار و دروغی (گورنر) تھا۔

جب شور و غل مچا ہوا تو وہ اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ دار و دروغی، خاقان منگو خاں کا نایندہ قتل سب اس کی عزت کرنے
تھے۔ بہر حال خاموشی طاری ہو گئی۔ باتو خاں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ دار و دروغی کی کیا کہنا چاہتا ہے
یونکہ یہ مسئلہ اس کے خزانے سے تعلق نہ رکھتا تھا۔

دار و دروغی بولا:

”اے شمشاد مغرب! مجھے اس مسئلے میں کچھ حق نہ ملنے کی اجازت دی جائے۔“

باتو خاں نے جیس بہ جیس ہوتے ہوئے کہا:

”مگر تم اس مسئلے سے کیا تعلق ہے۔ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ ہم شمشاد مغرب میں۔ ہم جو چاہیں کر

دار و دروغی نے مغل شمشاد مغرب کی ناراضگی کی پروا نہ کی اور بولا:

”اے بزرگ مغل باتو خاں۔۔۔۔۔“

باتو خاں نے اس کی بات لکھ دی اور سخت لہجہ میں کہا:

”مہم خاقان کے نایندہ سے کو یہ حق نہیں دے سکتے کہ وہ ہمیں شمشاد مغرب کے لقب کے بجائے ہمارے خاندان
کے ہیں مخاطب کرے۔ یہ گناہی ہے۔“

دار و دروغی کو اب بھی کوئی خوف نہ محسوس ہوا۔ اس نے بے ہتھک کہا:

”یہ درست ہے کہ روس اور یورپ میں شمشاد مغرب، زار فیئر، سیرز سب ہی آپ کے القاب ہیں لیکن
مغل باتو خاں کا کتاب ہے اور میں اس دور میں اسی خاقان کا نایندہ ہوں میرے حق
میں تسلیم کیا جائے۔“

”اچھا کو۔ دار و دروغی! تم کیا کہنا چاہتے ہو ہم اجازت دیتے ہیں۔“ باتو خاں نے ہتھار بھی ڈال دیے اور
سب بھی قائم رکھا۔

دار و دروغی نے کہا:

”بزرگ مغل باتو خاں کو اپنی حدود میں پورے اختیار حاصل ہیں۔ وہ شمشاد ہے۔ خود مختار شمشاد!

لیکن اگر شمشاد مغرب کوئی اقبال قدم اٹھانے کا قصد کرے جس سے تمام مغل قوم کے متاثر ہونے کا خدشہ ہو تو وہ خیانت ہے کہ ایسی صورت میں شمشاد مغرب کو دربار قراقرم سے ضرور مشورہ کرنا چاہیے۔
باتو خان بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے کہا،

داروند چ۔ تم نے پوری قوم کا مسئلہ کیوں بنا رہے ہو۔ عیسائیوں کی کسی سے بھی جنگ و صلح کا مسئلہ ہمارا مسئلہ ہے۔ اس میں ہم قراقرم کے ماتحت نہیں۔ خاقان ہمیں کس قانون سے روک سکتا ہے۔
داروند چی کو غصہ آگیا۔ آخر وہ خاقان کا تائیدہ تھا۔ اس نے کڑک کر جواب دیا،
”شمشاد مغرب کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ عیسائی ملک اور عیسائیت میں بڑا فرق ہے۔ اگر شمشاد مغرب تارین کر خفا میں نفع سے بھگتتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جھلمائی اور جگمگاتی بیڑوں کے تحت ہوا میں کسی عیسائی ملک پر چڑھائی کرتا ہے تو قراقرم کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں لیکن عیسائیت ایک مذہب ہے جس کو رہے جہاں اس کے مددگار پھیل رہے ہوں۔ لگا ہوں کو فرحت اور دل کو سکون بخشتے ہیں۔ اب اگر اس سرسبز جب شمشاد عیسائیت پر حملہ آور ہو گا تو وہ متحدہ عداوت قائم کریں گے اور ایسی صورت میں شمشاد مغرب کا قراقرم چاڑی علاقے کو پر یوں کا مسکن کہا جائے تو اس میں تعجب یا حیرت کی کوئی بات نہیں۔
مشورہ کرنا اخلاق اور روایتی فرض ہے۔“
داروند چی نے آخر شمشاد مغرب کو اپنے دلائل سے قائل کر لیا۔
باتو خان نے اعلان کیا:

تیاریاں جاری رہیں۔ ہم خاقان قراقرم کو اطلاع بھیج رہے ہیں۔
لیکن نہ تو قراقرم کوئی اطلاع بھیجی گئی اور نہ عیسائیت کے خاتمے کے لیے کوئی یلغار ہوئی اس لیے کہ عیسائیت بے باک انھیں دیکھنے والوں کو غور اور بے خود بنادیتی تھیں۔ اس کی حشر سامان نگاہیں اور شوح ادا میں ازبک شکر اور ہی چل کر شمشاد مغرب کے جیوں تک اٹھی تھی۔
دوسرے ہی دن شمشاد مغرب کے سب سے بڑے لڑکے ”موتاک“ نے اپنے عیسائی ہونے کا اعلان (مفتخار) کو پار کر کے اطراف میں پھیلا ہوا تھا۔ بڑے بڑے دایان ریاست، مابار شاہ اور شمشاد اس سے دو گھر کی دوسو توری عیسائی ایکڑ سے شہزادے ”موتاک“ کے گئے پیچھے ہوئے تھے۔ آخر وہ کامیاب ہوئے اور انھوں نے گفتگو کی آرزو رکھتے تھے۔
شہزادے کو عیسائی بنایا۔ شہزادے ”موتاک“ نے اپنے ایک ذاتی حکم کے تحت عیسائیوں کو کھلم کھلا عیسائیت کی تبلیغ ابھارت دے دی۔
اس اعلان سے باتو خان کو سخت صدمہ ہوا۔
موتاک اس کام سے بڑا مبہوش تھا اور باتو اسے اپنا ولی عہد بنانا چاہتا تھا۔ آخر اسے حالات سے سمجھنا

عیسائیت کا نام پر چار شروع ہو گیا۔
باتو خان سب کچھ دیکھتے لیکن خاموش رہتا۔ اب وہ سرکاری رجسٹراروں میں اپنی سلطنت کے شمال، ایک دوسرے سے ملے اور سرحدی جگہوں کی انھیں پیدا ہوں۔ اسی لیے نہ تو کوئی مفتخار کی مگر دوسو دان پر حملہ کرتا۔
سے باب آسمان پر سے شامی روشنیوں کا رقص دیکھتا لیکن اسے پھر بھی سکون حاصل نہ ہوتا۔ اس کا عیسائیت اور نہ اسے فتح کرنے کا خواہش مند تھا۔
خانات اعلان جنگ پچھلے راتوں کی طرح سرد پڑ گیا۔
مفتخار کے مشورہ پشت اور برق رفتار گرجستانی سوار اکثر اپنی ریاست کے محل وقوع سے فائدہ اٹھاتے۔۔۔۔۔

اور اطراف وجوان کے تبادرتی یا ماکانوں کو لوٹ لیتے تھے۔ بعض دیدہ دلیر کہ جستانی سوار مشرق میں بچہ بچہ کے ان ماحلی ملاقوں کو بھی تاخت و تاراج کرنے سے گریز نہ کرتے جو بعد و قراقرم کا حصہ تھے۔

تفصلاً نے چلیگزری یلغار کے دوران خانان کی اعانت کر کے ریاست کو بچایا تھا۔ اس وقت ملکہ کا کسر یہاں کاربیس تھا۔ ملکہ کا شوہر اور اب ملکہ بھی خانان قراقرم کی باج گزار تھا۔ وہ حاکم قراقرم کو نہ صرف تسلیم کرتی..... بلکہ سلاطین مخالف بھیج کر اس سے اپنی وفلاری کا اظہار کرتی۔

ملکہ دوسودان کی عمر تیس سال سے کم تھی لیکن جب یہ اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ کہیں جاتی تو دونوں بڑی بڑی ہمیں معلوم ہوتی ہیں۔ دوسودان شادی کے دوسرے ہی سال بڑھ چکی تھی۔ شوہر کے بعد اس نے سنان کا خود سنبھالی اور بڑے اعتماد سے حکمرانی شروع کی۔ باوجود ایک سخت گیر اور خود مروت کی ملکہ ہونے کے وہ بڑا پرو اور مذہب تھی۔ اس نے دوسری شادی کیوں نہ کی؟ اس کا جواب وہ خود ہی دے سکتی ہے لیکن مورخ پر اتفاق کرتے ہیں کہ دوسودان اس زمانے کی تمام معلوم دنیا کی حسین ترین عورت تھی۔ اس کا کوئی مد مقابل رہا اس کی اپنی بیٹی کے!

دوسودان کی کس بیٹی کی طرح حسین و جمیل تھی۔ سوائے عمر کے تفاوت کے ناک نقشہ اور رنگ وہ لحاظ سے وہ دونوں بالکل ایک تھیں لیکن دوسودان اپنی بیٹی تھرو سے ناراض تھی اس وجہ سے نہیں کہ وہ اس کی خوبصورت تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسودان کا بھتیجا داؤد، تفتاز کی حکومت کا دعوے دار تھا اور ناگوار تھرو کو محبت کا فریب دے رہا تھا۔

دوسودان نے تھرو کو کئی بار بھجایا کہ وہ داؤد کے دعوے میں نہ آئے لیکن داؤد نے تھرو پر کچھ ایسا تازہ ملا تھا کہ وہ ہر دم داؤد ہی کا دم بھرتی۔ دوسودان کو بیٹی سے ہلکی محبت تھی۔ اس نے مجبور ہو کر اب اسے اس حال پر چھوڑ دیا تھا لیکن اسے پتہ تھا کہ داؤد مارا سبتین ہے اور کسی نہ کسی وقت ضرور قیامت برپا کرے گا۔ داؤد کو ملکہ دوسودان کے خلاف حکم کھلا بناوٹ کی جرأت نہ ہوئی کیونکہ اگر جستانی قوم اس کا ساتھ دینے آتا تو نہ تھرو داؤد ہر وقت تھرو کو باں کے خلاف بھر کا نارتھا۔ ملکہ، بیٹی کی دلی آزاری کی وجہ سے ان دونوں ملاقات پر کوئی پابندی نہ لگا سکی لیکن اس نے بیچاس مسلح جاسوسوں کو ان دونوں کے پیچھے لگا دیا تھا تاکہ ایک کو ان کے بارے میں صحیح خبریں ملتی رہیں اور ہر وقت ضرورت وہ شہزادی تھرو کی حفاظت بھی کرے۔

شہزادی تھرو ایک پستہ قد تیز رفتار منحنی گھوڑے پر سوار تفتاز کی شمالی دھلوانوں سے اتر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ملکہ دوسودان کا بھتیجا اور ریاست کا دعوے دار داؤد تھا۔

ان دونوں کا دستور تھا کہ وہ دن بھر پہاڑیوں اور جنگلوں میں گھوڑے بھگاتے رہتے۔ جب تھک جاتے تو کسی سبزہ زار یا وادی میں بیٹھ کے محبت کی باتیں کرتے۔

نہاؤن شہزادی..... اس کی پرفریب باتیں سنتی رہتی۔ داؤد داستان محبت کے درمیان ملکہ کی برائی کرتا رہتا..... اور ریاست پر اپنا حق جتانے..... شہزادی، داؤد کی ان باتوں سے اکثر پریشان ہو کر خفا ہو جاتی۔ پھر داؤد جلد ہی اسے مٹا لیتا اور پھر خوش فطیلیاں تھرو عروج جاتی تھیں۔

شہزادی تھرو پرتیج پہاڑی راستے طے کر کے جنگل میں داخل ہوئی۔ پھر سبزے کے کئی چھوٹے ٹھکانے طے کر کے اس مقام پر آئی جہاں چھوٹی چھاڑیاں تھیں۔ ان چھاڑیوں کے درمیان ایک چشمہ بہ رہا تھا اور چشے کے کنارے کنارے ایک راستہ تھا۔ یہ راستہ اتنا تنگ تھا کہ دونوں گھوڑے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ اب شہزادی آگے بگئی اور داؤد پیچھے۔

شہزادی کچھ ایسے خیالوں میں کھوئی تھی کہ اسے وقت اور فاصلے کا خیال ہی نہ رہا تھا۔ دونوں بغیر بات کیے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

داؤد دل میں سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں آج شہزادی کہاں ٹھہرے گی۔ پھر اک دم اس کے دماغ میں ایک خیال آیا اور وہ خوش ہو گیا۔

اس نے شہزادی سے کئی بار تفتاز سے جھگڑنے کو کہا تھا لیکن شہزادی نے ہر بار انکار کیا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ شاید شہزادی آج اس کے ساتھ جھگڑنے پر آمادہ ہے اسی لیے اتنی دور نکل آئی ہے۔

شہزادی کو پہاڑی سے اترنے سے دو گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے کہ ایک اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ سچا لکھوڑا ٹھوکر کھا کر فوراً سنبھل گیا ورنہ شہزادی تو ایسی بے خیال میں بیٹھی تھی کہ وہ ضرور گر جاتی۔ اب شہزادی کو ہوش آیا۔ داؤد گھوڑا بڑھا کر اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

شہزادی نے کہا:

ہم کس جگہ ہیں داؤد؟

جس جگہ وہ محبت جیسے دل ملتے ہیں۔ داؤد نے ہنس کر کہا۔

شہزادی نے گھوڑا روکے ہوئے کہا:

تم بہت شوخ ہو گئے ہو۔ اس جگہ کا نام کیا ہے۔ میں پہلے کبھی ادھر نہیں آئی۔

داؤد نے جواب دیا :

”بیاری تمہارے میں بھی اس طرف پہلی دفعہ آیا ہوں مگر یہ مقام ہے بڑا پر نفا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جس مقام پر تم جیسی حسینہ پہنچ جائے وہ مقام خزاں رسیدہ بھی ہو تو گل و گلزار ہی جاتا ہے۔“
داؤد اسی روز اس کے حسن کے قصیدے پڑھا کرتا تھا۔ شہزادی تمہارے کو اسی لیے داؤد بہت پسند تھا وہ ایسی باتوں سے بہت خوش ہوتی تھی۔

شہزادی نے کہا :

”کیا خیال ہے داؤد۔ اور آگے چلیں؟“

داؤد مسکرایا اور شوخی سے بولا :

”ہم تو شہزادی تمہارے کے غلام ہیں۔ حکم کے غلام۔“

اس وقت یہ دونوں ایک ادنیٰ چٹان کے قریب تھے۔ تمہارے پنا گھوڑا بڑھا کر چٹان پر پہنچی۔ چٹان کے اُس طرف نشیب میں جنگلات کا طویل سلسلہ تھا۔ اس کے بعد کچھ گھوڑوں کی نظر آ رہی تھیں۔

شہزادی نے کہا :

”جنگل کے اُس پار کوئی آبادی ہے۔ ذرا دیر آرام کر کے آبادی میں چلیں گے۔“

داؤد بولا :

”ضرور چلیں گے تاکہ آبادی والے اپنی ملک کو دیکھ لیں۔“

شہزادی گھوڑے سے کود پڑی۔

داؤد نے چستے سے ذرا ہٹ کر قالین بچھا دیا۔ یہ قالین اس کی زین کے ساتھ گسا رہتا تھا۔ شہزادی کی

قالین پر بیٹھتے ہوئے بولی :

”داؤد۔ میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ مجھے ملک بننے کا کوئی شوق نہیں۔ ملک میری ماں روسودان ہے۔ یہ میرے لیے کافی ہے۔“

”تمہیں شوق ہو یا نہ ہو لیکن مجھے تو بادشاہ بننے کا شوق بھی ہے اور یہ میرا حق بھی ہے۔“ داؤد نے ذرا تیز ہو کر کہا۔

شہزادی قالین پر بیٹھتے بیٹھتے اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی :

”داؤد۔ میں کتنی ہوں روسودان کے ہوتے ہوئے تمہیں بادشاہ ہونے کا حق کیسے پہنچتا ہے۔“

”اور میں تم سے پوچھتا ہوں کہ داؤد کے ہوتے ہوئے روسودان کو ملک بننے کا حق کس نے دیا؟“ داؤد نے

ترشی سے کہا۔

شہزادی کا جواب بھی ترش ہو گیا۔ اس نے کہا :

”میری ماں روسودان کو یہ حق اگر جستانی مردانوں نے دیا ہے جو کہ ہستان نفا کے محافظ ہیں۔ تم ان سے اپنا حق مانگو۔ میری ماں کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔“
تمہارے اور داؤد میں تلخی بڑھ گئی۔ دونوں کے منہ پھول گئے۔

وہ دونوں قالین پر برابر برابر لیٹ تو گئے لیکن اس طرح کمان کے منہ مخالف سمتوں میں تھے مگر یہ حالت زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ کچھ دیر تو وہ خاموش بیٹھے رہے۔ پھر تمہارے نے پہلی کی۔ اس نے داؤد کے کسی مادی۔ داؤد نے کسی کا جواب کسی سے دیا۔ تمہارے نے چٹکی لی۔ داؤد نے تمہارے کے لات مادی۔ تمہارے نے پٹ کے داؤد کے بال پکڑ لیے۔

داؤد نے گھوم کر دیکھا۔ تمہارے مسکرائی۔

پھر داؤد نے اٹھ کر زین سے چری نکلی اور چوبی گلاس نکالا۔ تھیلی میں شراب تھی۔ اس نے پہلے خود آدھا گلاس پیا۔ پھر گلاس بھر کے تمہارے طرف بڑھا دیا۔ تمہارے کی آنکھوں کے دُور سے پسے ہی سرخ ہو گئے تھے اور اس کی رفتار تیز ہو چکی تھی۔

شراب نے اس کے منہ پر سلاخ لگائی۔ اور پھر وہ دونوں ایسے بے خود ہوئے کہ نہ پس نہ تک انہیں ہوش نہ رہا۔

شہزادی تمہارے کی آنکھ سے کھلی۔ وہ بھی بولے کہ شہزادی کو سوتے میں محسوس ہو گا اس کے چاروں طرف لوگ زور زور سے بول رہے ہیں۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ شہزادی کے ایک طرف چالیس پیراں گر جستانی سوار گھوڑوں کی راسیں پکڑے کھڑے تھے اور دوسری جانب میں پچیس خوفناک چہرے والے اچھی کھڑے تھے۔

شہزادی نے جسم چراتے ہوئے اپنے کپڑے درست کیے اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے داؤد کو زور سے شونگا مار کر جگا دیا۔

شہزادی نے ایک گر جستانی سے پوچھا :

”یہ جنگل کون ہیں؟“

اس نے کہا :

”شہزادی صاحبہ۔ یہ شمشاد مغرب باتو خاں کے محل سپاہی ہیں۔“

شہزادی نے اس سے پہلے محل کبھی نہ دیکھے تھے۔ اسے صرف یہ بتایا گیا تھا کہ محل خوفناک چہروں والے

انسان نادرندے ہوتے ہیں۔ اس نے گھوم کر مغلوں کو پھر غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے واقعی خوفناک تھے۔

شہزادی نے پوچھا:

”یہ قفقاز میں کیوں آئے ہیں؟“

گرجستانی بولا:

”شہزادی محروم! یہ قفقاز میں نہیں آئے بلکہ آپ میری کوئی ہوئی مغلوں کی سرحد میں آگئی ہیں۔“

شہزادی کچھ گھرائی پھر بولی:

”یہ تو بہت بڑا ہوا۔ اب یہ کیا چاہتے ہیں۔“

”یہ لوگ صدمہ رہے ہیں کہ یہ آپ کو اپنے سردار کی اجازت کے بغیر واپس نہ جانے دیں گے۔“

شہزادی کو کچھ پایا۔

محروم نے پوچھا:

”کیا یہ ہماری زبان جانتے ہیں۔ میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”جی نہیں۔“ گرجستانی نے بتایا:

”میں مغلوں کی فوج میں کچھ دن رہ چکا ہوں۔ میں نے ان سے ان کی زبان میں بات کی ہے۔“

داؤد بھی اس وقت اپنے آپ کو ٹھیک ٹھاک کر چکا تھا اور بڑی حیرانی سے مغلوں کو دیکھ رہا تھا۔

شہزادی نے ”گرجستانی سے پوچھا:

”پھر اب کیا کرنا؟“

”آپ حکم دیں۔ ہم ان سب کو قتل کر دیں گے۔“

گرجستانی نے اپنے کانہ سے سے کمان اتاری:

”ہم آپ کو برقانی خان کے پاس نہیں جانے دیں گے۔“

”یہ برقانی خان کون ہے۔“ شہزادی نے دلچسپی ظاہر کی۔

”برقانی خان مغل شہزادہ ہے۔ باتو خان کا چھوٹا بھائی۔ وہ اس سردار کا بیٹا ہے۔“ گرجستانی نے بتایا۔

”خواہ مخواہ بھاگ کر اس کی ضرورت نہیں۔“ شہزادی نے فیصلہ کر لیا اور انداز میں کہا:

”ملکہ کو معلوم ہو گا تو وہ ناراض ہوں گی۔ برقانی خان کہاں ہے۔ ہم خود چل کر اس سے بات کرتے ہیں۔“

شہزادی کو مغل شہزادہ سے پورا باتو خان کے بھائی کو دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ اس نے شہنشاہ مغرب کے جاوید

جلال کے بہت سے اصلے سے تھے۔ وہ اس کے بھائی کو دیکھنا چاہتی تھی۔

داؤد اور گرجستانی نے شہزادی کو کچھ نکلنے کی بہت کوشش کی۔ اسے گرفتاری کے خطرے سے آگاہ کیا۔ مغلوں کی

ہوس اور بربریت سے ڈرایا لیکن شہزادی اپنی ضد پراڑ لگئی۔ پھر جب شہزادی نے کہا کہ:

”میں برقانی خان کے پاس اکیلے جا کر گفتگو کروں گی۔“

تو وہ سب مجبور ہو گئے۔

برقانی خان کا پڑا کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ شہزادی اپنے آدمیوں کے ساتھ بہت جلد اس کے پاس پہنچ گئی۔

برقانی خان بھی بڑے بھائی کی طرح ضمیمہ نشیں تھا بلکہ بھائیوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ تند و تیز اور

ڈیل و دل میں بھی بڑے بھائی جیسا تھا لیکن بالکل طور پر ان دونوں بھائیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ باتو خان کو رحمت

سے بڑھ کر تھا۔ برقانی خان نے دردمند دل پایا تھا۔ باتو خوش تھا۔ برقانی مذہب۔ باتو کثرت سے گوشتی کا دو مہر اور

شراب پیتا تھا لیکن برقانی اس معاملے میں اعتدال پسند تھا۔ باتو خان دعوت کی ہر دو چیز کو اپنی داشتہ بنانا اپنا

حق سمجھتا تھا۔ برقانی دانشمندی کے بجائے تسطنینہ اور روم و مصر کے بازاروں سے کینز خریدتا تھا۔



شہزادی برقانی خان کے پاس پہنچی تو وہ غصے کے ساتھ بڑے قابیل کے درخت پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کئی کئی

عمر کے لوگ ادب سے بیٹھے تھے جن میں سے سوائے ایک کے تمام کی وارثیاں منڈی ہوئی تھیں لیکن ان سب کی

پیشانیوں پر یکساں قسم کے سیاہ میٹھے مینا لے نشان موجود تھے۔ برقانی کے پیچھے کے پیچھے درود و رزمک مغلوں کے

خیمے بھرا درختا راستہ تھے۔

شہزادی داؤد اور چند سپاہیوں کے ساتھ برقانی خان کے قریب پہنچی۔ برقانی خان نے ان نوواردوں کو نظر

اٹھا کر دیکھا۔ پھر انھیں لانے والے محل سے کچھ پوچھا۔ شاید اس نے شہزادی کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ محل سردار

کے جواب دیتے ہی برقانی خان سکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے بڑے مذہب انداز میں شہزادی کو بتالین پر

بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

شہزادی نے قلمین پر بیٹھتے ہوئے اپنے سردار سے کہا:

”مغل شہزادہ سے کلمہ دیا جائے کہ شہزادی قاف محروم کا شکریہ ادا کرتی ہے۔“

لیکن اس کے سردار کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شہزادی کے کان میں برقانی خان کی آواز پہنچی۔

برقانی خان نے کہا تھا: ”مغل شہزادہ! قاف کی شہزادی کو خوش آمدید کہتا ہے۔“

شہزادی نے انتہائی تعجب سے برقائی خاں کو دیکھا کہ چونکہ اس نے یہ جملہ اس زبان میں ادا کیا تھا جو قاف اور اس کے گرد نواح میں بولی جاتی تھی۔ واؤ اور گر جس ستانی سپاہی بھی حیرانی سے برقائی خاں کو دیکھنے لگے شہزادی کی حیرت ذرا کم ہوئی تو اس نے برقائی سے پوچھا:

"ہماری زبان مغل شہزادے کو کسی نے سکھائی؟"

برقائی خاں نے قالمین پر بیٹھے ایک بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"اس بزرگ مسلمان نے۔"

شہزادی کے لیے بزرگ مسلمان کے الفاظ بالکل اجنبی تھے۔ وہ ذرا سوچ کر بولی:

"یہ بزرگ مسلمان کہاں ہوتے ہیں۔ میں ان سے تمام ملکوں کی زبانیں سیکھنا چاہتی ہوں۔"

برقائی خاں بولا:

"حفظاز کے جنوبی دروں کے اس طرف ایک بڑا شہر بغداد ہے۔ یہ وہاں کے رہنے والے ہیں۔"

"لیکن بغداد میں تو عباسی رہتے ہیں۔ شہزادی قمر نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنی ریاست کے اطراف میں تمام علاقوں سے بخوبی واقف ہے۔"

برقائی نے کہا:

"شہزادی صاحبہ! عباسی کوئی مذہب نہیں ہے۔ وہ تو ایک شاہی خاندان ہیں جیسے مغل خاندان۔ اگرچہ مسلمان۔ یہ مسلمان عالم ہیں اور ان کا مذہب اسلام ہے۔ یہ صرف ایک آسمانی خدا کی پرستش کرتے ہیں۔"

شہزادی قمر کو بس یونہی اسلام اور مسلمانوں سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے کہا:

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آسمانی خدا کو تو ہم بھی مانتے ہیں۔ اس طرح ہمارا اور ان کا مذہب تو ایک ہی ہوا۔ قالمین پر بیٹھے ہونے بزرگ نے محسوس کیا کہ ۔۔۔ اس وقت اس طرح کی مذہبی گفتگو کا اچھا موقع ہے انھوں نے برقائی خاں سے اجازت طلب کی کہ وہ شہزادی کو جواب دینا چاہتے ہیں۔ برقائی نے سر کے اشارے سے اجازت دے دی۔"

بزرگ نے کہا:

"اے سری بیٹی۔ ہمارا مذہب تمام آسمانی مذہبوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن ہم سوائے خدا کے اور کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔"

شہزادی کی دلچسپی میں اس لیے اور اضافہ ہو گیا کہ اسے آج تک سوائے اس کی ماں و سوداں کے اور کسی نے نہیں کے غلط سے مخاطب نہ کیا تھا۔

اس نے کہا:

"کیا آپ اپنے بلو شاہ کو بھی سجدہ نہیں کرتے؟"

"ہرگز نہیں۔ بزرگ نے منانت سے جواب دیا۔"

شہزادی نے پوچھا:

"آپ کا نام کیا ہے؟"

اس وضع جواب برقائی خاں نے دیا۔ اس نے کہا:

"یہ بزرگ مسلمان امیر سے استاد شمس الدین باغوری ہیں۔"

شہزادی، برقائی کے استاد کے متعلق کچھ اور سوچا۔ صاحب کرنا اپنی تھی لیکن اس نے دیکھا کہ واؤ دارے یہ بظاہر سے دھمکے سے۔ وہ سخت پریشان تھا۔ کچھ شام ہوئی جلدی تھی اور ابھی تک ان کی داسی کے متعلق کوئی

خبر نہ تھی۔ شہزادی نے اس کے دل کی کیفیت جان لی۔

قمر نے برقائی خاں سے کہا:

"آپ کے سپاہی ہیں لائے ہیں۔ آپ کیا فیصلہ کرتے ہیں؟"

برقائی خاں سکرایا اور بولا:

"شہزادی ہماری ہمارے ہیں۔ جب تک چاہیں جہاں قیام کر سکتی ہیں۔ اگر واپس جانا چاہیں تو ہمارے دستے

آپ کو کچھ قاف کی واؤلوں تک پہنچانے جائیں گے۔"

شہزادی قمر نے برقائی خاں کا شکریہ ادا کیا اور کہا:

"آپ تکلیف نہ کریں۔ ہمارے ساتھ گرجستانی سوار ہیں۔ ہم خود ہی والہ چلے جائیں گے۔"

شہزادی قمر و شیخ شمس الدین سے بڑی متاثر ہوئی تھی۔ اس نے چلتے وقت شیخ کی اجازت سے ان کے

دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا اور پھر اپنے گھوڑے پر سوار ہوئی۔

گھوڑا بڑھانے سے پہلے اس نے برقائی خاں پر بھی ایک طائرانہ نغوظی شہزادی کو برقائی کے دشمنانہ

چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک اور طلال نظر آیا۔ جو ہا دروں یا شاہوں کا خاصہ ہوا کرتا ہے۔

واپسی پر اس نے گرجستانی سواروں کے سروں سے پوچھا:

"تم لوگ ہمارے پاس کیسے پہنچے؟"

سوار کو اس سوال کی تاثیر پہلے سے توقع تھی۔ اس نے فوراً جواب دیا:

"ہمارا راستہ سرحدی گشت پر تعینات ہے۔ بالکل اتفاقیہ طور پر ہم ادھر آ گئے تھے۔"

”داؤد کو معلوم ہونا چاہیے مگر کسی ملک کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دیا کرتے۔“

داؤد نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور اس نے برقانی خان سے درخواست کی کہ:

”مجھے شمشادہ مغرب کے دربار میں پہنچا دیا جائے۔“

برقانی خان نے پہلے تو انکار کیا لیکن جب داؤد نے بہت خوشامد کی اور بڑا تھ پیر ہوڑے تو اس نے دوساروں کے ساتھ داؤد کو باتو خان کے پاس بھیج دیا۔



باتو خان اب تک کبھی کا سوگ منا رہا تھا۔ اس نے خیمہ گاہ کے سامنے دیکھے تھے آتش لکڑوں کو سرد کر کے اس کی تھوڑی سی خاک محفوظ کرادی تھی۔ اب اس نے خیمہ گاہ کے عین سامنے اس جگہ جہاں آتش کہ سے تھے ایک قبر بنانے کا حکم دیا۔ ان قبروں کے مانند جو برقانی خاندان کے بیٹے اس وادی میں ہیں جہاں کیر و لان ندی بہتی ہے جہاں خان اعظم چنگیز خان دفن ہے۔

قبر تیار ہوئی۔

لاش کی جگہ ریشم میں بندھی ہوئی ایک مٹی کی خاک اس میں اتاری گئی۔ شاموں، ساحروں نے جمنتر منتر پڑھنے شروع کیے۔ عود و زبان کے مرغوبے فضا میں بلند ہو گئے۔ قبر کے سر ہلنے ایک پودا لگایا گیا اور..... کبھی کے نام کی تختی کو بران کی گئی۔

باتو مائیں مل ان رسومات سے فارغ ہوا ہی تھا کہ قفقازی شہزادے کی آمد کی خبر اسے خیمے میں پہنچائی گئی۔ وہ قفقاز کے ناپیر جو تک پڑا۔ پھر اسے یاد آیا کہ ملکہ روسوان کی تو صرف ایک بیٹی ہے۔ یہ شہزادہ کہاں سے پیدا ہو گیا؟

باتو خان نے خبر لانے والے سے پوچھا:

”قفقازی شہزادی ہے یا شہزادہ؟“

”شہزادہ ہے اسے شمشادہ مغرب“ اسے جواب ملا۔

کچھ سوچنے کے بعد اس نے شہزادے کو حاضری کی اجازت دی۔ داؤد خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے کمزور دوبرا ہو کر باتو خان کو آداب پیش کیا۔

قفقازی شہزادہ بہت حسین تھا۔

شہزادی کے دل میں پیدا ہوتا ہوا شک و غم ہو گیا اس نے کہا:

”کیا یہ بہت سہرہ ہو گا کہ تم ہمارے یہاں آنے کی خبر ملے کہ نہ پہنچاؤ۔“

شہزادی کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔ سردار نے جواب دیا۔

شہزادی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اسے کیا خبر تھی کہ جس سردار کو وہ ملکہ تک خبر پہنچانے سے روک رہی ہے وہ ملکہ کا جاسوس ہے اور ہر وقت دور دور سے اس کے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔



روسوان کے بھتیجے داؤد نے شہزادی شہزادہ کو رام کرنے کی بہت کوشش کی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر شہزادی اپنی ماں کے خلاف بغاوت کر دے تو گرجستانی قوم دو حصوں میں بٹ جائے گی اور اسے شاہ قفقاز بننے کا موقع مل جائے گا۔۔۔۔۔ لیکن شہزادی شہزادہ نے اپنی ماں کے خلاف بغاوت کرنے سے قطعی اور صاف انکار کر دیا۔

داؤد بہت چلاک انسان تھا اسے شہزادی کی طرف سے ناامیدی بخوبی تو یاد ہو سکتی تھی۔ جب ملکہ کا ایک نیا عزم لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ شمشادہ مغرب سے مل کر روسوان کو اپنے راستے سے ہٹائے گا اسے معلوم تھا کہ شمشادہ مغرب خوبصورت عورتوں کو بہت پسند کرتا ہے۔ اگر اس کے سامنے ملکہ کے حسن و جمال کی تعریف کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ باتو خان اسے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔

داؤد، شہزادی سے مصطفیٰ جانے کا بہانہ کر کے قفقاز سے روانہ ہوا۔ اس کا گھوڑا پہلے جنوب کی طرف چلا پھر اس نے مغرب کا رخ کیا لیکن جلد ہی اس نے قفقاز کے مغربی دروں کو عبور کر کے اپنے گھوڑے کو شمال میں جانے والے اس راستے پر ڈال دیا جو برقانی خان کے پڑاؤ کو جاتا تھا۔

داؤد، جنگلات اور پہاڑی پریچ راستوں کا پیکر کاٹا ہوا دوسرے دن صبح کو برقانی کے پڑاؤ پر پہنچ گیا۔ اس نے برقانی خان سے ملاقات کی اور ریاست قفقاز کے تخت پر اپنا حق جتانے سے پہلے مغللوں کی مدد مانگی۔ برقانی کو اسے پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ ابھی کچھ ہی دن پیشتر وہ داؤد کو شہزادی شہزادہ کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ برقانی خان نے داؤد کی کہنے پر دردمرست کا بھی اندازہ لگایا۔۔۔۔۔ اور پھر اس نے ایک ہی جملہ کہہ کر داؤد کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

برقانی خان نے اس کی طویل بات چیت اور دیلوں کا جواب دیا:

باتو خاں نے دیکھی سے پوچھا:

”ہم نے سنا ہے قفقاز کی عورتیں بہت حسین ہوتی ہیں۔“

”شہنشاہ نے درست فرمایا: داؤد نے کہا،

”قفقاز دنیا کی حسین ترین عورتوں کا مسکن ہے۔“

باتو سائیں خاں نے پوچھا:

”تمہارے بیٹے ہو۔“

”ہمیں روسودان کا جیتنا اور رہنا۔“ داؤد نے جواب دیا۔

”کیا روسودان بہت خوبصورت ہے؟“ باتو خاں نے دیکھی سے پوچھا۔

”داؤد، کو ای سی حوالہ کا انتظار ہمارے لئے تو جواب دیا:

”وہ حسن کی دیوی ہے شہنشاہ مغرب، الفاظ میں اس کے حسن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ روسودان کی بڑی بڑی آنکھیں ایسی ہیں کہ اگر ہر نر دیکھیں تو چوکی بھول جائیں۔ اس کے گال بدستانی صلیب اور مرقدی تر بوڑوں سے زیادہ مرغ ہیں۔ امد کے لہجے ہرے بال اتنے چمکدار اور چمکنے ہیں کہ مٹھی کی گرت سے پس کر نکل جاتے ہیں۔ اس کی آواز آتشا روں کا نرم شور، اس کی چل مانند چوہر۔ وہ بولتی ہے تو بھول جڑتے اور موتی روتے ہیں۔ اے شہنشاہ مغرب اس جیسی حسین عورت دنیا کے کسی گوشے میں موجود نہیں۔“

باتو خاں جو بڑے غور سے داؤد کی باتیں سن رہا تھا جب داؤد خاموش ہوا تو مسکرا کر بولا:

”قفقاز شہزادے! تو تو جیسیوں جیسی شاعری کرتا ہے۔“

داؤد نے کہا:

”شہنشاہ مغرب نے درست فرمایا۔ روسودان کو شاد دیکھ کر خوشی بھول جاتے۔ مصور دیکھ کر اس کے ہاتھ سے قلم گر جاتے۔ سنگتراش کی نظر پڑے تو وہ خود پتھر بن جاتے اور اگر شہنشاہ مغرب دیکھے تو....“ داؤد نے رک کر سانس لی۔

باتو سائیں خاں اپنا نام سن کر چونکا اور کہا:

”شہزادے! اپنی بات پوری کر۔ شہنشاہ مغرب دیکھے تو کیا ہو؟“

داؤد نے اس کی آنکھیں شوق کو بھر جانے کے لیے کہا:

”شہنشاہ مغرب پہلے اجمعی شہزادے کے گستاخی معاف فرمائیں۔ ممکن ہے کہ میری زبان سے وہ بات نکل جائے جو شہنشاہ کو ناگوار گزرتے اور میں قابل گردن زدنی قرار پاؤں۔“

باتو خاں نے تڑپ کر کہا:

”جو چاہے کہ دے شہزادے۔ ہم نے تیری جان بخشی کی۔“

داؤد جب کہ آداب بجالایا اور کہا:

”اگر شہنشاہ مغرب، ملکہ روسودان کو دیکھے تو ضرور پسند فرمائے۔ اگر نہ پسند فرمائے تو داؤد کی گردن

اڑا دی جائے۔“

باتو خاں نے شہزادے کی بات پر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا:

”ہمیں قفقاز شہزادے کی بات پسند آئی۔ ہم ملکہ روسودان کو ضرور دیکھیں گے۔“

خیمے میں سناٹا چھا گیا۔ زراویر بعد باتو خاں کو خود ہی خیال آیا۔ اس نے پوچھا:

”شہزادے! تو یہ بتا کہ ہمارے پاس تو کس لیے آئی ہے؟“

شہزادے داؤدہ دل خوش ہو گیا۔ اس نے کہا:

”اے شہنشاہ مغرب! ملکہ روسودان کا شوہر میرا چچا تھا۔ اس کے مرنے پر اصولی طور پر قفقاز کی ریاست

مجھے عینی چاہیے تھی مگر ملکہ نے میری کم عمری سے فائدہ اٹھا کر تخت قفقاز پر قبضہ کر لیا۔“

باتو خاں نے سپٹ بٹے میں کہا:

”شہزادے! تو بات گھما کر کہوں کہتا ہے۔ صاف کہہ کہ تو ہماری مدد سے قفقاز کی ریاست حاصل کرنا

چاہتا ہے۔“

شہزادے نے کہا:

”اگر شہنشاہ مغرب قفقاز کا تخت مجھے بخش دیں تو قفقاز ہمیشہ اس کا مطیع و فرمانبردار رہے گا۔“

”لیکن قفقاز کا علاؤ تو آج بھی مغلوں کی حکومت کا ایک حصہ ہے۔ قفقاز ہماری جنوب مغربی سرحد ہے۔“

باتو خاں نے داؤد کو کچاچا۔

داؤد نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے کہا:

”لیکن ملکہ روسودان خود کو شہنشاہ مغرب کا محکوم نہیں سمجھتی۔ وہ قزاقوں کے خاقان منگو خاں کے ہر سال تحفے

بجھتی ہے۔“

”شہزادے.....“ باتو خاں کو تندر سے جلال آیا:

”تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ خاقان منگو خاں اور باتو سائیں خاں ایک چہرے کی دو آنکھیں ہیں جس طرح

دونوں آنکھوں کی نظر میں کوئی فرق نہیں، خاقان قزاقوں اور شہنشاہ مغرب میں بھی کوئی امتیاز نہیں کیا جاسکتا۔“

داؤد نے شہ دی اس نے کہا:

"لیکن مکہ نے ہر جگہ شمشاد مغرب کو نہ تو کبھی کوئی تختہ بھیجا۔ سلام کے لیے حاضر ہوئی؟

باتو خاں نے بڑے رعب سے کہا:

"اب تو دیکھیے گادہ تختے لے کر ہلے سے جدے کو کھڑے گی؟

"کاش ایسا ہی ہو اور وہی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

باتو خاں کو غصہ آگیا اس نے چیخ کر کہا:

"یہ کاش کیا ہوتا ہے؟ ہمارا حکم جاودانی آسمان کا حکم ہے۔"

باتو خاں اور داؤد کی یہ گفتگو اس زمان کی معرفت ہوئی جو کر جہانی اور مصلحتی زبانوں کا ماہر تھا۔ باتو خاں

دربار میں ایسے بہت سے مترجم موجود تھے جو یورپ اور جنوب سے آنے والے سفیروں اور امیروں کی ترجمانی کرتے تھے۔ باتو خاں اور ان کے درمیان واسطے کا کام دیتے تھے۔

داؤد دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اس کا تیر نشانہ پر بیٹھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مکہ روسودان کی خود

اسے اس بات کی اجازت نہ دے گی کہ وہ "میرا" پیچ کر باتو خاں کے سامنے سجدہ کرے۔ اور اگر بالفرض وہ

مصلحت کے تحت باتو خاں کے سامنے پیچ گئی تو اس کا حسن اس پر بڑھے کو متاثر کیے بغیر نہ رہے گا۔ پھر مکہ

خان کی داشتہ اور وہ قفقاز کا بادشاہ بن جائے گا۔

وہ انہی خیالات میں گم تھا کہ باتو خاں کی آواز آئی۔ شاید وہ داؤد کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔

باتو خاں نے کہا:

"شہزادے۔ تو خاموش کیوں ہو گیا۔ کیا تجھے شمشاد مغرب کی بات کا یقین نہیں؟"

داؤد گھبرا گیا۔ اس نے جلدی سے کہا:

"شمشاد مغرب کے حکم کی خلاف ورزی کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے تو ایک اور بات پریشان ہے۔"

کہ رہی ہے۔

باتو خاں نے پوچھا:

"تو ہمارا امان ہے شہزادے۔ ہم تجھے پریشان نہیں دیکھ سکتے۔ بتا تجھے کسی بات نے پریشان کیا؟

داؤد کو اپنے خدشے کے انکار کا موقع مل گیا۔ اس نے کہا:

"شمشاد مغرب! میں اس بات سے پریشان تھا کہ کہیں مکہ روسودان، خاتان خرازم کی اطاعت کا بے وفائی کی طرح حلیف استقلال کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

مکہ کے آپ کے دربار میں آنے سے انکار نہ کر دے۔"

باتو خاں کو غصہ آگیا وہ بولا:

"یہاں شہزادے۔ تو بار بار خرازم کا نام لے کر ہمیں غم کیوں دلا رہا ہے۔ خرازم کا سردار چارمغل، قفقاز

جنوبی مصر کے قریب موجود ہے۔ ہم اسے صلح کر دیں گے۔ وہ ہماری مخالفت نہیں کر سکتا؟

اب داؤد نے مکہ روسودان کے خلاف مضبوط عہد قائم کر لیا تھا اور قفقاز کا تخت اس کے تصور میں گوم

اٹھا۔

داؤد نے چاہا کہ باتو خاں کو سلام کر کے رخصت ہو جائے لیکن اسی وقت اسے اطلاع دی گئی کہ شاہ فرانس

ایک برہنہ یا سفیر شمشاد مغرب کے حضور نذرانہ تحفہ پیش کرنا چاہتا ہے۔

باتو خاں نے اسے پیش کیے جانے کی اجازت دے دی اور داؤد سے کہا:

"شہزادے! پھر داؤد کو دیکھو کہ یورپ کا ایک شمشاد ہماری دوستی کا کتنا خواہاں ہے۔"

فرانس کا برہنہ یا سفیر دربار باتو خاں میں پیش کیا گیا۔



باتو خاں میں ماں کا نا یورپ کے درباروں میں مشہور ہو چکا تھا۔ اس وقت مقتصد شمشاد فرانس کوئی مسلمانوں

یہ خاتون مصر میں صلیبی جنگ لڑ رہا تھا اور اس کے مقابلہ پر مصر کی جلیل القدر مکہ شجرۃ اُکارتھی۔ مکہ نے اپنی شجاعت اور

فی تدبیروں سے نہ صرف شمشاد فرانس کے مصر کی طرف بڑھتے ہوئے قدم روک دیے تھے بلکہ اپنے جوانی حلوں سے

ان کا نام میں دم کر رکھا تھا۔

اس عظیم اور مدبرانہ حکم کو یورپ کے مورخوں نے ایک "آشفہ سر" لکھا تھا کہ اسے کرپے دل کی بھڑاس

اس وقت مکہ مصر کے آگے بے بس ہو کر شمشاد فرانس کو کسی ایسے حلیف کی ضرورت محسوس ہوئی جو اسے

مسلمانوں کے خلاف مدد دے سکے۔ اس کی نظر خرازم کے سنی خاتان اور شمشاد مغرب کے ملوانے والے مغل باتو خاں

پر پڑی اور اس نے اپنا ایک برہنہ یا قاعدہ یا بیلیم کا راب و لیم ساکن روپہ دوک، مغلوں کے خاتان ملگو خان کے

دربار میں روانہ کیا۔ تاکہ وہ معلوم کر سکے کہ باتو خاں اور ملگو خان کس قماش کے آدمی ہیں اور آیا انہیں مسلمانوں کے

دراہب و لیم فریبہ اندام اور حاضر جواب شخص تھا اور مباحث کی استدلالی قوت میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ دراصل

ہم نے سنا ہے کہ شاہِ فرانس اپنی فوج کے ساتھ ملک سے باہر گیا ہے۔ وہ کسی سے جنگ کرنے گیا ہے۔

ولیم نے جواب دیا:

”وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کر رہا ہے جنہوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا ہے۔“

باتو خان نے بڑے غصے سے دربار کے ایک چیمپائی ترک کی طرف دیکھا یہ ترک باتو خان کے حکمہ خیزیا
یسی کا سربراہ تھا اور ہر ملک کی خبروں سے شنشاہ مغرب کا خبر رکھتا تھا۔

چیمپائی ترک ایک دم آگے بڑھا اور نظریں نیچی کیے ہوئے بولا:

”ختمشاہ مغرب امیں نے جو خبر شنشاہ تک پہنچائی ہے وہ بالکل درست ہے۔“

باتو خان نے کہا:

”تو اسد اہب سے بات کر۔ اسے قائل کر یا خود قائل ہو جا۔“

ترک نے غصے سے راہب کو دیکھا:

”تو مذہبی بیستوان/کرجوٹ بولی رہا ہے؟“

راہب نے اطمینان سے جواب دیا:

”جب تک وہ ملت نہ بنائی جلتے جس کے سلسلے میں تو جو کرجوٹ کا الزام لگا رہا ہے میں اُس کے بارے
میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

ترک بولا:

”تو یہ جھوٹ کہہ رہا ہے کہ شاہِ فرانس بیت المقدس میں مسلمانوں سے جنگ کر رہا ہے۔ تیرا بادشاہ تو افریقہ میں
اور مصری فوجوں سے لڑ رہا ہے۔“

راہب سنبھلا اور بولا:

”میں نے یہ نہیں کہا کہ شاہِ فرانس بیت المقدس میں ہے۔ دراصل بیت المقدس پر قبضہ کی وجہ سے شاہِ فرانس
ملاؤں سے جنگ کر رہا ہے۔ چونکہ اس وقت سلطانِ مصر مسلمانوں میں سب سے طاقتور بادشاہ ہے اس لیے ہم اس
شاہ سے شکست دینے گیا ہے۔۔۔۔۔“

چیمپائی ترک نے راہب کو ٹوک دیا:

”اے راہب تو یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ مصر کی سلطنت کا اس وقت کوئی سلطان نہیں۔ وہاں کی حاکم ایک سک
ہے جس نے شاہِ فرانس کو زبردست شکست دی ہے۔“

راہب ولیم ترک کی زبان سے یہ باتیں سن کر حیران رہ گیا اس کا خیال تھا کہ وہ جاہلوں اور وحشیوں کے

راہب کی یہ سفارت باسو سی تھی۔ اس کے جسم پر درویشوں جیسا ایک جھرا خلع لٹا ہوا، کچھ پہننے کے کپڑے اندر
خوشبو بیٹیں، چھل، بکٹ، شراب کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ماکدستور کے مطابق مغربی درباروں میں پیش کرنے
اس کے پاس کوئی تحفہ نہ تھا صرف چند خطواتھے جن میں سے ایک خود وہ باتو خان کے بیٹے ”متر تاک“ کو
چھکا تھا۔

راہب ولیم کی اصل منزل قرار مقرر تھی لیکن وہ بغیر باتو خان کے دربار میں حاضری دینے وہاں نہیں
اس لیے اب وہ شنشاہ مغرب کے پاس آیا تھا۔

ولیم خیمے کے اندر پہنچا تو اس نے شنشاہ مغرب کو ایک صحنہ پر بیٹھے دیکھا۔ باتو خان غیر نسر
نشین تھا لیکن بیگم کی موت کے بعد اس میں ایک تبدیلی آئی تھی کہ اس نے اپنے بیٹھنے کے لیے ایک صحنہ
عکس ہے کہ یہ مشورہ اسے شامانوں یا نوپروں نے دیا ہو کہ تخت پر بیٹھنے سے اس کے مرض گھٹیا میں آفادہ ہوگا
راہب ولیم نے شامیانہ میں داخل ہوتے ہی باتو خان کو سجدہ کیا۔ پھر سر جھکا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔
خوڑی دیر تک غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اسے بات کرنے کا اشارہ کیا اور گفتگو مترجم کے واسطے
شروع ہوئی۔

راہب نے کہا:

”میں کوکرتا ہوں کہ زریں خیل کے خان پر آسمانی رحمتوں کا نزول ہو۔“

باتو خان نے پوچھا:

”کیا تو فرانس کے بادشاہ کا قاصد ہے؟“

ولیم نے جواب دیا:

”میں اس لیے آیا ہوں کہ میرے آقا اور شنشاہِ فرانس نے یہ سنا تھا کہ زریں خیل کے خان کا
گیا ہے اس لیے مجھے مبارک باد کے لیے بھیجا گیا ہے۔“

باتو بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے سوال کیا:

”تمہارا بادشاہ کتنا طاقتور ہے؟“

شنشاہِ فرانس نے راہب کو تاکید کی تھی کہ بغیر دربار میں براہی کے اصل پر گفتگو نہ کرے۔
راہب نے کہا:

”شنشاہِ فرانس کوئی بھی اتنی ہی طاقت ہے جتنی زریں خیل کے خان کی ہے۔“

یہ بات باتو خان کو ناگوار گزری۔ اس نے پوچھا:

دیس میں جا رہے لیکن یہاں تو اس سے بھی زیادہ باخبر لوگ موجود تھے۔

”جس رات میں سرائی سے چلا تھا اس رات ان دونوں میں جنگ ہو رہی تھی۔ فتح و شکست کمال دے دے اور شہزادی محمود کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنا تھا۔ پھر جب ملکہ کو یہ خبر دی گئی کہ داؤد قسطنطنیہ جانے کا قصد کر رہے تو اس کے کان کھڑے ہوئے۔ ملکہ کو داؤد اور شہزادی محمود کے مغل علاقے میں بدلنے اور مثل شہزادے راہب نے یہ کہہ کر اپنی جان بچرائی۔ اب وہ ترکے سے بات کرتے خوف کھارہا تھا اور چاہتا تھا کہ برقانی خان سے گفتگو کرنے کی پوری تفصیل معلوم ہو چکی تھی۔ وہ داؤد کی طرف سے پہلے ہی مشکوک تھی لیکن بیٹی کی وجہ سے رخصت مل چلتے۔

باتو خان کو یحییٰ (فرزاند) کا خطاب دربار قراقرم سے ملتا تھا۔ وہ سیاسی معاملات میں واقعی فرزند تھا۔ ملکہ نے داؤد کے تعاقب کا حکم دیا۔ جب داؤد قفقاز کی پہاڑیوں کا چکر کاٹ کر مثل علاقے میں داخل ہوا تو ملکہ راہب باتو خان کو متاثر نہ کر سکا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ یہ راہب باتو خان کی سمجھ میں نہ آیا۔

پھر جب راہب نے دربار قراقرم میں بدلنے کی خواہش ظاہر کی تو باتو خان نے اسے فوراً اجازت دیدی کہ اس نے اپنے سرحدی علاقے میں تیر اندازوں کے مورچے قائم کر دیے۔ کیونکہ داؤد کے مغلوں کے تو مانوں (سرداروں) کے ساتھ اسے قراقرم روز کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے ملگوں کے نام ایک خط بھی بھیجا جس میں ملکہ کو بتایا کہ وہ مغلوں کی مدد سے قفقاز پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ ملکہ کا یہ خیال کسی حد تک اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ راہب و لیم کے لئے کا مقصد مولے اس کے اور کچھ نظر نہیں آتا کہ وہ مغلوں کو مسئلہ نہ درست تھا۔

اپنی جنگ میں استعمال کرے۔ داؤد نے جو بیٹی قدرتی چشمہ عبور کیا، تیر اندازوں کا ایک گروہ اس کے سر پر پہنچ گیا اور اسے گرفتار کر کے باتو خان نے داؤد کو بھی اس وعدے کے ساتھ قفقاز واپس بھیج دیا کہ ملکہ و سودان کے لئے اس نے اپنا زور دست و دغاویٰ مورچہ قائم کر رکھا تھا۔

صورت میں اسے قفقاز کا بادشاہ بنایا جائے گا۔ داؤد کو باتو خان کے اس وعدے پر اس قدر یقین تھا کہ جب ملکہ و سودان کو داؤد کی گرفتاری کی خبر ملی تو اس نے فیصلہ کیا کہ اس جگہ سے کا وہ اب ہمیشہ کے لیے کالٹ چلا تو تھوڑے دنوں میں قفقاز سمجھنے لگا۔

داؤد کے لیے تقدیر نے کچھ اور ہی فیصلہ کیا تھا۔ اس نے خوشی خوشی مثل سرحد عبور کی چونکہ وہ کاحمان تھا اس لیے سرحدی امیر برقانی خان کے سپاہیوں نے راستے میں اس کی خوب خاطر مدارات کی اور ملکہ و سودان نے شہزادی سے کہا: سرحد پار کرادی۔

برقانی خان کے سپاہیوں نے داؤد کو سرحد پار کر کے ابھی پیٹھ بھی نہ گھائی تھی کہ قفقاز کے گرجا بائیسیم کرے گی۔

شہزادی محمود بہت افسردہ تھی۔ اس کا شہابی رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ داؤد قفقاز کا تخت نے جنگ سے نکل کر داؤد کو لیا اور اسے نشتا کر کے گرفتار کر لیا۔

یہ واقعہ اس قدر قریبی چٹنے کے دوسری طرف پیش آیا تھا جو دونوں ریاستوں کی سرحد سمجھا جاتا تھا اس لیے اس کے اس کی خواہش رکھتا ہے لیکن اس نے یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ مثل و رندوں سے قفقاز کی پاک زمین کو پامال کر کے اسی چوٹی پر گرنے کا ارادہ کرے گا۔

کے سپاہیوں نے اس میں دخل نہ دیا اور واپس جا کر برقانی خان کو داؤد کی گرفتاری کی خبر دے دی۔ برقانی خان نے وہ تمام باتیں جو اس کے سپاہیوں نے اسے بتائی تھیں، ایک تفصیلی خط میں تحریر کر کے اسے غم تھا اور غم سے زیادہ غصہ۔

خط ایک تاصد کے ذریعہ باتو خان کو بھیج دیا۔ غصہ داؤد پر اور خود اپنے آپ پر۔ وہ سوچتی تھی کہ اس نے داؤد کو پہلے کیوں نہ بچھا۔ اس کی بھوٹی محبت پر کیوں اعتبار کیا۔

ملکہ کے حکم سے وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور قدم آگے بڑھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے محافظ سپاہیوں کو اشارہ کیا۔

کر داؤد کو اس کے قریب لایا جائے۔
یاد رکھ۔ اگر تیری مدد کے لیے کبھی مغلوں نے قفقاز کا رخ کیا تو وہ مغرب کی ان ہفت پوش چوٹیوں سے ملکر آتے

وہیں کے گھراسے سر نہ کر سکیں گے۔

داؤد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے پاس جواب تھا بھی کیا!

ملکہ نے زرا انتظار کیا پھر شہزادی سے مخاطب ہوئی:

”شہزادی۔ مجھ نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا ہے تو فیصلہ دے اور سزا کا اعلان کر۔“

ملکہ کے درباریوں نے دیکھا کہ شہزادی کے پیر کا پ سہ ہے ہیں۔ شہزادی نے فیصلہ کیا اور سزا سنائی:

”داؤد کو قید میں رکھا جائے۔ اگر چہ ماہ میں یہ اپنی اصلاح نہ کر سکے تو اسے قتل کر دیا جائے۔“

ملکہ کو اس فیصلے اور سزا سے اتفاق نہ تھا۔ کوئی بھی متفق نہ تھا لیکن ملکہ کو خاموش ہونا پڑا۔ وہ بیٹی کی نصیحت

اور دل آزاری نہیں چاہتی تھی۔

لیکن شہزادی تھوڑی بہ نرم مزاحقت پر ایک قیامت کا پیش خیمہ بن گئی۔



شہنشاہ مغرب باتو مائیں خان نے اپنے بھائی کا خط بڑے تحمل سے سنا۔ اسے داؤد کی گرفتاری کا بڑا اہل ہوا۔
لیکن برتانی خان کے اس خط نے اس کے دل میں کچھ اور ہی وسوسے پیدا کر دیے۔ باتو خان نے رسمی طور پر تو اپنے
بیٹے سمرلاک کی مدد کا اعلان نہ کیا تھا لیکن عا خیال ہی تھا کہ باتو خان کے بعد سمرلاک ہی شہنشاہ مغرب بنے گا۔
عکس ہے کہ برتانی خان کے دماغ میں بھی شہنشاہ مغرب بننے کا خیال ہو کیونکہ اس میں سمرلاک کے مقابلے میں حکمرانی
اور جہان پناہ کی اعلیٰ صفات موجود تھیں اور مغل سرداروں کا ایک بڑا گروہ اسے دل سے پسند کرتا تھا۔

برتانی خان کے خط نے باتو خان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ برتانی خان موجودہ ملکہ سے مطمئن نہیں ہے

اور درپردہ اپنی طاقت بٹھانے کی نگرہیں ہے۔ داؤد کی گرفتاری بھی اسے اس کی ایک کڑی معلوم ہوئی۔

اس نے سوچا ممکن ہے برتانی خان نے روسودان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہو کیونکہ
ملکہ روسودان ہمارے گریہ سناؤ کی ملکہ تھی۔

اس نے اس انداز سے سوچا کہ شاید برتانی خان خود بھی ملکہ روسودان کو حاصل کرنا چاہتا ہو۔ اس کے خیال
میں یہ امکان بھی پیدا ہوا کہ برتانی خان، قفقاز کے جنوبی حصوں کی ڈھلوانوں پر قراقرم کے سردار چار مغلوں سے
ساز باز کر کے کہیں اس کی زندگی یا اس کے بعد اس کے بیٹے سمرلاک کے خلاف علم بغاوت نہ بلند کر دے۔

قریب پہنچ کر داؤد نے شہزادی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں: شاید پچھلی جہت کا واسطہ دے کر انا
چاہتا تھا لیکن جب اس نے شہزادی کی آنکھوں میں بھانکا تو اسے دہان جہت کے پھولوں کے بجائے نفرت اور ستار
کے شعلے نظر آئے۔

داؤد نے گھبرا کر نظریں نیچی کر لیں۔

شہزادی نے بھرپور عجب سے پوچھا:

”تم قسطنطنیہ کے تھے؟“

”نہیں۔ داؤد جو بول کر اپنی سزا کو اور سخت بنا نہیں چاہتا تھا۔“

”تم نے قسطنطنیہ جانے کا کیا نہ کیا تھا؟“

”ہاں۔“

”تم برتانی خان کے پاس گئے تھے؟“

”ہاں۔“

”تم شہنشاہ مغرب باتو خان کے پاس بھی گئے تھے؟“

ملکہ روسودان نے داؤد کی تمام سرگرمیوں کی خبر شہزادی تھوڑی سی پہچاندی تھی۔ داؤد کے پاس

”ہاں یا نہیں“ کے کوئی جواب ہی نہ تھا۔

”تم قفقاز کے تخت پر قبضہ کرنا چاہتے ہو؟“

داؤد نے سر اٹھا یا اور کہا:

”حقیقتاً درمیر قانونی حق ہے۔“

یہ جواب شہزادی کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے ہانکی طرف دیکھی۔

روسودان نے شاید انداز سے داؤد کو غائب کیا:

”اے غدار قوم! کیا تو جانتا ہے کہ تخت و تاج کی اصل طاقت کس کے ہاتھ میں ہوتی ہے؟“

”ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ داؤد نے کہا،

”کسی سلطنت کی اصل طاقت اس کی قوم ہوتی ہے لیکن اس قوم پر ملکہ نے قبضہ کر رکھا ہے۔“

”داؤد! ملکہ نے بگڑ کر کہا،

”خود کو قریب نہ دے۔ قوم نے مجھے وارث قرار دیا ہے صرف قوم ہی مجھ سے یہ وراثت واپس لے سکتی ہے۔“

منس خاکہ باتو خان ان سب امکانات کو رد کر کے برقانی خان کی طرف سے اپنے دل کو صاف کر لیتا۔ پھر وہ اس خبر سے زیادہ پریشان تھا کہ برقانی خان، چینگوی دستور یا سائے انحراف کر رہے اور اسے ہر وقت مسلمان سمجھ رہے ہیں۔

یہ بات اس کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ اس کا بیٹا عیسائی ہوا تو اسے زیادہ افسوس نہ ہوا اس لیے کہ عیسائی اکثریت میں تھے اور وہ "سراک" کہہ لیتے تھے لیکن وہ برقانی خان کا مسلمانوں کی طرف جھکاؤ برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے باتو خان نے حکم دیا کہ اس قاصد کو صاف فرمایا جائے جو برقانی خان کا خط لایا ہے۔ برقانی خان کا قاصد باتو خان کے خیبر میں پہنچا لایا۔ وہ مغلوں کے دستور کے مطابق تسلیمات بھالایا۔ باتو خان نے قاصد کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے سوال کیا:

"برقانی خان کے قاصد! ہمیں بتاؤ کہ اس خبر میں کہاں تک صداقت ہے کہ برقانی خان کا مسلمانوں کی طرف

زیادہ جھکاؤ ہے؟

برقانی خان کے قاصد کو اس قسم کے سوال کی امید ہی نہ تھی۔ وہ گھبرا گیا۔ . . . اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جواب دے۔ ایک طرف اس کا آقا برقانی خان۔ دوسری طرف شہنشاہ مغرب یا تو خان۔ . . . قاصد بڑی دیر تک خاموش رہا۔

باتو خان کی نظریں اب تک قاصد کے چہرے پر لگی تھیں اور یہ بات قاصد نے بھی محسوس کر لی تھی۔

باتو خان نے کہا:

"مخل قاصد! تم ہمارے سوال سے پریشان ہو۔ تمہیں اپنے آقا کا خیال آ رہا ہوگا لیکن تم یہ مت بھولو کہ تم

سے سوال کرنے والا شہنشاہ مغرب باتو خان ہے۔ صحیح جواب دینا۔ ہم تمہیں سوچنے کا اور وقت دیتے ہیں۔"

پھر باتو خان نے اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک تومان کے کان میں کچھ کہا۔ تومان نے باتو خان کی بات

سن کر ایک طرف اشارہ کیا۔ فوراً دو مخل ننگی تلواریں لے کر قاصد کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

اب تو قاصد کی جان نکل گئی۔ جان کسی کو پیاری نہیں ہوتی۔ پھر اگر کوئی حتمی بات کہنے پر جان دے تو اس کا

غم بھی نہیں ہوتا۔

قاصد نے سراٹھایا اور کہا:

"شہنشاہ مغرب نے جو کچھ سنا وہ بالکل ٹھیک ہے۔ خان برقانی مسلمان ہو چکے ہیں اور اب وہ کعبہ کی

منہ کے نماز پڑھتے ہیں۔"

یہ سننا تھا کہ باتو خان، شہنشاہ مغرب کا بھی رنگ فاقی ہو گیا۔ خیے میں موجود تھا آگوش شہر رہ گئے۔

مخل عیسائیت سے متاثر ہو رہے تھے۔ بہت سے عیسائی ہو بھی گئے تھے۔ مخل بیگمات تو ماہر پر عیسائی مذہب اختیار کرتی رہتی تھیں لیکن کسی مخل کا مسلمان ہونا اور کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا ان کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ انھیں اپنے کانوں پر بہت دیر بعد یقین آیا۔

باتو خان سپین، شہنشاہ مغرب کی قوت فیصلہ جواب دے گئی۔ وہ برقانی خان کے خلاف قدم اٹھا سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں طاقت تھی لیکن اس کے پیش نظر وہ طاقت بھی تھی جس نے برقانی خان میں اسلام قبول کرنے کی جرأت پیدا کی۔ وہ کونسی طاقت تھی۔ ارضی طاقت، عسکری طاقت یا پھر نیلے آسمانوں کے اوپر والی طاقت۔

باتو خان کو ان حالات کی روشنی میں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اس نے قدم اٹھایا۔

برقانی خان نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ وہ معزول ہو کر مر لائے باتو خان کے پاس پہنچا۔ دونوں بھائی ملے۔ نہ کوئی جگہ نہ شکوہ۔

باتو خان نے برقانی کو شہنشاہ چراگا جوں کی امارت عطا کی اور اسے "مر لائے" سے بہت دور بھیج دیا۔ مر لائے سے دور۔ ولی مدد سے دور اور مسلمانوں کی نجات سے دور۔

صابر و شاہر برقانی خان نے چپ چاپ یہ جلا وطنی قبول کر لی مگر وہ شکوہ کا یہ مادہ شاید اس کا قبولیت نے اسے بخشتا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ اشد مبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔



اور اب باتو خان، شہنشاہ مغرب کا قاصد، تعجب کی چیٹیوں پر ملکہ رو سو دان کے پاس زبانی پہنچا کہ یہ سنا۔ اس نے ملکہ رو سو دان سے کہا:

"یہ مناسب نہیں کہ تم خاقان اور باتو خان کی سرزمین میں رہو اور حاضر ہو کے ان کے آگے تسلیمات نہ عرض کرو۔"

یہ وہی پیغام ہے جو کیناز مینٹیل کو دیا گیا تھا۔

ملکہ نے اس پیغام کو بڑے شہدے دل سے سنا۔ اس کے گرجہ جانی سرداروں کی تیوریوں پر پل پڑ گئے۔ ان کے ہاتھ کانڈے پر پڑی کانوں اور کمرے لشکی تلواروں کو چھونے لگے۔

یہ پیغام اس طرح اعلان جنگ تھا۔

ملکہ نے عقل قاصد کو عزت سے نمان خانے میں بٹھرایا۔ دوسرے دن اس نے قاصد کو ایک خط دیا کہ یہ چار شمشاد مغرب کو ملکہ روسودان کے سلام کے بعد پیش کیا جائے قاصد خط لے کر چلا گیا۔

ملکہ دراصل تندی کے لیے کچھ وقت چاہتی تھی۔ اس نے جنگ کا فیصلہ تو پیغام سننے ہی کر لیا تھا لیکن چاہتی تھی کہ جنگ کو روکنے کی اگر کچھ تدابیر ہو سکیں تو وہ اختیار کر لی جائیں۔

باتوخان کے قصد کی روانگی کے بعد ملکہ روسودان نے اپنا ایک قاصد خاقان منگوخان کے پاس قراقرم روانہ کیا۔ اس قاصد کو ملکہ نے خاقان کے نام ایک خط دیا جس میں اس نے لکھا کہ:

"باتوخان بغیر کسی وجہ کے قفقاز پر قبضہ کرنے کے بدلے ڈھونڈ رہا ہے اور معاہدہ کے تحت خاقان اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اس لیے باتوخان کو قفقاز پر حملے سے روکا جائے یا یہ قفقاز کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔"

ایک دوسرے خط کے ذریعے ملکہ نے سرحدی سردار چار منخان سے باتوخان کے خلاف مدد طلب کی۔ اس چار منخان سے درخواست کی کہ وہ خاقان قراقرم کا نایب رہے۔ اس پر خاقان کے حلیوں کی حفاظت کا فرض آیا۔ ہو سکتا ہے اس لیے قراقرم سے جواب آنے سے پیشتر اگر باتوخان حملہ کرے تو وہ قفقاز کی حفاظت کے لیے انکے لشکر روانہ کرے۔

ملکہ روسودان نے اپنے طور پر تو سب کچھ کیا لیکن قراقرم کا قاصد قفقاز سے ساڑھے تین ہزار میل سے زیادہ تھا۔ اس کے قاصد کا قراقرم پہنچنا اور پھر واپس آنا کوئی بچوں کا کھیل نہ تھا۔ ان ملکہ کا وہ خط جو اس نے چار منخان کو ایک صافہ میں ایک جھپٹے بعد پہنچایا۔

چار منخان بڑا دلیر اور کھمدار سردار تھا۔ باتوخان کے وہ خود بھی خلاف تھا کیونکہ باتوخان ہر بات میں اپنی من کرنا تھا اور قراقرم کے احکامات کی کوئی پروا نہ کرتا تھا۔

چار منخان نے روسودان کو اپنے تعاون کا یقین دلایا اور ایک ہزار مغل سواروں کا دستہ فوراً قفقاز روانہ کر دیا۔

ملکہ روسودان کا خط دوبارہ باتوخان میں پڑھا گیا۔ ملکہ نے باتوخان کو لکھا کہ:

"میں قراقرم کے خاقان منگوخان کی اطاعت گزار ہوں اور اسی کے حکم کی پابندی کروں گا۔ اپنا فرض سمجھتی ہوں۔"

اس نے یہ بھی لکھا کہ وہ باتوخان کو شمشاد مغرب تسلیم کرتے ہوئے اس کا احترام کرتی ہے لیکن جب ایک خاقان منگوخان اسے "مرائے" جانے کا حکم نہیں دیتا اسے مجبور نہ کیا جائے۔

شمشاد مغرب کی یہ تو بہن تھی کہ ایک معمولی ریاست کی ملکہ اس کے حکم کی پابندی نہ کرے۔ اسے سخت طیش آیا۔ خاقان قراقرم کی وہ زیادہ پروا نہیں کرتا تھا لیکن روسودان نے خاقان قراقرم کی اطاعت کا ذکر کیا تھا۔ اس لیے اسے یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں منگوخان اس کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے۔ کیونکہ یہ ایک اصولی مسئلہ ہے۔ قفقاز کا اس نے نہ کبھی پہلے دعویٰ کیا تھا اور نہ خاقان نے یہ ریاست اس کی تحویل میں دی تھی۔ اسے غصہ تو بہت آیا تاہم اس نے کوئی فوری قدم اٹھانے سے گریز کیا۔

باتوخان کا سوا ملکہ فرزند داغاب ان خطوط پر غور کر رہا تھا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ سائب بھی مر جائے اور باغی بھی نہ ٹوٹے۔

وہ ابھی تدبیر سوچ ہی رہا تھا کہ منگوخان کے سرحدی سردار چار منخان کا قاصد اس کے پاس پہنچا۔ قاصد نے جو خط باتوخان کو پہنچایا وہ مختصر تھا اور اس میں درج تھا:

"شمشاد مغرب باتو مائیں کے نام!"

خاقان منگوخان کے سرحدی سردار چار منخان کی طرف سے!

ملکہ قفقاز، خاقان منگوخان کی باج گزار ہے۔ مجھ پر اس کی حفاظت فرض ہے۔

میں قفقاز کی حفاظت کروں گا خواہ اس پر حملہ کسی طرف سے ہو۔

چار منخان کا خط پڑھ کر باتوخان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ملکہ اس نے چار منخان کے قاصد کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ قفقاز پر حملہ بغیر خاقان منگوخان کی اجازت کے نہیں کیا جائے گا۔

دسے نے غرور تدبیر جس کے بارے میں وہ کئی دن سے سوچ رہا تھا آخر اس کے دماغ میں آگئی۔ اس نے گرجستانی دسے کے سردار کو اپنے خط میں طلب کیا اور دیر تک اس سے گفتگو کرتا رہا۔ اس گفتگو کے نتیجے میں پانچ گھنٹے تک قفقاز کی سرحد کی طرف روانہ ہو گئے۔

اور پھر کچھ دن بعد۔

ایک تاریک رات میں پانچ پانچ سو مغلوں کے دو سرحدی دسے جن کی رہائی مرلے سے ہونے لگ جاتی تھی کہ بہت سے، قفقاز کی حدود میں ایسے راستوں سے داخل ہوئے جہاں پر کوئی پہرہ یا چوکی نہ تھی۔ یہ راستے تنگ

ملکہ کے بالکل سامنے تھے۔

ملکہ روسودان اب بھی قبیلہ کی ایک ریختہ چٹان پر کھڑی اپنے جان نثاروں کے حوصلے بڑھا رہی تھی۔۔۔۔۔
شہزادی قمر داس کے پہلو میں تھی۔

ملکہ اور مغلوں کا درمیانی فاصلہ پانچ سو گز سے گھٹ کر تین سو گز رہ گیا۔

ملکہ روسودان نے بڑے استعجال سے قمر داسے کہا:

”شہزادی! اب کوئی امید نہیں۔ توجہ کی ترقی میں اتار کر چار مغلوں تک پہنچنے کی کوشش کرو۔“

شہزادی رونے لگی اور بولی:

”ماں! میں بھی تمہارے ساتھ جان دوں گی۔“

”نہ قہر نہ ضد نہ کر۔“ ملکہ نے کہا:

”ممکن ہے کہ قفقاز کو کبھی تیری ضرورت پڑ جائے۔“

ملکہ کے بہت گھٹانے اور اصرار کرنے پر شہزادی قمر داس نے جونی نشیب کا رخ کیا۔ ماں کو تنہا چھوڑنے کو

اس کا دل نہ چاہتا تھا لیکن ماں ہی نے اسے زندہ رہنے کی تلقین کی تھی۔ وہ پلٹ پلٹ کر ماں کو دیکھتی جاتی تھی لیکن

ملکہ روسودان کی نظریں ان مغلوں پر لگی تھیں جو اب اس سے صرف سو گز کے فاصلے پر تھے۔

جب یہ فاصلہ بھی سو گز کا صرف دس گز رہ گیا تو ملکہ روسودان نے مغلوں کو بڑے پرجہالانہ لہجے میں غائب کیا:

”مٹھو مٹھو درندو۔ ٹھہرو۔“

ملکہ کی آواز پر مغلوں کے بڑھتے ہوئے قدم ایک دم رک گئے۔

ملکہ نے کہا:

”اس بوٹھے بیٹھے سے جسے تم شہنشاہ کہتے ہو ملکہ روسودان کا یہ بیٹا! پہناؤ بیٹا کہ روسودان نے جس

دقت سے قفقاز پر حکومت کی تھی اسی دقت سے اس نے قفقاز پر اپنی جان نثار کر دی۔“

مغل حیرت سے روسودان کا منہ دیکھنے لگے۔

ملکہ نے اپنا دانا ہاتھ اٹھا یا اور بائیں ہاتھ سے سفید ریشم کا وہ دستار نہ کھینچا جو دائیں ہاتھ پر چڑھا ہوا تھا۔

مغلوں نے ملکہ کے ہاتھ کی درمیانی انگلی میں الماس کی ایک چمکتی انگلی دیکھی۔ ملکہ روسودان اپنا ہاتھ نہ ہٹا

لے گئی اور تیل اس کے کہ مغل سپاہی اسے دوڑ کر پکڑتے ملکہ دوبارہ انگوٹھی چاٹ چکی تھی۔

ملکہ کے پیر غرقہ ترانے میں چکرایا اور گرم گرم خون منہ سے باہر آنے لگا۔ وہ خود کو سنبھال نہ سکی۔ جھوم کر

چٹان سے نیچے گری اور اس کے سر نے بھی خون اگھاتا شروع کر دیا۔

اور دھواں گراڑا تھے لیکن سیدھے چوٹی کی طرف جاتے تھے۔

پھر گھٹنے کی چٹھائی کے بعد جبکہ صبح کی سفیدی نمودار ہو رہی تھی یہ ایک ہزار مغلوں میں ایک پہنچ گئے چار
ایک سنگی کوٹھڑی میں راڈو قید تھا۔

قید خانے کے گرد سخت پہرہ تھا لیکن ان کی کل تعداد چھ سات سو سے زیادہ نہ تھی۔ ان میں سے بھی کچھ

رہے تھے اور کچھ اگلے ہوئے اٹھ رہے تھے۔ مغلوں نے بڑی تیزی سے ان کے گرد گھیر ڈال دیا۔ جن کو جسد

سپاہیوں کے ہاتھ میں تواریں یا کمانیں تھیں انھوں نے سخت مقابلہ کیا اور جو نہ تھے وہ سب قتل ہو گئے۔ کچھ جان

کر بلند چوٹیوں کی طرف بھاگ گئے۔ اس کام میں مغلوں کو ایک گھنٹہ بھی نہ لگا اور انھوں نے داؤد کو قید سے چھڑا دیا۔

سویرا ہو گیا تھا اور مغل تیزی سے چڑھاٹی سے اتر رہے تھے۔ داؤد ان کے ساتھ تھا۔ ملکہ روسودان کو فر

ہوتے ہوئے اور گرجانی فوجیوں کے آتے آتے مغل، قفقاز کی حدود سے نکل چکے تھے۔ ملکہ روسودان کو داؤد کے

ہاتھ سے نکل جانے کا بڑا افسوس ہوا۔

شہزادی قمر داس کو جب اس حادثے کی خبر ہوئی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا اگر وہ داؤد

اسی دن قتل کر دیتی تو آج اسے ماں کے سامنے جلتے شرم نہ آتی۔

باتو خان نے داؤد کو چار توپانوں کے ہمراہ تبرا قزم، منگو خان کے پاس اس پیغام کے ساتھ روانہ کیا

کہ شہنشاہ مغرب باتو خان نے داؤد کو قفقاز کا بادشاہ تسلیم کر لیا ہے اور وہ سفارش کرتا ہے کہ دربار تبرا قزم

اس کی تصدیق کر دے۔

اس کے ساتھ ہی باتو خان کا تیس ہزار کاشک جس میں مغلوں کے علاوہ قباچی ترک بھی تھے اب ترک تار مار

جاتا ہے، شامل تھے قفقاز کی ملکہ روسودان کی سرکوبی کے لیے چل پڑا۔ اس لشکر نے قفقاز کی اس چوٹی کو جہاں

ملکہ روسودان کا محل تھا تین اطراف سے گھیر لیا۔

چوٹی کے دوسری طرف جنوب میں تبرا قزم کا سردار اپنے ایک ہزار سواروں کے ساتھ موجود تھا۔ اس جنگ

مغل دستے کے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

مغل، قفقاز کے پاکیزہ سبزہ زاروں کو روندتے، جہن اور دلکش وادیوں کو برباد کرتے اور چڑھتا ہوا

ہوئے۔ ہمارے جہتانیوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن انھوں نے بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ پہلے انھوں نے

بڑے بڑے پتھر اٹھ کر مغلوں کی بلغار روکنے کی کوشش کی لیکن جب مغل نے گئے اور ان کے قریب پہنچ

گئے تو گرجانی تواریں کے کران پر ٹوٹ پڑے۔

گرجانی کٹ کٹ کر گتے رہے لیکن انھوں نے ہتھیار نہ ڈالے۔ آئندہ مغلوں نے حفاظت حصار توڑ دیا۔

③ آوارہ شہزادی

خاتون ملگو خان کے بھرے دربار میں ایک غیر ملکی شہزادی کا ہاتھ پکڑ لینا بڑی ہمت کا کام تھا۔ یہ جرأت صرف ہلاکو خان ہی کر سکتا تھا۔ ہلاکو خان نے صرف ہی نہیں کیا بلکہ شہزادی کو اپنی مسند کے پاس لا کر بائیں طرف بٹھایا۔ دائیں جانب اس کی مغرور بیوی دو قوز بیٹھی تھی۔ اس وقت دو قوز پر کیا گزری اس کا بیان کرنا بھی مشکل ہے۔ عام مثل شہزادوں کی طرح ہلاکو خان کی بھی چار خاندانی بیویاں تھیں۔ داشت خاؤں کے معامے میں کسی پر کوئی پابندی نہ تھی لیکن ہلاکو کے محل میں دو قوز کا طوطی بولتا تھا۔ ہر چاند کی پٹی سے لے کر چودھوی کی رات تک ہلاکو کے شہستان کی دو قوز خاتون بلا شرکت غیر سے عزت بنا کرتی تھی۔ شہزادی تھمر داس کی رفیق اور سوگن بن کر سامنے آئی تھی۔ سوگنیں نو تین اور بیویاں بھی تھیں لیکن دو قوز خاتون ان سب پر جادری تھی۔ جیسے کی دو چار راتیں جو بھی نہیں میسر آتا ہیں وہ اسی کو غنیمت سمجھتی تھیں۔ رہی داشت خاؤں تو ان کے حتی پر تو وہ اکثر ڈاکو ڈال کرتی تھی۔

دو قوز، ہلاکو خان کی سوتیلی ماں تھی، لیکن اب اس کے مد مقابل جو عورت، جواڑی اور جو جوانی اکھڑی ہوئی تھی وہ دو قوز سے بات میں انصاف اور برتری تھی۔ وہ کوہ قاف کی پری تھی۔ قاف کا نام حسن سمٹ کر اس کے پیکر میں سا گیا تھا۔ تھمر کی آنکھوں میں وہ سحر تھا کہ وہ آنکھ اٹھاتی تو دنیا زیر و زبر ہو جاتی۔ آج خاتون کے دربار میں اس نے جس وقت اپنے چہرے سے سحر جھلکا مصنوعی نقاب مٹایا تھا تو چینی مدبّر یاو چاؤ کے جسم میں بھی تھر تھراہٹ پیدا ہو گئی تھی اور بہت کے سرخ پوش لالہؤں کے ہاتھ سے تسمییں چھوٹ کر زمین پر گر گئی تھیں۔ شہزادی کا رخ تابا زائد شمع اور توبہ شکن تھا۔

ملگو خان، جس کی سبزدگی کی مثل قسبیں کھلتے تھے وہ بھی شہزادی تھمر کو دیکھ کر یہ آرزو کرنے پر مجبور ہوا

ملکہ کی لاش باتو خان کے سامنے پیش کی گئی۔

شہنشاہ مغرب کا زرد چہرہ رو سودان کی لاش دیکھ کر سیاہ پڑ گیا۔ مکہ کے زخمی چہرے پر اس وقت بھی ایک ملکوتی صحن تھا۔

باتو خان نے حکم دیا کہ کیفی کی قبر کے برابر ایک قبر کھود کر وہ سودان کو دفن کیا جائے اور اس پر زرد سودا ملکہ جسٹن کی تختی آویزاں کی جائے۔

تین ماہ بعد جب ملگو خان کو قراقرم میں مکہ رو سودان کی خودکشی کی خبر ملی تو اس نے داؤد کو اسی وقت لکرا دیا۔ قفقاز کا میر جعفر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

ملگو خان نے اس کی بیٹی کو بہت تلاش کرایا کہ اسے قفقاز کے تخت پر بٹھایا جائے لیکن شہزادی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس نے بھی ایک چوٹی سے پھلاٹک لگا کر خودکشی کر لی۔

تھا کہ کاش ہلاکو خاں نے شہزادی کا ہاتھ نہ بکڑا ہوتا، تاکہ وہ اسے اپنی بیوی بناتا۔ اس کی چوتھی بیوی مر چکی تھی اس کی بگڑ خالی تھی لیکن اسے اپنے دل میں اٹھتے ہوئے طوفان کو دبانا پڑا۔ اسے ہلاکو کی دل شکنی منظر پر نہ لگی۔



وں گی۔

ہلاکو نے ہنس کر کہا:

"میرا کیا نقصان ہو گا۔ تو اپنی جان سے جدے گی۔ ہلاکو کا نشہ اتر چکا تھا۔

"تو غلط سمجھ رہا ہے شہزادے۔" تو خود نے خنجر کو مشعل کی روشنی میں چمکاتے ہوئے کہا:

"اگر یہ خنجر میرے سینے میں اتر گیا تو میرے کئی ہزار سپاہی، قلعہ الموت کی بھول بھلیوں میں جھٹک بھٹک

ہلاکو خاں نے دو سو سے پچیس کا کردہ دروازے سے نکرائی اور چپک کر دوسری ہو گئی۔ ہلاکو کے بدن میں ایک

ہلاکو خاں نے دو سو سے پچیس کا کردہ دروازے سے نکرائی اور چپک کر دوسری ہو گئی۔ ہلاکو کے بدن میں ایک

میں کچھ وزن ضرور ہے۔

ہلاکو نے اپنی الجھن دور کرنے کے لیے کہا:

"آج تو یہ خنجر رکھ لے اور اطمینان سے بیٹھ کر بت کر۔ میں اپنی رنگین رات کے کیف میں انسان خون کی مرچی

شامل نہیں کرنا چاہتا؟

شہزادی بولی:

"مجھے مصل شہزادے کی بات کا اعتبار ہے۔ اب مجھے اس خنجر کی ضرورت نہیں۔ یہ کہہ کر شہزادی نے خنجر ہلاکو کے

پیروں میں چھینک دیا۔

ہلاکو خاں نے شہزادی کو حیرت سے دیکھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ آج اس کا سالانہ ایک عجیب و غریب لڑکی

سے پڑا ہے۔

دونوں سکریں ہو کر بیٹھ گئے تو ہلاکو نے کہا:

"ہاں اب بتا۔ تو کی جاسیتی ہے؟"

شہزادے جس طرح تیری یہ خواہش ہے۔ شہزادی بولی:

"یعنی تو چاہتا ہے کہ میں تیری خواہش پوری کر دوں۔"

"ہاں۔ اے گئے کہ۔ ہلاکو بات کو مختصر کرنا چاہتا تھا۔

"تجھے میری ایک خواہش پوری کر ہوگی۔" شہزادی نے کہا۔

خشب رات بھینگتی جا رہی تھی۔

شہزادی تھوڑے قالمیں کے فرش پر مخملی گاؤں کیوں کے سہارے عجب ٹمکتی اور انداز دل زار بائی سے نیم دراز

اس کے سامنے ہلاکو خاں دوڑاؤ بیٹھا سفید گھوڑی کے دودھ کی دوسری بالٹی حلی میں اتر لیں رہا تھا۔ شہزادی پور

لاپرواہو کر اسے دیکھ رہی تھی جیسے چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں کے بچے شہزادی کا کوئی غلام بیٹھا ہے۔

ہلاکو خاں نے دوسری بالٹی خالی کر دی۔ ہوس اور وحشت کے سائے اس کی آنکھوں میں لرزنے لگے۔ اس کو مر جائیں گے اور تو خانا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا۔

سورنے کی بالٹی کو اس زور سے پھینکا کہ وہ دروازے سے ٹکرائی اور چپک کر دوسری ہو گئی۔ ہلاکو کے بدن میں ایک

جاگ اٹھا۔ اس نے اپنا ہاتھ شہزادی کی طرف بڑھایا۔ ہلاکو کا ہاتھ بالوں کی کثرت کی وجہ سے سیاہ ہوتا تھا۔

شہزادی نے بڑی حیرت سے ہلاکو کے کردہ ہاتھ کو جھٹک دیا۔

ہلاکو خاں کی تیوریاں پڑھ گئیں۔ اس کے لیے عورت کی تلخ روی کا یہ پسند بخیرہ تھا۔ وہ سوچ رہی تھی

سکتا تھا کہ کوئی عورت ہلاکو خاں کو ٹھکرا بھی سکتی ہے۔ نشے میں خود بخود کی آگئی۔

ہلاکو خاں نے قہر کو د نظر دوسرے شہزادی کو دیکھا۔ شہزادی اپنی جگہ کھڑی ہو گئی۔ ایک چھوٹا سا خنجر اس

ہاتھ میں چپک رہا تھا۔

ہلاکو خاں نے ایک بھیانک ہنسنہ لگایا اور بولا:

"اس کھلنے سے تو ہلاکو خاں کو ڈرانا چاہتی ہے؟"

"یہ خنجر تیرے لیے نہیں بلکہ میرے سینے میں اترنے کے لیے ہے۔" شہزادی نے اطمینان سے جواب دیا۔

ہلاکو کا نشہ اور کم ہو گیا۔ شہزادی کی بات اس کی نگاہ میں بالکل نہ آئی۔

"تو کیا کہہ رہی ہے؟" ہلاکو نے پوچھا:

"تیرا مطلب کیا ہے؟"

"میں تجھے پسند کرتی ہوں مصل شہزادے۔" شہزادی بولی:

"یونکہ تو بہادر ہے۔ تو نے دربار میں ایک سچی بات کہہ کر اپنی بہادری کا ثبوت پیش کیا تھا؟"

”تو پھر کبھی کیوں نہیں میں تیری ایک نہیں ہزار خواہشیں پوری کر سکتا ہوں۔“
”چاہے تجھے اس کے لیے خاقان کی ناراضگی مولیٰ بھی پڑے۔“

ہلاکو خاں چونکا۔ اس نے کہا:

”شہزادی: بات سنا سنات کہہ۔“

”شہزادے۔ میں چاہتی ہوں۔“ قہر دے کر کہا:

”میں چاہتی ہوں کہ جس طرح میرے وطن قفقاز کو لوٹا گیا۔ اسی طرح باتو خاں کی مراثیے باتو کو تہہ کیا جائے اور خاتم باتو خاں کا سر میرے قدموں میں ہو۔“ شہزادی کے لیے میں جوش و غلبہ پیدا ہو گیا۔

ہلاکو خاں کھدیر سوچا رہا۔ پھر بولا:

”اچھا ہوا کہ یہ بات تو نے کسی اور سے نہیں کہی ورنہ تیرے لیے مصیبت ہو جاتی۔ تجھے شاید یہ معلوم نہ تھا کہ کوئی خاص بات ضرور ہوئی ہے ورنہ ہلاکو اتنی اہم بزم عشرت کو چھوڑ کر ہرگز نہ جاتا۔ شہزادی تیکے پر سر رکھ کر لیٹ پورا خانوادہ چنگیزی، باتو خاں کو پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ باتو خاں کا باپ جو جی خاں ہمارے دادا تو جین چنگیز خاں کی ہانگنی۔ بڑی دیر تک اس نے ہلاکو خاں کا انکار کیا لیکن وہ نہ لوٹا۔ اولاد تھا۔ باتو خاں والی بات تو اپنے دل میں رکھ رہی تیری خواہش ضرور پوری کروں گا۔“

”کب پوری کرے گا تو؟ تیرا خاقان تجھے اجازت نہ دے گا۔“ شہزادی نے پوچھا۔

”پہلے میں شیخ: اجل کا خاتمہ کروں گا۔ ہلاکو نے بتایا:

”پھر بعد ازاں چڑھائی کروں گا۔ وہاں سے فارغ ہو کر باتو خاں کی خبر لوں گا۔“

شہزادی نے پوچھا:

”لیکن تو بغداد پر کیوں چڑھائی کرے گا؟ وہاں کا خلیفہ تو مسلمان ہے۔ اس نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔“

”یہ دو قوز کی خواہش ہے۔“ ہلاکو خاں نے کہا:

”دو قوز نے عیسائی مذہب اختیار کیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مسلمان ہر جگہ عیسائیوں سے لڑتے رہتے ہیں اس لیے مسلمانوں کو دنیا سے ختم کر دینا چاہیے۔“

ہلاکو خاں نے شہزادی کے کانڈھوں پر اپنے بھاری ہاتھ رکھ دیے۔ شہزادی کو ہلاکو کے مکر و مضبہ ہاتھ لیس بڑا اچھا لگا۔ اس کی زندگی میں اس سے پہلے بھی کئی مرد آپکے تھے۔ اس کا چچا زاد بھائی داؤد، جس نے کی ماں کے خلاف بغاوت کی تھی۔ شہزادی اس کی جہت تانی شہزادے کو پسند کرتی تھی۔ اس نے شہزادے داؤد کے مستقل طور پر شادی کرنے کا ارادہ بھی کیا تھا لیکن داؤد دیکھ نہ لگا۔ اس نے شہزادی کی ماں کے خلاف بغاوت کی اس کا دل توڑ دیا۔ پھر اس نے قلعہ الموت کے شیخ: اجل کے رفیق شہزادے سے دوستی کی۔ شہزادہ کو وہ صدمہ پہنچا کرتی رہی۔ وہ اسے دل نہ دے سکی۔ دراصل اس کے شہزادے سے تعلقات یک طرفہ اور ناجائز قسم کے تھے۔

ہلاکو نے اس کے کانڈھوں پر ہلکا سا جھٹکا دیا اور شہزادی پھول کی طرح اس کی آغوش میں گر گئی۔ ہلاکو خاں کے ہاتھ شہزادی کی طرف بڑے لیکن پھر اس کی خواب گاہ کے باہر خطرناک ساز بجنے کی آواز پیدا ہوئی۔ یہ ساز ایک قسم کا قرنہ یا سٹیکو تھا۔ یہ اس وقت بجایا جاتا تھا جب کوئی اہم بات یا خطرہ ہو۔ قرنہ، ہلاکو خاں کے محافظ پریدار نے بجایا تھا۔

ہلاکو خاں، شہزادی کو ایک طرف دھکیں کر بڑی پھرتی سے کھڑا ہوا۔ دیوار سے لٹکی ہوئی تلوار کو اتارا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

شہزادی قہر کی کچھ میں نہ آیا کہ یہ سب کیا ہے لیکن ہلاکو کی گھبراہٹ سے اس نے یہ اندازہ ضرور کیا کہ شہزادی قہر کی کچھ میں نہ آیا کہ یہ سب کیا ہے بزم عشرت کو چھوڑ کر ہرگز نہ جاتا۔ شہزادی تیکے پر سر رکھ کر لیٹ پورا خانوادہ چنگیزی، باتو خاں کو پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ باتو خاں کا باپ جو جی خاں ہمارے دادا تو جین چنگیز خاں کی ہانگنی۔ بڑی دیر تک اس نے ہلاکو خاں کا انکار کیا لیکن وہ نہ لوٹا۔ اولاد تھا۔ باتو خاں والی بات تو اپنے دل میں رکھ رہی تیری خواہش ضرور پوری کروں گا۔“

شہزادی کی آنکھیں بند سے بوجھل ہو گئیں۔ انکار کی ٹھکنے سے اسے صدمہ کر دیا۔ پھر اسی عالم میں نہ جانے کب اس کی آنکھ مل گئی۔



خاقان منگو خاں کی خواب گاہ کے باہر ہلاکو خاں کی بیوی دو قوز نے اودھم مچا رکھا تھا۔ شہزادی دو قوز کے شور و غل سے منگو خاں جاگ پڑا۔ رات کا سناٹا۔ دو قوز کی چیخ و پکار دور دور تک جا رہی تھی۔ تمام بیگمات اور شہزادیاں جاگ پڑی تھیں مگر دو قوز بڑی معزور عورت تھی۔ اس کی کسی سے نہ ملتی تھی۔ قبلائی خاں کی بیوی جاموئی خاتون سے اس کا سخت برہنہ تھا۔ وہ دونوں خوبصورت تھیں لیکن خود کو دوسرے کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت اور حسین سمجھتی اور کبھی تھیں۔ جھڑپ کی میاد سب سنی ہی بات تھی۔

خاقان منگو خاں آنکھیں ملے ہوا اپنی خواب گاہ سے باہر آ گیا۔ شہزادی دو قوز بال کھولے اپنا منہ پیٹ رہی تھی۔ اور اس طرح چیخ رہی تھی جیسے کسی کام تم کر رہی ہو۔

منگو خاں نے کہا:

”کیا ہوا شہزادی؟“ پھر پھر کا افتاد پڑی۔ ”کیوں آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے؟“
”وہ حرامزادی میرے بستر میں گھسی ہوئی ہے۔“ دو قوز نے چیخ کر کہا:
”خاقان میرا انصاف کر۔ میں ہلاکو کو اس کے بستر میں نہیں جانے دوں گی۔“

دوقوز نے ایک ہی جملے میں پورا نصف بیان کر دیا تھا۔ منگو خاں سوچ میں پڑ گیا۔
"تو میرا انصاف کیوں نہیں کرتا؟" دوقوز اسے خاموش دیکھ کر چلائی۔

"تو کیسا خائف ہے۔ ایک غیر ملکی لڑکی نعل شہزادی پر حکومت کرے۔ کیا تو یہ دیکھ سکتا ہے؟"
"آج کی رات باری کس کی ہے؟" منگو خاں نے منہ کھولا۔ اسے فوری فیصلے کی یہی صورت نظر آئی۔

منگو خاں نے خواتین کے آپس میں لڑنے جھگڑنے کو ختم کرنے کے لیے شہزادوں کی بیگمات اور دربار
باقاعدہ ریکارڈ مرتب کر لیا تھا۔ اس ریکارڈ میں ہر شہزادی کی اپنے شوہر کے ساتھ رات گزارنے کی بارگاہ
اندراج تھا۔ رات کی ان بارگاہوں کی تصدیق ان کے شوہروں سے بھی کر لی گئی تھی۔ منگو خاں نے زمان جاری کر دیا
کوئی شہزادہ اپنی باری میں گڑبڑ نہ کرے کیونکہ منگو خاں شہزادوں کی حق تلفی منظور نہ تھی۔ شہزادے اور ان کی
جب تک فراہم میں رہتے انہیں اس زمان کی پابندی کرنا پڑتی۔

"غضب تو یہ ہے کہ باری بھی میری ہے۔" شہزادی دوقوز یمن کے انداز میں بولی۔

"اس کھوتی کو دوسرے کے شوہر کے پاس لے کر ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ اس کی صورت پر بدرجوں کی ہل

پڑے۔"

منگو خاں نے کہا:

"شہزادی پھر سوچ لے۔ اگر کھاتے میں تیری باری درج نہ ہوئی تو آئندہ ایک سال تک تیری تمام بارگاہ ختم
جائیں گی۔"

مجھے منظور ہے۔" دوقوز اڑ گئی؛

کھاتہ منگا کر دیکھا جائے۔"

دوقوز میری بات مان تو اس جھگڑے کو ہمیں ختم کر دے۔" منگو خاں نے ماحمانہ انداز اختیار کیا:

"فیصلہ تو ابھی ہوجائے گا لیکن اگر ہاگو خاں کے دل سے ایک بار اتار گئی تو پھر تیرا خاتان کچھ نہ کر سکے گا۔"

شہزادی جوش اور غصے میں بھری ہوئی تھی۔ اس نے کہا:

"مجھے اس کی پروا نہیں لیکن انسان ہونا چاہیے۔"

"پھر سوچ لے شہزادی۔" خاتان نے مسالحتی کی آخری کوشش کی۔

شہزادی دوقوز کچھ ڈر گئی اور نرم ہو کر بولی:

"اگر خاتان کا یہ حکم ہے تو میں اپنا مقدمہ واپس لیتی ہوں۔"

"دوقوز۔" منگو خاں نے کہا:

"میں دنیا کا خاتان ہوں۔ ہر ایک کو حکم دے سکتا ہوں لیکن میں شہزادوں کی بھی زندگی میں دخل اندازی
کرنے کے لیے تیار نہیں۔"

باریوں کا حساب رکھنے والا کھاتے دار بوڑھا چینی، کھاتہ بغل میں دبائے آ گیا۔ اسے ہاگو خاں کو جانے
کا حکم خاتان پہلے ہی دے چکا تھا۔

"آج چاند کی کوئسی تاریخ ہے؟" منگو خاں نے اس سے پوچھا۔

"گیارہ۔" کھاتے دار کے جھٹکے جواب دوقوز نے دیا۔

"تو خاموش رہ شہزادی۔" منگو خاں نے اسے آہستہ سے مرنے کی۔

جب کھاتے دار چینی نے شہزادی دوقوز کی بات کی تصدیق کر دی تو منگو خاں نے اس سے کہا:

"شہزادے ہاگو خاں کے کھاتے میں دیکھو یہ رات اس نے کس کو دی ہے؟"

"خان سے آنے والی ایک نئی لڑکی کو خاتان اعظم۔" چینی کھاتے دار نے سر جھکا کر کہا۔

خاتان منگو خاں اور شہزادی دوقوز اس جواب سے بڑے حیران ہوئے۔

شہزادی دوقوز چیخ کر بولی:

"نہیں خاتان! یہ انہیں کیا سکتا ہے میری باری وہ کسی دوسری لڑکی کو کیسے دے سکتا ہے؟"

"وہ بہت خوبصورت لڑکی ہے۔" منگو خاں نے کہا:

"اگر اس کے لیے ہاگو خاں نے تیری باری بدل دی تو تجھے صبر کرنا چاہیے۔ اس کی جگہ اگر تیرا خاتان ہوتا تو وہ

بھی یہی کرتا۔"

دوقوز نے خاتان کو حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

"خاتان۔ کیا وہ لڑکی مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے؟"

"ہاں دوقوز۔" منگو خاں بولا:

"وہ تمام نعل شہزادیوں سے زیادہ حسین اور جاذبِ نظر ہے۔ میری بیوی قنوق تائی سے بھی زیادہ۔"

"تو پھر..... شہزادی نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا:

"ایسی خوبصورت اور جاذبِ نظر لڑکی کو تو خاتان کی خواب گاہ کی زینت بننا چاہیے۔"

خاتان منگو خاں کو یوں لگا جیسے دوقوز نے اس کے دل کی بات کہہ دی ہو لیکن فوراً ہی اسے اپنی خاتانی کا خیال

آیا۔ اس نے بات جلتے ہوئے کہا:

"ہم محل، عورتوں کے لیے آپس میں نہیں لڑا کرتے۔ جو چیز جس نے پہلے پسند کر لی وہ اس کی ہو گئی۔ اب

وہ ہلاکو خان کہہ رہے اور اس وقت تک رہے کہ جب تک وہ خود اسے نہیں چھوڑتا۔
شہزادی دو قوز پڑنے مردہ ہو گئی۔

خانان منگو خان اور دو قوز نے ہلاکو خان کو آتے دیکھا تو دونوں خاموش ہو گئے۔ ہلاکو خان اس تیز آواز کا تھا جیسے وہ بھاگ رہا ہو۔ اس کا سامں چھوٹا ہوا تھا لیکن جب اس کی نظر دو قوز پر پڑی تو آہستہ بہ آہستہ وہ فوراً معاملے کی نہ تک پہنچ گیا۔

”تو اس وقت خانان کو پریشان کرنے کیوں آئی؟ ہلاکو خان نے بجائے خانان سے بات کرنے کے سے سوال کیا۔

دو قوز جو ذرا دیر پہلے اتنا غلغلہ مچا رہی تھی اس وقت سہمی اور دبی ہوئی کھڑی تھی۔

”ہلاکو خان۔ یہ تیری زیادتی ہے۔ منگو خان مسکراتے ہوئے بولا:

”شہزادی دو قوز کے ساتھ تو نے اچھا نہیں کیا۔ آج یہ مغل شہزادی ہے اس کا مقابلہ کوئی دوسری کر سکتی ہے۔“

ہلاکو خان بات نہ سمجھ رہی تھی کہ منگو خان کی مسکراہٹ اور گفتگو نے پوری کر دی۔

”میں کیا کروں خانان؟ ہلاکو نے مختصر انداز میں کہا:

”شہزادی دو قوز تو ایک رات بھی جیٹ سے نہیں سوتی۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ تو کسی اور کو سو جا۔ اب اس میں میرا کیا قصور؟“

شہزادی دو قوز نے منگو خان سے شکایت کرنے کے انداز میں کہا:

”خانان! کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ یہاں چٹیل کو میرے کمرے میں لے آیا۔ وہ میرے بستر پر لیٹی ہوگی۔“

”شہزادی دو قوز۔ یہ منت ہو کہ وہ بھی ایک ملک کی شہزادی ہے۔ خوبصورت اور حسین شہزادی۔“

نے طنز کیا۔

”دیکھو خانان! یہ میرے سامنے اس کی تعریف کر رہے۔“ شہزادی دو قوز نے پھر شکایت کی۔

”جو تعریف کے قابل ہوتا ہے اس کی تعریف کی ہی جاتی ہے۔“ ہلاکو نے کہا:

”تم خانان سے پوچھو۔ یہ بھی اس کی تعریف کریں گے۔“

خانان منگو خان گھبرا گیا۔ اس نے کہا:

”بھئی یہ تم دونوں کا جھگڑا ہے۔ آپس ہی میں طے کو تو اچھا ہے۔“

حالانکہ شہزادی قہر کے دُکھ پر خود اس کے دل میں بھی گدگد پیدا ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ شہزادی دوا

نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا کہ ایسی خوبصورت اور جاذبِ نظر لڑکی تو خانان کی خواب گاہ کی زینت بننا چاہیے لیکن اب تو وہ پری ہلاکو خان کے قبضے میں تھی اور اس کے تنجے سے نکانا مشکل ہی نہیں نامکن تھا۔ ہلاکو خان کی خود مری اور رضی طبیعت پر اسے پیگنری خانان میں مشہور تھی۔

ہلاکو خان، شہزادی دو قوز کے قریب گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ شہزادی رو رہی ہے۔ ہلاکو خان کا سخت دل بھی شاید سلج گیا۔ اس نے کہا:

”دو قوز! مغل عورتیں رو یا نہیں کرتیں۔ تو اگر یہ چاہتی ہے کہ میں شہزادی کو چھوڑ دوں تو یہ ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ کہی میں پورا کروں گا۔“

دو قوز بڑی چالاک تھی۔ اس نے جھٹ آنسو پونچھ ڈالے اور بولی:

”تو خانان کے سامنے وعدہ کر رہے ہے۔“

”ہاں۔ میں وعدہ کرتا ہوں لیکن تو شہزادی کے چھوڑنے کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔“ ہلاکو نے وعدہ کر لیا۔

”میں کب کہتی ہوں کہ تو اسے چھوڑ دے۔“ دو قوز بولی:

”میری طرف سے تو سو اور دانتا میں رکھ لے۔ میرا کیا بدلہ ہے؟“

”پھر وادے کیوں چار کھائے؟“ ہلاکو نے کہا:

”میری شکایت لے کے خانان کے پاس کیوں آئی ہے؟“

”دیکھ ہلاکو تو نے خانان کے سامنے وعدہ کیا ہے۔“ دو قوز نے اسے پکاکہتے ہوئے کہا:

”میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ میری جو چار راتیں باقی ہیں وہ تو مجھے دے دے۔ اس کے بعد جو چاہے کرے۔“

یہ کرتا پھر۔

ہلاکو خان دھک سے رہ گیا۔ اسے خیال تھا کہ دو قوز آئندہ کے لیے کوئی شرط لگائے گی۔ اپنے مرتبے اور وقار کی بات کرے گی لیکن دو قوز تو اس پر چار راتوں کی پابندی لگا رہی تھی جس میں آج کی رات بھی شامل تھی۔ شہزادی غم و کدھ کی قدرِ رضا مند کر چکا تھا۔ اگر اس کے پاس واپس نہ گیا تو پتہ نہیں وہ کیا خیال کرے۔

ہلاکو خان نے چالاک سے کام لیا۔ اس نے خوشامدانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا:

”مجھ تک ہے تو جو کہتی ہے ایسا ہی ہو گا۔ میں چار کے بجائے پانچ راتیں تیرے ساتھ بسر کروں گا لیکن آج کی رات تو مجھے چھوڑ دے۔“

دو قوز بگڑ گئی۔ اس نے کہا:

”ہلاکو تو اپنے وعدے سے نہ پھر۔“

پھر وہ خاقان سے مخاطب ہو کر بولی:

"یہ دیکھ لے خاقان۔ اس نے تمہارے سامنے وعدہ کیا ہے اب یہ وعدہ خلافی کیسے کر سکتا ہے۔ تم حکم دو خاقان!"

خاقان منگو خاں بھی سیاحت کرتا تھا کہ شہزادی تھوڑے دن بھی ہو سکے، ہلاکو خاں سے بیچ جائے سامہ اس کا موقع تھا پس خاقان نے دو قوز کی طرف داری کی۔

خاقان منگو خاں نے کہا:

"ہلاکو خاں۔ تو دو قوز کو زبان دے چکے ہو۔ مغل شہزادے اپنی زبان سے نہیں پھرا کرتے۔ تجھے یہ راتیں شہزادی دو قوز کی نذر کرنی پڑیں گی۔"

خاقان منگو خاں کا یہ حکم اور فیصلہ تھا لیکن اس کے لیے اس نے زم بھر استعمال کیا۔ شہزادی دو قوز فیصلے سے بہت خوش ہوئی۔ ہلاکو خاں سوچ میں پڑ گیا۔

منگو خاں نے بات غلطی سے ہوئے دو قوز سے کہا:

"شہزادی تم ہلاکو خاں کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ہم نے حکم دے دیا ہے۔ منگو خاں یہ کہتے ہوئے اپنی میں چلا گیا۔

شہزادی دو قوز نے ہلاکو خاں کا ہاتھ پکڑا۔ اسے گھسیٹتی ہوئی لے چلی۔ ہلاکو کے پیروں میں بھر کے ہوئے تھے۔ شہزادی تھوڑا پیکر اس کے تصور میں گھوم رہا تھا۔ اسے بڑا غصہ آ رہا تھا لیکن خاقان کا حکم بھی نہیں جاسکتا تھا۔

شہزادی تھوڑے دو قوز کی خواب گاہ میں بے خبر سو رہی تھی۔ دو قوز ہلاکو کو واپس لے کر پہنچی اور اس سے کہا:

"اس کو یہاں سے نکال۔ میں یہیں لیٹوں گی۔"

"اس کو مت جگانا۔ ہلاکو نے دو قوز کو خواب گاہ میں جانے سے روکتے ہوئے کہا:

"یہ جاگ اٹھی تو ایک نیا فتنہ کھڑا ہو جائے گا۔ اور خاقان کو ایک بار پھر فیصلے کے لیے آنا ہو گا۔ یہ شہزادہ سے زیادہ تیز اور نٹ کھٹ ہے۔"

دو قوز نے برا ماٹہ بنایا۔

ہلاکو نے جھانک کر اندر دیکھا۔ شہزادی تھوڑے دالین پر بے مدد پڑی تھی۔ اس نے دو قوز کا ایک منہ زیر جامہ پہن رکھا تھا جسے کھلے پانچے کا پاجامہ کہا جاسکتا ہے اور پڑھیلی سی چولی یا جاکٹ تھی۔ دو قوز ڈھیر کچی تھی اور تھوڑا کمرے جسم کی۔ چولی اس کے سینے پر ڈھیلے کوٹ کی طرح پڑی تھی۔ چولی کسے والی ریشمی ڈوربات

ادھ کھلی تھیں اور ڈور یوں میں تھوڑا کا ایک ہاتھ الجھا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دو ریاں باندھتے باندھتے سو گئی تھی۔

اس منظر سے ہلاکو خاں کے بدن میں جیونیاں سی ریگنے لگیں۔ دو قوز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کھینچا۔

"کیا دیکھ رہے ہو اتنے غور سے؟" دو قوز نے پکڑ کر کہا:

"یہ یوں کا ناچ ہو رہا ہے کیا انداز؟"

ہلاکو خاں نے سفید سفید دانت نکال دیے اور دو قوز کو لیے ہوئے دوسرے کمرے میں چلا گیا

رات کے کسی حصے میں شہزادی تھوڑی آنکھ کھلی گئی۔ وہ متعجب تھی کہ ہلاکو نے اسے نظر انداز کیسے کر دیا۔

وہ اٹھ اٹھ کر اٹھی۔ پہلے کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر دروازے کی طرف بڑھی۔ کوٹ نہا چولی سے اسے الجھن ہو رہی تھی۔ اس نے چولی اتار کر تودر پھینکی اور کھڑکی پر پڑے ہوئے ایک پھولدار پردے کو کھینچ کر اس کی چادر بنا کر شانوں پر ڈال لی۔ چادر اس پر کھل گئی۔ شہزادی کا سن اور نکھر آیا۔ اس چادر میں اس کا چہرہ یوں نظر آ رہا تھا جیسے گلاستے کے بیچ میں گلاب لگا ہو۔

شہزادی آہستہ آہستہ باہر آئی۔ باہر نیم تاریکی تھی۔ مشعلیں دور دور چل رہی تھیں۔ اسے ایک کمرے میں تیز روشنی نظر آئی۔ دور دور مضافات خاتین میر سے لیے پہرہ دے رہی تھیں۔

شہزادی تھوڑے جھلکاتے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ رات بڑی پُر کیف تھی۔ غائب سویرا ہونے والا تھا۔ روشنی کی ایک باریک اور دھندلی کیر مشرق میں سر اٹھاتی دکھائی دے رہی تھی۔ شہزادی تھوڑے دروازے پر پہنچ کر لکی۔ کروں کے تمام دروازے بے در کے تھے۔ جن پر ریشمی پردے ڈالے چایا کرتے تھے۔ یہ پردے بھی کم ہی دروازوں پر ہوتے۔ انہیں کس کی پردا اور کس کی شرم تھی۔ ادھر نہ کوئی آہٹ تھا اور نہ کسی میں آنے کی ہمت تھی۔ پردہ ہٹا ہوا تھا۔ شہزادی نے جھانک کر دیکھا۔ پھر جلدی سے گردن کھینچی۔ اسے نفرت سی ہونے لگی۔

شہزادی تھوڑے معلوم ہو چکا تھا کہ دو قوز، ہلاکو خاں کی بیوی بننے سے پہلے اس کی سوتیلی ماں رہ چکی ہے۔ اسے یوں عسوس ہوا جیسے دو قوز خاقان آج بھی ہلاکو خاں کی ماں ہے۔ شہزادی تھوڑے قدموں اپنے کمرے کی طرف پٹی۔

(

قتلائی خاں اپنے درویش چینی مدد بڑا ڈچاؤ کے ساتھ چین کی سنگ شناسایت کے خانے کے لیے جنوب کو روانہ ہو چکا تھا اب ہلاکو خاں کی رواجی کے انتظامات ہو رہے تھے۔

متمدن دنیا کے خلاف اس حملے کی تجویز خود منگو خاں نے پیش کی۔ وہ اپنے دادا چنگیز خاں کی اس آرڈر کی تکمیل کرنا چاہتا تھا کہ اسلامی عسکری طاقت کے آخری قلعہ مصر کو تسخیر کر دے۔ قاضی شمس الدین قزوینی نے مغول کو اپنے علاقے پر حملے کی دعوت دے کر منگو خاں کو ایک بہانہ مہیا کر دیا۔ قزوینی نے غالباً اس مغولے کی پیروی کی تھی کہ صہناپ کو دشمن کی لاشوں سے مار دے۔ لیکن مغولے اور کہاوتیں ہی اگر سچ ہوئے لیکن تو خدا پر ایمان رکھ لائے۔

کہتے ہیں کہ منگو خاں نے چار لشکر تیار کرائے۔

ایک جتائی خاں کو دے کر جنوب میں روانہ کیا۔

دوسرا لشکر کو ریا کو روانہ کیا۔

تیسرے ہزاروں نے شمالی ہند کے پہاڑوں سے نکل کر لاہور کا رخ کیا۔ مگر جب تاجدار ہند نصیر الدین بن التمش ان کے مقابلے پر پہنچا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

چوتھا لشکر ہلاکو خاں کو دیا گیا۔ ہلاکو کا لشکر چنگیز خاں اور سو بو دانی کے لشکروں سے بھی زیادہ بڑا اور کھلے کانٹے سے پوری طرح لیس تھا۔

شکو کی روانگی کا منظر دیکھنے، تمام بلگت، شہزادے اور شہزادیاں میدان میں جمع تھیں جہاں منگو خاں بڑے خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کی گردن زور سے اٹھی ہوئی تھی۔ ہلاکو خاں کی چستی بیوی و دوزخ خاتون اپنے زور نگار اور مع چکر پر بڑی شان سے بیٹھی تھی۔

ہلاکو خاں گھوڑا چمکا تا ہوا فوجوں کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا اور شہزادی قمر دیکھتے ہی ہنسنے لگے۔ ہلاکو خاں کے قریب کھڑی تھی۔

منگو خاں کے لیے آج بڑی سخت جس پر مرنے کا موٹا پتہ چڑھا تھا اور جس سسے پاؤں پر سچے موتیوں کی جلاؤں آویزاں تھیں، میدان کے بیچ میں پچایا گیا تھا۔ شہزادی و دوزخ کا چکر اٹھانے کے لیے ہاتھ کی طرف تھا اور شہزادی قمر خاتون کی سیدھی طرف تھی۔

اس منظر کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی تھا کہ شہزادی و دوزخ کو اپنے ساتھ سنسوری عیسائیوں کے مبلوٹی چیل کوئے جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ و دوزخ عیسائی ہو چکی تھی اور اس نے خاتون سے درخواست کی تھی کہ اسے اپنے مذہبی فراموشی ادا کرنے کے لیے عبادت کا پورا سامان ایک چھکڑے پر لے جانے کی اجازت دی جائے۔ یہ چھکڑا ایک چلتا چھین کر چل رہا تھا جس میں عبادت کے وقت لکڑی کے بلجے بجائے جاتے تھے۔

اس مہم کا یہ سالہ خاص قسط ہو گیا تھا۔ وہ بھی عیسائی تھا۔ ہلاکو خاں کی ماں سیور قزاقی بھی سنسوری عیسائی تھی۔

اس طرح عالم اسلام کے خلاف یہ دوسری یلغار صرف مغولوں کی نہیں بلکہ مغلوں اور عیسائیوں کی مشترکہ قوت عالم اسلام کی تباہی کے درپے تھی۔

شہزادی و دوزخ بڑی سخت سے شہزادی قمر کو دنگورہی تھی لیکن قمر کے چہرے پر نفرت کے بجائے مسکراہٹ تھی۔ منگو خاں نے ہلاکو کو اپنے پاس بلا کر کہا:

”شہزادی و دوزخ، بڑی عقلمند ہے۔ تو اس کے مشورے پر غور کیا کرنا؟“

ہلاکو ہنسا اور بولا:

”عقلمند تو ایک اور بھی میرے ساتھ ہے اگر میں ان دونوں کے مشوروں پر عمل کرتا رہا تو بغداد فتح ہو چکا۔“

بغداد کے نام پر منگو خاں کو تعجب ہوا۔ اس نے کہا:

”ہلاکو! ہم نے تجھے ابھی بغداد کی فتح کا حکم نہیں دیا۔ ہم تجھے شاہ ایران بنا کر بھیج رہے ہیں۔ جب قلعہ الموت سے نکلے تو ہمارے دوسرے حکم کا انتظار کرنا!“

بغداد کا نام نہتہ نہیں ہلاکو کی زبان سے کسی طرح نکل گیا۔ دراصل و دوزخ خاتون نے مسلمانوں کے خلاف اسے اس قدر برہنہ کر دیا تھا کہ یہ یلغار اب قلعہ الموت یا ایران کے بجائے بغداد کے خلاف بن گئی تھی۔ شہزادی و دوزخ بغداد کا نام اس کو خوش ہو گئی تھی۔

منگو خاں نے ہلاکو کو دوسری نصیحت کی:

”نور دیکھ۔ مغرب (یورپ) کا رخ ہرگز نہ کرنا۔ وہ علاقہ تو سائیں کا ہے۔“

سائیں یا تو خاں کا نام سن کر شہزادی قمر کو کانٹوں کھول گیا۔ اس نے مغلوں کی خود غرضی پر دل ہی دل میں لعنت بھیجی۔ اس کا چچا چاہا کہ منگو خاں سے ایک بار پھر پوچھے کہ جب اس کی مائے اس کے مایا ہونے کے نالے یا تو خاں کے ٹھکانے اس سے مدد مانگی تھی تو اس نے کوئی لشکر کیوں نہ بھیجا۔ اور اب محض ایک مائیں کے بلانے پر اتنا عظیم

لشکر کیوں دوڑا چلا جا رہا ہے؟

منگو خاں نے ہلاکو کو تیسری اور آخری نصیحت کی:

”دیکھو ہلاکو۔ اس لڑکی کی معلومات سے پورا پورا فائدہ اٹھانا۔“

پھر اس نے شہزادی قمر سے کہا:

”اگر تو نے صحیح رہنمائی کی تو میں ہلاکو خاں کو تجھے غمش دوں گا۔“

شہزادی قمر کا دل پہلے ہی جلا ہوا تھا اس نے کہا:

”خاتون! میں کسی لالچ کے لیے یہ نہیں کر رہی ہوں اور جو تو نے یہ کہا کہ تو ہلاکو خاں کو بخش دے گا تو میں یہ

کئے پر مجبور ہوں کہ جس طرح مجھے بزدلوں سے نفرت ہے اسی طرح میں بخشی ہوئی چیز سے نفرت کرتی ہوں۔ شہزادہ شکار جو کرتے ہیں۔

خاقانی ملگوخان، شہزادی تھرو کے اس منہ توڑ جواب سے شرمندہ ہو گیا اور کھینائی بنی بننے لگا۔ مگر کھینائی بنی بننے والا ملگوخان باوجود اپنی تمام کوتاہیوں کے ایک دانا اندر خزانہ مغل تھا۔ اس نے اس عظیم ملنگ کے لیے ہی تمام انتظامات کر لیے تھے۔ راستہ تصاف کیا جا چکا تھا۔ دور درازی میں جس طرح کیس بنائی گئی تھیں۔ و جیتوں کی پرانی پگڈنڈی اب ایک شاہراہ بن چکی تھی۔ ہر ہر منزل پر چوکیاں قائم تھیں۔ چوکیوں پر کھانے پینے اور سونے کا انتظام تھا۔ سواری بدلنے کے لیے گھوڑے موجود تھے۔ ہر منزل پر ایک جینی افسر مسافروں کو ٹھہراتا۔ ان کے کتے جانے کا تاریخ اور وقت کا باقاعدہ اندراج کرتا۔ فوجی قاصد پیغام۔ لے کر تیز رفتاری سے سفر کرتے اور اگلے منزل پر یہ پیغام نے شہسواروں کے سپرد کرتے جتنا تھوہ دم گھوڑوں پر آگے سفر کرتے ہی قرون وسطی کے گھوڑوں کی ڈاک گاڑی تھی۔ ان سواروں کو پیام اور سواروں کو چہرے کتے تھے۔ ممکن ہے کہ اردو لفظ چہرہ اسی چہرے سے نکلا ہو۔

ہلوخان قراقرم سے اس شہن سے نکلا کہ تاحہ نظر لشکر تھا۔ اس کے ساتھ جینی انجینئروں کا ایک طویل دستہ بھی تھا۔ بعض ماہروں کے پاس ایک یا بیشتر تھا جس کے ذریعے نفت (خام سفورس) کا اثر رکھنے والا تیل کے شعلے پھیلے جاسکتے تھے۔

اس لشکر کے ساتھ جہازیں کے ماہرین بھی تھے جن کا کام انہیں مقبوضہ علاقوں کے نقشے تیار کرنا تھا۔ محصل جمع کرنے والے اور طریق بنانے والے بھی ہلوک کے ساتھ تھے۔

اس وقت دارالاسلام (بغداد) کا شہنشاہ ایک فوجی مرجع چلکھا جس پر مغلوں کے جنرل تائید کی حکمرانی تھی پرانی شاہراہ ریشمی کے کنارے کنارے تمام علاقوں پر بھی مغل خلع تھے۔ اس کے مغربی سرے پر قسطنطنیہ کے بازنطینی سلطنتی ترکوں سے برسر پیکار تھے اور شکست خوردہ خوارزمی شاہیوں کے ساتھ لڑ کر حرم کے ساحل پر صلیبیوں سے اب بھی جنگ کر رہے تھے۔ اس کے آگے اسلام کا آخری قلعہ مصر تھا جس پر مالک مجرب کے کھنڈرات شاہ فرانس کو شکست دینے کے بعد تاتاریوں کے مقابلے کے لیے خود کو تیار کر رہے تھے۔ کاش ان مسلم طاقتوں میں اتفاق ہوتا تاکہ بغداد چھ سکتا۔

اس مسئلے کس کس جنب مغرب کی طرف ہلوخان اس طرح بڑھا جیسے جنگ ریتہ بڑھتا ہے۔ اس نے پہاڑی سلسلوں کو سوراخ کیا۔ تبت کے برف زاروں کا پتھر کاٹا۔ وہ شکار کھیتا، شہنشاہیں آڑا، تاتاریوں کا گانا آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔

ہلوخان نے ان مرداروں کا اخیر مقدم کیا جو پہاڑوں سے اتر کر اس کی جاہ و حشمت کو سلام کرنے خود آگئے۔ اس سے

مقابلہ دیا لگتی تھی۔ اس کی طاقت اٹل تھی جب جنگ کا ذکر آتا تو ہلوخان قہقہے لگتا۔

ہلوخان کو عمر قند کے ربو زہت پسند آگئے۔ اسے قتل قہم کے سراپوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ یہ سراپے دور سے جھیلیں اور ہرے بھرے جنگل نظر آتے لیکن جب وہ گھوڑا دوڑاتا ان کے پاس پہنچتا تو وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے اور آخر کار کو روئے زمین کے ان عجیب ترین قلعوں تک جا پہنچا جو حسن بن صباح کے ذرائعوں نے شہب ز کے گھونسلوں کی مانند تیار کیے تھے۔ خطرناک جنگلوں اور خوفناک گھاٹیوں سے گھرے ہوئے ان قلعوں پر ان کا چھ سو سال سے قبضہ تھا۔ میان کاشیخ، جبل ایران کے نوجوانوں کو حشیش کھلا اور پلا کر مدہوش کرتا اور جنت کی میر کا لایچ دیکھ انہیں قاتل بنا دیتا۔



شیخ الجبل کا مضبوط ترین قلعہ الموت آسمان سے باتیں کوئی چوٹیوں پر ایک چوٹی کی طرح نظر آ رہا تھا۔ قلعہ کی طرف جانے کے لیے بظاہر کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ ہر طرف گہری گھاٹیاں اور گہنے جنگل تھے یا پھر سیدھی اوپکینی چٹانیں جن پر چڑھنا تقریباً ناممکن تھا۔ ہلوخان کا لشکر شام کے وقت قلعے کے قریب پہنچا۔ اس نے لشکر کو خیمے لگانے کا حکم دیا۔

ایک طرف خیمے اسٹادہ ہونے لگے اور دوسری طرف ہلوک خان نے چالیس ہزار کے لشکر کے ساتھ قلعے کے گرد رات ہونے سے پہلے پہلے گھیر ڈال دیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ہلوک خان اپنے خیمے میں آرام کرنے کے لیے واپس آ گیا۔

قلعے والے ہلوک کے لشکر سے بے خبر نہ تھے۔ انہیں تو اس لشکر کی اس وقت ہی خبر ہو گئی تھی جب ہلوک خان ابھی قلعہ الموت سے کئی قریب دور تھا۔ شیخ الجبل کے جاسوس ذیاد دم کی خبریں قلعے میں پہنچ رہے تھے۔ شیخ الجبل کو خطہ تو اسی دن محسوس ہوا تھا جس دن شہنشاہ مارا گیا تھا اور خواجہ نصیر الدین طوسی کی کمز ہزار کوششوں کے باوجود نہ پکڑی جاسکی۔ شیخ الجبل نے تمام حفاظتی اقدام اٹھائے تھے۔ سرنگوں اور راستوں کو پتھروں کی بھاری بھاری ہلوں سے اس طرح بند کر دیا گیا کہ یہ راستے اور سرنگیں پورا کا حصہ بن گئے۔ قلعہ کے صدر دروازے کے علاوہ ہر راستے اور سرنگ کے دروازے بھی پتھر کے بندے کئے گئے تھے۔ دراصل صباح کے پیروکاروں نے اس قلعے میں ویسے ہی پتھر کے دروازے لگائے تھے جیسا دروازہ یہودیوں کے مشہور قلعہ صیبر کا تھا جسے شہر خدا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زور بازو سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ حسن بن صباح خود بھی یہودی تھا جسے ایک منصوبے کے تحت مسلمان بنا کر

مسلمانوں میں اخراج پیدا کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ چھ سو سال پہلے قلعہ الموت کی سب سے پہلی جنت بھی ایک دروازہ کی اختراع تھی۔

شہزادی قمر و اب تک ہلاکوخاں سے بچی ہوئی تھی۔ قراقرم میں وہ شہزادی دوقوز کی زندگی و جس سے بچی رہی۔ اسے بھر ہلاکوکو کسی جگہ سکون نہ ملا۔ اس لیے وہ شہزادی قمر و کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ قلعہ الموت اگرچہ اب بھی فتح نہ ہوا تھا لیکن ہلاکوخاں ایک گونہ سکون محسوس کر رہا تھا۔

رات ہوئی تو کھانے پینے کے بعد ہلاکوخاں کو شہزادی قمر و کی یاد آئی۔ اس وقت شہزادی دوقوز اس کے پیچھے میں بیٹھی تھی۔ ہلاکوخاں نے ایک پہر بیدار کو شہزادی قمر و کے پیچھے کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ اسے ساتھ لے آئے۔ شہزادی دوقوز اس بات پر بہت جربز ہوئی مگر کیا کرتی خاصوش ہو رہی تھیں اب تو یہاں منگوخاں بھی نہ تھا جو اس کی طرف داری کرتا۔

پہریدار نے واپس آکر بتایا کہ شہزادی قمر و لشکر کے خیمہ زن ہوتے ہی پچاس سواروں کے ساتھ جنگل میں قلعے کی طرف جانے والے راستے کو تلاش کرنے لگی ہے اور اب تک واپس نہیں آئی۔

دوقوز اس اطلاع سے بہت خوش ہوئی لیکن ہلاکوخاں کو چین نہ پڑا اور شہزادی کو ڈھونڈنے کے لیے جنگل میں چلا گیا۔ جنگل میں اندھیرا تھا اور ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھتا تھا۔ ہلاکوکو زیادہ دور تک نہ جاسکا اور پریشان ہو کر واپس آ گیا۔

شہزادی قمر و بھی گئے جنگل میں اندھیرے کی وجہ سے اس سڑک تک پہنچنے میں ناکام ہوئی جس سے وہ فرار ہو گئی۔ جب بہت رات گئے وہ واپس آئی تو اسے ہلاکوخاں کے بلاوے کا علم ہوا۔ ہلاکوکو اس دوران کئی آدمیوں کو اس طرف بھیج چکا تھا۔

شہزادی بہت تھکی ہوئی تھی۔ طویل سفر نے اس کی ہڈی پسلیاں ہلاک کر رکھی تھیں۔ اس کے پیچھے میں قاتلوں کا ہوا تھا۔ وہ قاتلوں پر لیٹ کر یہ سوچنے لگی کہ اس وقت وہ ہلاکوکے پاس جلتے یا نہ جلتے۔ سوچتے سوچتے اس کا خیال اپنی موجودہ زندگی کی طرف بھی گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی زندگی بے کیف اور بے مقصد ہے۔ اسے نہ کسی گھر ہے نہ جسمانی۔ بدعہد مخلوق کا اسے بالکل اعتبار نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ تمام آڑائی و دراصل عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہو رہی ہے جس میں عیسائی اپنے مقصد کے لیے مخلوق کو ڈھال بنا کر مسلمانوں کی طاقت ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اور مصلح عیسائیوں کی مذہبی مصیبت سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کی عظیم طاقت کو زیر کر کے تمام ایشیا فتح کر لیں گے۔ خواب کو شرمندہ تعبیر کرنا چاہتے ہیں۔

اسے یہ بھی علم تھا کہ اگر ہلاکوخاں نے قلعہ الموت اور بغداد کو تسخیر بھی کر لیا تو وہ باتوخاں سے ٹکرائے جلتے

مفتوحہ علاقوں کا ہتھیار ہر گز نہ ہو گا۔ پھر شہزادی قمر و تیرا کیا بنے گا؟ شہزادی قمر و کے دل سے ایک آواز آئی اور اس کی آنکھیں شہزاد ہو گئیں۔

وہ انھیں خیالات میں غرق تھی کہ خیمے کا پرہ ہٹا اور ہلاکوخاں اندر آیا۔ شہزادی قمر و اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہلاکوخاں بھی سکتا ہوا اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

اس نے کہا:

شہزادی۔ تم سوچتی ہو گی میں تمہیں بھول گیا؟

ابھی تو نہیں بھولے شہزادی نے طنز یہ انداز میں کہا:

لیکن قلعہ الموت فتح کرنے کے بعد تم مجھے فرود بھول جاؤ گے۔

نہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔ میں نے تمہیں پسند کیا ہے اور جسے میں پسند کر لیتا ہوں اسے بھولنا نہیں کرتا۔

ہلاکوخاں نے دانا چر کر کہا۔

دراصل اسے شہزادی کا یہ انداز گفتگو پسند نہیں آیا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ اس کے داغے پر شہزادی کو چلبے تھا کہ وہ ہنس کر اس کا استقبال کرتی جسے دوسری داستانیں یاد کرتی تھیں۔

شہزادی نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ وہ فی الحال ہلاکوکے الجھانیں چاہتی تھی۔

ہلاکوخاں نے اسے کھینچ کر اپنے قریب کر لیا اور بولا:

عمیری بات کا جواب نہیں دیا تم نے؟

ہلاکوخاں گھڑی کا دودھ پی کر آیا تھا۔ اس کے منہ سے بدبو کے بھیکے چھوٹ رہے تھے۔ شہزادی کو وحشت ہونے لگی تھیں اس نے اپنا منہ دوسری طرف گھمایا۔

ہلاکوخاں پر شہنشاہ سوار تھا کہ اس نے دست و دھاری شہزادی کو دی لیکن شہزادی اس بار بھی اس کے ہاتھ سے محفوظ رہی۔ خیمے کے باہر لوگوں کے بھاگنے دوڑنے اور چیخے پھلانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ہلاکوخاں گھبرا کر جلدی سے باہر نکلا۔

ہلاکوخاں نے دیکھا کہ اس کے لشکر کے خیمے دور دور تک شعلوں کی لپیٹ میں ہیں اور جو لوگ آگ بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں ان پر جنگل اور دادی سے تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔

ہلاکوخاں اس صورت حال سے بے جا پریشان ہوا۔ اس نے لشکریوں کو حکم دیا کہ کوئی خیموں کے قریب نہ جلتے۔ شیخ جلتے رہے شعلے بلند ہوتے رہے۔ آگ بجھانے والے مصلح خیموں سے دور کھڑے بڑی حسرت اور غصے سے جلتے جلتے خیموں کو دیکھ رہے تھے۔

شیخ، بالکل کھڑائیوں کا یہ پہلا شب خون تھا۔ اس میں جانی نقصان تو زیادہ نہ ہوا لیکن ہلاکوں کا کھنکھارہ
شکوہ کے چوٹھاٹی جیون سے ہاتھ دھونا پڑے۔

رات جوں توں کہ کے مغلوں نے جیون سے دور کھڑے کھڑے گزار دی لیکن صبح ہوتے ہی ہلاکوں کا نکلنا
قلعہ الموت کے اس پاس کی تمام آبادیوں کو پھونک دیا جائے۔ آبادی کے مکین ہلاکوں کی یلغار کی خبر باکرہ پہلے ہی تھی۔
جذبہ اور جنوب مغرب کی طرف بھاگ چکے تھے۔ ان کے اٹانے اور مویشی ہلاکوں کی بریریت کا شکار ہو گئے۔

قاضی محسن الدین قزوینی نے جن مغلوں کو اپنا دوست اور آقا سمجھ کر مدد مانگی تھی انہوں نے سب سے پہلے
اس کے گھر کو اندر آتش کر دیا۔ ہلاکوں نے محبت اور دوستی کا یہ پہلا مظاہرہ کیا۔ اور پھر ہلاکوں نے پوری طاقت
سے قلعہ الموت پر چار جانب سے یلغار کر دی۔

ہلاکوں کے لشکر، چینی انجینئروں کے کھنکھارے کے مطابق تھکنے کاٹتے ہوئے اور راستہ بناتے قدم بہ قدم
قلعہ کی بلندیوں کی طرف بڑھنے لگے لیکن مغلوں کی رفتار بہت سست تھی۔ فدا فی پھاٹکے اوپر سے پھرتا اور بڑی بڑی زبانیں کیا ضرورت ہے۔
چٹانیں لڑھکا کر ان کے کام میں رکاوٹ پیدا کر رہے تھے۔

ہلاکوں نے معینہ قوت کے ذریعے نفت کے شعلہ بار گولے قلعہ پر پھینکنے کی کوشش کی لیکن قلعہ اتنا بلند
کہ یہ گولے وہاں تک نہ پہنچ سکے۔ گولے پھرتوں پر گرتے چٹانوں سے ٹکراتے یا پھر ہرے ہرے درختوں کا
کچھ نقصان پہنچاتے۔

ہلاکوں کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہو رہی تھی۔ رات ہوتے ہی فدا فی زبردست شب خون مارتے۔ وہ بہت پر
کی طرح جنگلوں اور وادیوں سے نکلتے۔ تیز برسات اور بھڑکتی مشعلوں کو مغلیہ جیون پر پھینکنے دم کے دم میں واپس
پلے جاتے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ زمین سے نکلتے ہیں اور پھر زمین ہی میں کہیں غائب ہو جاتے ہیں۔
کئی دن گزر گئے۔

دن بھر پڑ کاٹے جلتے اور راستہ بنایا جاتا لیکن رات فدا فیوں کے حملوں کی ممانعت میں گزرتی۔
ہلاکوں کا یہ زعم تھا کہ وہ شہزادی قمرولی مدد کے بغیر قلعہ الموت پر قبضہ کرے گا اور شہزادی نے قلعہ
لیا تھا کہ جب تک ہلاکوں کا اس سے درخواست نہ کرے گا وہ قلعہ میں جلنے والی سرنگ کو از خود دھماکا کرے گا۔
کیونکہ قلعہ کی تباہی اور مغلوں کی فتح سے اسے اپنے ذاتی فائدے کی کوئی امید نہ تھی۔

آخر ہلاکوں کو بھگنا پڑا۔

ہلاکوں نے شہزادی سے کہا:

”شہزادی۔ تم نے ایک سرنگ کاٹ کر کیا تھا جو قلعہ میں جاتی ہے۔ اسے تلاش کیا تم نے؟“

ہلاکوں کو حاکم نے کیسے ایک ہفتے سے زیادہ ہو چکا تھا لیکن اسے کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی وہ رات بھر

ادھر ادھر جگہ دوڑ کر کے لشکریوں کے حوصلے بلند کرتا رہتا کیونکہ لشکریوں میں قلعہ فتح نہ ہونے کی وجہ سے
بے چینی اور بد دلی پھیل رہی تھی۔

عاصی کو آج بارہواں دن تھا۔
ہلاکو خان نے اپنے سپہ سالار قطبوغا کو مشرق سے چڑھائی کرنے کا حکم دیا اور خود اس نے مغرب ہاتھ پر چڑھ نہیں کرے گا۔ پھر وہ خواہ مخواہ کیوں خود کو ہلاکو خان کے حوالے کرے۔
یغاری۔ یہ یغلا تائی تیز رفتاری اور شدت سے کی گئی کہ اوپر سے گرتی پتھر کی سلوں اور چٹانوں کے باوجود
اپنے دوستوں کے ساتھ کافی بلندی تک پہنچ گیا۔ ہلاکو خان نے اپنے فوجیوں کو حکم دیا کہ اب بجائے نیچے والیوں تک روٹیں بدلتی رہی۔ دن بھر کی ٹھنک کا تھا حال تو یہ تھا کہ وہ میٹھے ہی موجدانی مگر نیند کا دور دور بہتہ نہ تھا۔
جلنے کے اسی بلندی پر قبضہ برقرار رکھ کر رات گزاری جائے۔
دوسری طرف قطبوغا کو بھی کچھ کامیابی ہوئی۔ ہلاکو خان کے حکم کے مطابق وہ بھی اس جگہ ٹھہر گیا جہاں کہ
وہ نیچے کے باہر آگئی۔

دو درات مغلوں پر بڑی سخت گزری تھی تا ارات خدائی ان پر پتھر اور تیروں کی بارش کرتے رہے مگر مغل پھر سے کبھی انتقام نہ تھا۔
کی اڑیے اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس رات مغلوں کا بقیہ لشکر شب خون سے محفوظ رہا۔
دن کے اس شدید حملے سے غائدہ اٹھتے ہوئے شہزادی تھوڑے قلعے کے چاروں طرف گھوم پھر گیا لیکن روشنی کی ایک کیریا ہمارے آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ دو قوز خانوں اب بھی جاگ رہی ہے۔ شہزادی تھوڑے
اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس نے پلے دن قلعے کے نیشب میں سرنگ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن جبکہ اکثر دو قوز کی حالت پر افسوس ہوتا تھا۔ اس کے قراقرم پہنچنے سے پہلے ہلاکو خان پر دو قوز خانوں کی حکومت تھی۔
پھر اگر سرنگ کا دبانہ تو قلعے سے کافی دور تھا تو اس نے اپنی تلاش کا دائرہ وسیع کر دیا۔
شہزادی گھوڑے پر آہستہ آہستہ ہر مقام کو بغور دیکھتی قلعے کے گرد چکر لگاتی رہی۔ اس کے ذہن پر تھوڑے آجانے کی وجہ سے دو قوز کی حکومت ختم ہو گئی اور اس کا حسن ماند پڑ گیا۔ ایسا معلوم خوف سے اس کا چہرہ
چھوٹی سی چٹان گھوم رہی تھی جس پر کھڑے ہو کر شہزاد نے اشارہ کیا تھا۔ اب اس کی تمام تر توجہ سرنگ کے بجائے حرکت کھلایا کرتا تھا۔

چٹان کی طرف تھی کیونکہ چٹان تک پہنچنا تھا۔ سرنگ کا دبانہ چٹان کے قریب ہی تھا۔
جو بندہ یا بندہ کے مصداق شہزادی نے اس چٹان کو ٹھونڈ نکالا اب وہ بے حد خوش تھی۔ وہ قلعہ الموت کی نائے بے تعداد بے ارادہ وہ خیمے تک آئی تھی ویسے ہی بے ارادہ اور بے قصد اس نے خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر بھاگا۔
اپنے سر باز نہ کر مغلوں پر احسان کرنا چاہتی تھی۔
شہزادی گھوڑے سے اتر کر چٹان پر پہنچی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ہر طرف گھنے سایہ دار پہاڑ تھے۔
اور لابی لابی چھاڑیاں تھیں۔ سرنگ اسے کہیں نظر نہ آئی۔
سورج غروب ہونے کے قریب تھا اس لیے اس نے دلچسپی کا ارادہ کیا۔ اسے امید تھی کہ کل دن کے
وہ سرنگ کا دبانہ تلاش کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گی!

شہزادی خیمے کا پردہ چھوڑ کر خیمے کی پچھلی طرف چلی۔ ذرا دور دو قوز کا عبادتی چیل کھڑا تھا۔ چکڑے کا
نورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ خالص سورنے کی صلیب مشعلوں کی تیز روشنی میں چمک رہی تھی اور دو قوز صلیب کے سامنے سجدے کی
حالت میں پڑی تھی۔
شہزادی آہستہ آہستہ چکڑے کے قریب چلی گئی۔ دو قوز کو اس کے گنے کی خبر نہ ہوئی تھوڑے دیر تک دو قوز
کی پشت پر کھڑی اس کی عبادت کو دیکھتی رہی۔

شہزادی دو قوز نے سجدے سے سر اٹھایا۔ پھر اس طرح منہ پر ہاتھ پھیرا جیسے دعا کے بعد پھر
عبادت سے فارغ ہو کب پکڑے سے اتارنے لگی تو اس نے چار قدم پر شہزادی کو کھڑے کر رکھا۔
کے لے جے آثار دو قوز کے چہرے پر پیدا ہوئے۔

شہزادی تھرو کو ایک بار پھر دو قوز پر رحم کیا۔
تھرو نے ہنس کر دو قوز سے کہا:

”یہ تم کس کے سامنے سجدہ کر رہی تھیں شہزادی؟“

شہزادی دو قوز، تھرو کے مقابلہ پر پہلے ہی شکست کھا چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ غصہ کرنا بیکار ہے۔
”خدا خواہ کی ضد سوار ہو جاتی ہے اس نے بھی ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

”علیہ مبارک کے سامنے میرا مذہب کہتا ہے کہ علیہ کے سامنے جو دعا مانگی جائے وہ قبول ہو جائے۔
شہزادی نے اس وقت بھلا کیا دعا مانگی؟“ تھرو نے شرفی سے پوچھا۔

شہزادی نے دعا تو مانگی تھی لیکن اس کا اٹھارہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ خاموش رہی۔

”شہزادی نہ بتائیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے کیا دعا مانگی ہے۔“

شہزادی نے حیران نظروں سے تھرو کو دیکھا اور کہا:

”تمہیں کیسے معلوم ہوا۔“

شہزادی دو قوز کچھ خوفزدہ سی ہو گئی۔ وہ یہ سوچنے لگی کہ اگر تھرو کو میری دعا معلوم ہو گئی ہے تو
کوئی غیر معمولی طاقت ہے۔

”مجھے تو تمہارے دل کا پورا حال معلوم ہے۔“ تھرو اُسے چھیڑتے ہوئے بولی۔

شہزادی دو قوز، تھرو سے خوف تو پسے سے تھی۔ تھرو اس وقت اتنے پیار سے انداز سے ہنس

باتیں کر رہی تھی کہ دو قوز کا خوف قدرے کم ہو گیا اور اسے تھرو کی باتوں سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔

دو قوز نے کہا:

”اگر تم میرے دل کا حال بتا دو تو میں تمہاری بڑائی تسلیم کر لوں گی۔“

”میں اپنی بڑائی جتنا نہیں چاہتی۔“ تھرو نے کہا:

”مگر میں پھر کہتی ہوں کہ تم نے جو دعا مانگی ہے وہ میں جانتی ہوں۔“

شہزادی دو قوز کو اور دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ تھرو کے پاس آئی اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا:

”اگر تم پسند کرو تو میرے خیے میں چلو۔ وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

”میں تمہارے خیے سے ہو کر آ رہی ہوں۔“ تھرو نے شہزادی کو بتایا اور دو قوز کے ساتھ چلنے لگی۔

دو قوز کے قدم اک دم رک گئے۔ اس نے حیرت سے کہا:

”میرے خیے سے۔ تم وہاں کیا کرنے لگی تھیں؟“

”تم سے ملنے۔“

”مجھ سے ملنے۔ اس کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔۔۔۔۔“ دو قوز کی دلچسپی میں امانہ ہو گیا۔

”یونہی۔ مجھے اپنے خیے میں الجھن محسوس ہوئی اور میں تمہارے خیے کی طرف آ گئی۔“

دونوں دو قوز کے خیے پر آ گئی تھیں۔ ایک کینز نے خیے کا پردہ اٹھایا۔ یہ دونوں اندر داخل ہوئیں۔

خیے میں اعلیٰ درجے کے قادیون کا فرش تھا۔ کامدار گاؤں تکے سلیمت سے رکھے ہوئے تھے۔ تھرو اور دو قوز
اسے سامنے بیٹھ گئیں۔

دو قوز بولی:

”اب تلو میرے دل کا حال۔“

”وہ تو تمہارے چہرے پر لکھا ہے۔“ تھرو نے ہنس کر جواب دیا۔

”میں سمجھی نہیں۔ چہرے پر کیسے لکھا جاتا ہے۔“ دو قوز اس کی بات سمجھنے سے قاصر تھی۔

شہزادی دو قوز۔ میں اتنی بری نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔“ تھرو نے کہا:

”اگر تم مجھ پر اعتماد کرتیں تو میں آج میری موت کی دعا نہ مانگتا پڑتی۔ مجھے تمہارے شوہر ہلاکوں سے

کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ میں اس کی داشتہ بننا چاہتی ہوں اور نہ ہیوی۔“

یہ نہیں چاہتی ہو تو پھر کس بات کی خواہش ہے۔“ دو قوز نے پوچھا۔

شہزادی دو قوز۔ پہلے ہلاکوں کا ارادہ مجھے داشتہ بنا کر رکھنے کا تھا لیکن اب وہ مجھ سے ایک اور

مطلب نکالنا چاہتا ہے۔“

دو قوز نے کہا تو کچھ نہیں لیکن اس طرح تھرو کو دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ مرد عورت سے اس کے علاوہ اور کو

مطلب نکال سکتا ہے۔

شہزادی تھرو نے بتایا:

”ہلاکوں کو معلوم ہے کہ میں قلعہ الموت کے تمام راستوں سے واقف ہوں۔ میں اس راستے کو بھی جانتی ہوں

جس کے ذریعے بغیر خون بہائے قلعے کے اندر پہنچا جاسکتا ہے۔“

دو قوز نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”پھر تم بتائی کیوں نہیں۔“ دو قوز جلدی سے بولی:

”بغیر خون خرابے کے قلعے پر قبضہ ہو جائے تو اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے؟“

”میں یہ راستہ بتانے ہی اس کے ساتھ ہاں تک آئی ہوں۔“ قمر نے کہا:

”اور آج تو میں قلعے کے اندر جانے والی سرنگ کے قریب پہنچ چکی تھی لیکن میں جانتی ہوں کہ قلعہ

لیسنے کے بعد ہلاکوخاں اپنا وعدہ پورا نہیں کرے گا۔“

شہزادی دو قوز لفظ ”وعدہ“ پر ایک دفعہ پھر بخود دہرا ہو گئی۔

اس نے فوراً سوال کیا:

”تم سے کوئی وعدہ کیلئے ہے اس لئے؟“

”ہاں! شہزادی قمر نے دو قوز کی پریشانی کا اندازہ کرتے ہوئے کہا:

”لیکن تم مطمئن رہو۔ یہ وعدہ مجھ سے شادی کا نہیں۔ میں تمہارا حق مانا نہیں چاہتی۔ میں کسی شادی شدہ آقا

سے شادی کرنا پسند نہیں کرتی ہوں۔ اس نے وعدہ کیلئے کہا کہ اگر میں قلعہ فتح کر ادوں تو وہ میری ماں کے خون

باتو خاں سے لگا کر وہ ایسا نہ کر سکے گا۔“

شہزادی قمر نے چونکہ وعدے کی پوری طرح وضاحت کر دی تھی اس لیے دو قوز کو بڑا اطمینان حاصل

اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے شہزادی قمر کے ساتھ بلاوجہ ہی بیہوش ہوا تھا۔

دو قوز نے پوچھا:

”لیکن تم نے ابھی یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہلاکوخاں اپنے وعدے سے پھر جلتے گا؟“

”کیونکہ یہ مغلوں کی فطرت ہے۔“ قمر نے جواب دیا:

”ہلاکوخاں صرف اپنی مرضی کو تسلیم نہیں کرتا۔ میں تو فرماؤں کہ یہاں تک یہ دیکھتی چلی آ رہی ہوں۔ ہلاکوخاں

ادراک کو اطاعت قبول کرنے پر معاف کر دیتا ہے لیکن دوسرے کے خلاف فوج کشی کر کے قتل و غارت گاہ

گرم کرتا ہے۔ حالانکہ وہ اعلیٰت قبول کر چکا ہوتا ہے۔“

دو قوز نہیں چاہتی تھی کہ ہلاکوخاں پر کوئی الزام لگائے۔ اس نے ہلاکوخاں کی طرف داری کرتے ہوئے کہا:

”میرا خیال ہے کہ جن ریاستوں کو اب تک تباہ و برباد کیا گیا ہے ان کے حکمرانوں نے ہلاکوخاں

پر قہری کی تھی۔“

”میری آنکھیں بھی ہیں اور کان بھی۔“ قمر نے جھٹکا کر کہا:

”غلط تاویس نہ بیان کرو جو کچھ ہو رہا ہے وہ میں بھی دیکھ رہی ہوں اور تم بھی۔“

شہزادی قمر کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ گھوڑوں کے بھاگنے کی آواز سنی۔ دو قوز کا خیمہ کئی بار ہلا اور

مشتعل لہرائیں۔ دونوں شہزادوں کی نظر بدھیمے کے دروازے پر لگی تھیں کہ کئی آدمی خیمے میں ایک ساتھ

گھس آئے۔

خدا کی شہزادی قمر نے زیر لب کہا۔

اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ کمر میں گئے ہوئے خنجر کی طرف گیا لیکن حملہ آور خدائی اس سے زیادہ پھرتیلے ثابت

ہوئے۔ انہوں نے بڑی تیزی سے شہزادی قمر اور دو قوز پر چادریں ڈال دیں اور انہیں زمین پر گر کر قابو میں کر

لیا۔ دونوں شہزادوں پر کئی خدائی اس طرح سوار تھے کہ وہ ہاتھ پیر بھی نہ ہلا سکیں۔

پھر چادر سے نکلتی ہوئی تیز ہوان کے ناک میں ماکھی۔

ان کے ہاتھ پیر ڈھیلے ہو گئے اور آنکھیں بند ہونے لگیں!



ہلاکوخاں کو اس اچانک حملے کی خبر ملی تو وہ بہت پریشان ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ خدائی کس راستے

سے قلعے سے باہر نکلے۔ قلعے کے چاروں طرف اس نے اپنے خیال میں چھپے چھپے سپاہی تعینات کر دیے

تھے۔ ہلاکوخاں جلدی جلدی پاڑی سے ان کے خیوں کے پاس آیا۔ اس نے سپہ سالار کو بونا کہ بلانے کے لیے

آدی بیج دیا۔

بیج آکر اسے کینڑوں سے معلوم ہوا کہ شب خون کے وقت شہزادی دو قوز کے ساتھ شہزادی قمر بھی تھی

پیلے اسے خیال گزرا کہ شاید یہ شہزادی قمر کی حرکت ہو اور اس نے خدائیوں سے باز کر کے شہزادی دو قوز

کو اغوا کر لیا ہو۔ لیکن اس کے اس خیال کی قط بونا نے بھی تردید کی۔ کیونکہ کینڑوں کے بیان کے مطابق شب خون

مارنے والے سوار آدمی وطنوں کی طرح آئے۔ انہوں نے پہلے ان چند محافظوں کو قتل کیا جو شہزادی اور دوسری

خواتین کے خیموں پر حفاظت کے لیے مامور تھے۔ پھر انہوں نے دو قوز کے خیمے میں گھس کر شہزادی دو قوز اور قمر

کو گرفتار کیا اور ان دونوں کو گھوڑوں کی طرح گھوڑوں پر بلا کر مغرب کی طرف بھاگ گئے۔ قلعے یا دادیوں کی

طرف انہوں نے تھوڑی دیر نہ کیا اور نہ مغل لشکر پر حملہ۔

آخر ہلاکوخاں اور قلعہ بونا اس بات پر متفق ہو گئے کہ خدائیوں کا مقصد شب خون مارنا نہیں بلکہ شہزادی دو قوز

کو اغوا کرنا تھا۔ اس کا یہ مطلب بھی تھا کہ خدائیوں کو مغل لشکر کی نقل و حرکت کی پوری خبر تھی اور شہزادی دو قوز اور

اس کے نیچے کو بھی پہناتے تھے۔

وہ دونوں رات بھر اس مسئلے پر غور کرتے رہے۔ اس اندھیرے میں ان کا تقابک کرنا جیسے درمیان بھی معلوم نہ تھی، لہذا اصل اور ایک اختلاف نہ فعل تھا۔ ہلاکو اور قطبوغا نے فیصلہ کیا کہ صبح ہوئے ہی لشکر قطبوغا کی سرکردگی میں شہزادی دوقوز کی تلاش میں روانہ ہوا اور شیخ ابجیل کے مذاہنوں کے قلعے جہاں جہاں دیں انہیں خاک کا ڈھیر بنا دیا جائے۔ باقی لشکر کے ساتھ ہلاکو قلعہ الموت کو فتح کرنے کی کوشش کرے۔

صبح ہوئی تو قطبوغا تیس ہزار سواروں کے ساتھ مغرب کی جانب روانہ ہوا۔ اس نے اس لشکر کے تین حصے اور انہیں میمنہ، میسرہ اور قلب کی صورت دے کر اس طرح آگے بڑھا جیسے میدان جنگ میں حملہ کیا جاتا ہے۔ قدرے دوس ہزار لشکر اس نے اپنی کمان میں رکھا۔ پھر دائیں بازو کو قلب سے پانچ کوس کے فاصلہ پر، اسی طرح بائیں کو بھی قلب سے اتنے ہی فاصلے پر رکھ کر آگے بڑھا۔ اس طرح تقریباً بارہ چودہ میل میں اس کا لشکر پھیل گیا۔ چودہ میل چوڑا دھارا، سمندر کی موجوں کی طرح لہراتا ہوا چل پڑا۔

قطبوغا نے لشکر کی رفتار سست رکھی اور نظریں تیز۔ وہ جس آبادی سے گزرتا اسے زمین کے برابر کر آبادی میں سوائے جانوروں کے اور کوئی زندہ روح موجود نہ تھا۔ قطبوغا ظم و ستم میں ہلاکوں سے کم نہ تھا۔ اکا دکا آدمی کھلا کھلا دھکا نظر آتا تو قطبوغا اسے پکڑ کر مذاہنوں کی بابت پوچھتا۔ جب وہ کوئی معقول جواب نہ دے پاتا تو اسے ایک ٹک پٹواتا رہتا جب تک اس کی جان نہ نکل جاتی۔ مذاہنوں کے متعلق تو کسی کو کچھ علم ہی نہ تھا۔ وہ تو ہوا اور جھپٹا ابھی یاں، ابھی دہاں۔

اس دوران قطبوغا کو دو تین ایسے قلعے نامہ کائنات ملے جہاں مذاہنوں کے ہونے کا امکان تھا مگر یہ مکانات تھے اور ان کی ہر چیز کو جیسے آگ لگا کر خاک کر دیا گیا تھا۔

شیخ ابجیل کے مذاہنوں کے قلعے جنگلوں اور پہاڑوں میں اس طرح پوشیدہ تھے کہ کسی کو قطعی نظر نہ آتے تھے ان کا پانا اس وقت تک ناممکن تھا جب تک کوئی رہبر میسرہ نہ ہو۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں پیچھے ہوئے ایسے ہی ایک میں شہزادی دوقوز اور شہزادی قمر کو پہنچایا گیا تھا۔ ان دونوں کو مذاہنوں نے چادریں، جو بے ہوشی کے عرق میں بولی تھیں ڈال کر بے ہوش کر رکھا تھا اور گھوڑوں پر ڈال کر اس قلعے میں لے گئے تھے۔



مغل شہزادی اور ہلاکوں کی بیوی کے اغوا کا حکم براہ راست شیخ ابجیل خورشاہ نے قلعہ الموت سے جاری کیا

تھا۔ قلعے پر مغلوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا اور شیخ ابجیل کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ مغل جلد یا بدیر بزرگ شمشیر قلعے میں داخل ہو جائیں گے۔ اس نے آذربائیجان سے لے کر بحیرہ امود تک پیچھے ہونے کا کوہستانی راستے والوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے لشکر کے ساتھ فوراً کوچ کریں اور قلعہ الموت پہنچ کر مغلوں پر پشت کی طرف سے حملہ کر کے ان کا زور توڑ دیں۔

شیخ ابجیل نے ایک دوسرے حکم کے تحت قلعہ الموت سے قریب ترین قلعہ النور کے قلعہ دار کو اطلاع بھیجی کہ وہ دو سو تیز رفتار سواروں کے ساتھ مغل خواتین کے خیموں تک جائیں اور ہلاکوں کی بیوی دوقوز کو اغوا کر کے لائیں۔

شیخ ابجیل، ہلاکو کی بیوی کو گرفتار کر کے ہلاکو سے سو دس بازی کرنا چاہتا تھا۔ پس یہ اغوا اس حکم کے نتیجے میں ہوا اور شہزادی دوقوز اور شہزادی قمر کو گرفتار کر کے قلعہ النور پہنچا دیا گیا۔

شہزادی قمر کو شاید گرفتار نہ کیا جاتا لیکن اغوا کرنے والوں کی رہائی کرنے والا خداوند دوقوز کے نیچے کو تو پہنچا تھا لیکن اس کی شکل و صورت سے واقف نہ تھا۔ اس لیے شہزادی دوقوز کے نیچے میں موجود دونوں عورتوں کو پکڑ لیا گیا۔

قلعہ النور، قلعہ الموت سے مرن دس میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ قلعہ گھنے جنگلوں اور چٹانوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس قلعے کے بالکل قریب سے تجارتی شاہراہ گزرتی تھی لیکن قلعہ درختوں، جھاڑیوں اور چٹانوں میں اس طرح پوشیدہ تھا کہ آج تک کسی قافلے والے کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ لہذا یہ ہے کہ قطبوغا بھی کچھ دنوں بعد اسی قلعے کے قریب سے گزرا لیکن اسے شبہ بھی نہ ہوا کہ اس جگہ کوئی قلعہ یا مذاہنوں کا اڈہ ہو سکتا ہے۔

اسی قلعے کے ایک کمرے میں جو آس پاس کی چٹانوں سے مشتمل چار فٹ بلند ہوگا، شہزادی دوقوز اور قمر کو لاکر قید کیا گیا تھا۔

بے ہوشی کا اثر زائل ہوا تو پہلے شہزادی قمر نے آنکھ کھولی۔ اس نے خود کو سنگی فرش پر پڑا ہوا دیکھا۔ شہزادی قمر قہقہے میں اس کے قریب ہی اوندھے منہ پڑی تھی۔ ابھی سویرا نہ ہوا تھا۔ اس لائے اور تنکے کر کے کی ایک دیوار میں چھوٹی سی کھڑکی تھی جس میں سے مرد ہوا کے جھونکے اور ہلکی روشنی آ رہی تھی۔

شہزادی قمر نے اپنے حواس درست کیے۔ پھر کمرے کی ایک ایک چیز کا جائزہ لینا شروع کیا۔ کمرے میں کئی بڑے بڑے کپڑے کے تیلے پڑے تھے۔ قمر نے ایک تھیلہ کھول کر اس میں سے سامان نکالا۔ کسی سامان کے بجائے اس میں سے مذاہنوں کے لیے لیے کڑے اور عریاضیں نکلیں۔ اس نے تمام تھیلے کھول ڈالے مگر سوائے مذاہنوں کی وادیوں کے اسے کوئی مفید یا کارآمد چیز نہ ملی۔ قمر نے اس سے یہ اندازہ لگایا کہ یہ کمرہ بیکار کپڑوں کا

منور ہے کیڑوں سے اس طرح بدبو آ رہی تھی جیسے ان قبیول کوڑھ سے نہ کھولا گیا ہو۔

قبیلوں کے پاس سے ہٹ کر تھوڑا کرے کے اس دھندروازے کے پاس گئی جو بلوترے کرے کے سرے پر لگا تھا۔ دروازہ بہت مضبوط تھا۔ اس میں کوئی درز نہ تھی کہ باہر کو جھانکا جاسکے۔ دروازہ باہر سے بندھا۔ اسے کدونا توڑنا ناممکن تھا۔

شہزادی تھوڑا دن سے ہٹ کر کھڑکی کے پاس آئی اور باہر جھانک کر دیکھا۔ کھڑکی سطح زمین سے بیس پیچیسف بلند تھی۔ نیچے کی زمین پتھر پٹی تھی۔ کھڑکی کے سامنے اور چاروں طرف اونچے اونچے اور گھنے درخت تھے جس کی وجہ سے پیڑوں کے دوسری طرف کچھ نظر نہ آتا تھا۔

شہزادی دروازے کے پاس پھر آئی اور کان لگا کر باہر کی گلی لیکن باہر بالکل خاموشی تھی۔ اب وہ دو قوز کے پاس آئی اور اسے ہلکا جگانے کی کوشش کی۔ دو قوز کی بے ہوشی بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ وہ ہلکا کر اٹھ بیٹھی۔ شہزادی تھوڑے سے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔ شہزادی بہت گھبراہٹ ہوئی تھی۔ وہ بار بار تھوڑ کو سوایر نظروں سے دیکھتی جیسے پوچھ رہی ہو کہ ہم کہاں ہیں اور ہم پر کیا گزری؟

کرے میں آہستہ آہستہ روشنی بڑھ رہی تھی۔ شہزادی تھوڑی تیزی سے قبیول کو خالی کر کے کرے میں کیڑوں کا ڈھیر لگا رہی تھی۔ اس نے دو قوز کو بھی اپنے پاس بلایا اور ہاتھ بٹانے کا اشارہ کیا۔

تھوڑے مذاہنوں کی جھاڑوں، چوڑوں اور لہنے لڑتوں کو ایک دوسرے میں گہ لگا کر چوڑا شہر بنا کر دیا۔ دو قوز کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا مگر وہ تھوڑ کے کام میں شامل رہی تھوڑ جو وہ کر رہی تھی وہ خود بھی کرتی رہی۔ شہزادی تھوڑ ... جھاڑوں اور لڑتوں کی آستینوں کو گرہ میں لگا لگا کر جوڑ رہی تھی۔

تھوڑ کا ہاتھ بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ اپنے دل میں کوئی فیصلہ کر چکی تھی اور سچ ہونے سے پہلے پہلے اس پر عمل کرنا چاہتی تھی۔

شہزادی تھوڑے ہاتھ رکھا اور جھاڑوں کی اس رسی کا ایک سراد دو قوز کو پکڑا یا اور اسے اپنی طرف کھینچنے کا اشارہ کیا۔ دو قوز نے سرازور سے کھینچنا۔ اس عمل سے گرہیں کس کس مضبوط ہو گئیں۔

اس سے فارغ ہو کر شہزادی تھوڑ پھر کھڑکی کے پاس آئی اور کیڑوں کی اس رسی کو کھڑکی سے نیچے لٹکا دیا۔ ایک کر زمین تک پہنچ گئی۔ ہوا کے زور سے یہ رسی ادھر ادھر اڑ رہی تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ کسی دھجی نے کیڑے دھو کر رسی پر باندھے ہیں جس کا ایک ہر ٹاٹ کر رنگ لیا ہے۔

”دو قوز جلدی کر دے کھڑکی سے نکل کر اس رسی میں ایک جاؤ اور منہل منہل کر نیچے اتر دو۔“ تھوڑ نے دو قوز کو آہستہ آہستہ سمجھایا۔

دو قوز بڑی جلدی سے تھوڑ کو دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں اس کی محنت اور لگن کی داد دے رہی تھی۔ شہزادی دو قوز دھیرے دھیرے بدن کی تھی اس لیے اسے اس مختصر سی کھڑکی سے نکلنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ تھوڑ نے رسی کا دوسرا سر کھڑکی کے ایک پٹ میں لپیٹ کر اچھی طرح کس دیا تھا۔ اس نے شہزادی دو قوز کو سارا دیکر یا قہقہے دھکا ل کر کسی نہ کسی طرح کھڑکی سے باہر نکال دیا۔

”منہل کے اترنا“ تھوڑ نے اسے پھر ہدایت کی۔

”اور تم“ دو قوز نے رسی پر لپکتے ہوئے پوچھا۔

شہزادی تھوڑ نے رسی پٹ میں باندھ دینے کے ساتھ ساتھ خود بھی اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ دو قوز کا جسم بھاری تھا اور اگر ایک بھی گڑھ کھل جاتی تو شہزادی پتھر پٹی زمین پر گر کر زندہ نہیں بچ سکتی تھی۔

شہزادی دو قوز آہستہ آہستہ لپکتی ہوئی نیچے اتر گئی۔ تھوڑ کو نیچے آنے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔ اس نے ایک عقلمندی یہ بھی کی کہ کھڑکی سے اتارنے سے پہلے کرے کے دروازے کا بندر سے بند کر دیا۔ دروازے میں اند کی طرف بھی ایک موٹی زنجیر تھی۔ اس زنجیر کو اس نے کئی میٹروں میں اچھی طرح لپیٹ دیا۔

شہزادی تھوڑ نے نیچے آ کر دو قوز کا ہاتھ پکڑ کر اتر تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔ وہاں راستہ تھا۔ انہیں پتھر توں پر پیرو رکھ کر نیچے اترنا پڑ رہا تھا۔ شہزادی جلد سے جلد اس جگہ سے دور ہو جانا چاہتی تھی۔

جب شہزادی اور دو قوز اتر کر نیچے پہنچیں تو سمورج کی سنہری کریمیں شاخوں سے چھن کر زمین پر پڑ رہی تھیں۔ شہزادی تھوڑ نے پہلی بار پٹ کر قلعے کی طرف دیکھا مگر اسے قلعہ قطعی نظر نہ آیا۔ صرف دور اونچائی پر گھنے درختوں کا ایک جھنڈ سا ہی دکھائی دیا۔ جہاں درختوں کے درمیان ایک سفید جھنڈا اُٹھ رہا تھا۔

شہزادی تھوڑ اور دو قوز مسرتی کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ وہ تھوڑی دور گئی تھیں کہ شہزادی تھوڑ کو نیچے وادی میں پانی کی ایک کھیری نظر آئی۔

”دریائے شہزادہ“ شہزادی کے دل نے کہا اور وہ دو قوز کا ہاتھ پکڑے ہوئے نیچے وادی میں سے اترنے لگی۔

نیچے پہنچ کر شہزادی تھوڑ نے اطمینان کا سانس لیا اور وہ بولی:

”شہزادی دو قوز۔ ہم راستے پر آ گئے ہیں۔ یہ راستہ سیدھا قلعہ الموت کو جاتا ہے۔“

”لیکن تم یہ پورے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟“ دو قوز نے پوچھا۔

شہزادی تھوڑ مسکرائی اور بولی:

”ہم اس وقت، رودبار کے علاقے میں ہیں اور یہ دریائے شہزادہ ہے۔ اسی کے کنارے کنارے

جیل کر میں قلعہ الموت تک پہنچی تھی۔ ان راستوں سے میں پوری طرح واقف ہوں۔ اب تم فکرنہ کرو۔ ہم بہت جلد مغل حکومت پر چڑھ جائیں گے۔

”شہزادی تھمرو میں تمہارا کسی زبان سے شکریہ ادا کروں۔“ دو قوز خاتون نے کہا:

”میں تمہاری دشمن تھی تم سے نفرت کرتی تھی لیکن جو چہرہ دہی اور سلوک تم نے میرے ساتھ کیا ہے وہ تو میری ساری سبکی بھی نہیں کر سکتی۔“

دونوں نے دریا کے کنارے بیٹھ کر اچھی طرح بات چیت منہ دھوئے۔ پھر شہزادی تھمرو نے کہا:

”دو قوز خاتون۔ سونے اور پتیل کا رنگ تقریباً یکساں ہوتا ہے۔ اسی طرح اچھے اور بُرے کی تیز تو وقت پڑنے پر ہی معلوم ہوتی ہے۔ میرا دل تمہاری طرف سے بالکل صاف ہے۔“

دریا کے کنارے سے اٹھ کر دونوں نے بیدل چلنا شروع کیا۔

شہزادی دو قوز نے پوچھا:

”تمہارے خیال میں قلعہ الموت کتنی دُور ہوگا؟“

”میں ادھر سے گھوڑے پر گزری ہوں۔ صبح اُڑا نہ نہیں کر سکتی۔ بہر حال حوصلہ رکھو۔ ہم جلد ہی پہنچ جائیں گے۔“ شہزادی تھمرو نے دو قوز کو حوصلہ رکھنے کی تلقین کی۔

تھمرو تھوڑی تھوڑی دُور چل کر کسی اونچی جگہ سے ہماروں طرف دیکھتی جاتی تھی لیکن قلعہ الموت کا اب تک کوئی نشان نظر نہ آیا تھا۔ تھمرو راستے سے پتھر جھینک کر کہتی کہ کسی کی آنکھ پر نظر نہ پڑے۔

دو پہر گزرنے کے بعد تھمرو کو گھوڑوں کے بھانگنے کی آواز سنائی دی۔ دونوں ایک گھنی بھڑی میں چھپ گئیں۔ تھمرو نے دیکھا کہ تقریباً ایک سو فداوی سوار اسی راستے سے بڑی تیز رفتاری سے آرہے تھے جدھر سے وہ دونوں آتی تھیں۔ وہ گھوڑے دوڑاتے دریا کے کنارے کے راستے سے گزر گئے۔ ان کا رخ بھی اسی طرف تھا۔ جدھر یہ دونوں جا رہی تھیں۔

ان کے گزرنے کے بعد دو قوز نے پوچھا:

”یہ سوار کدھر گئے ہیں؟“

شہزادی کچھ سوچتے ہوئے بولی:

”یہ فداوی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھی قلعہ الموت کی طرف ہی جا رہے ہیں۔“

شہزادی تھمرو کے خیال کی جلدی تصدیق ہو گئی۔ کیونکہ ہر گھنٹے اُدھ بھٹے بعد فداوی سوار چھٹی بڑی کڑیوں

میں ادھر سے گزرتے رہے۔



صبح سے سوائے پانی کے ان کے حلق سے ایک کھین تک نہ اُتری تھی۔ دونوں کو بھوک اور کمزوری محسوس ہو رہی تھی لیکن فداویوں کے خوف کی وجہ سے انہوں نے کوئی پہل وغیرہ نکالنے کی کوشش نہ کی اور یوں اپنا سفر جاری رکھا۔ شام ہوتے ہوئے وہ کافی فاصلہ طے کر چکی تھیں۔ دو قوز تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئی۔ تھمرو کو ابھی تک محسوس ہو رہی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ اگر تھوڑی دیر سوتا لیجائے تو بہتر ہوگا۔“ دو قوز نے اپنا خیال پیش کیا۔

شہزادی تھمرو خود بھی تھکن سے چور تھی۔ اس نے دو قوز کے خیال کی تردید نہ کی۔

دونوں نے ایک ابھری ہوئی چٹان کے نیچے پتھروں کا سہارا لیا اور بیٹھ گئیں۔ تھکن نے ان پر نشوونگ ماری

کر دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک سوار دریا کے کنارے سے گزرا لیکن تھوڑی دُور جا کر اس نے اپنا گھوڑا روکا اور پھر اس جگہ دایس آگیا۔ جس سے کچھ فاصلے پر شہزادی تھمرو اور دو قوز بھاڑیوں کی آڑ میں پتھروں کا سہارا لیے بیٹھ چکی تھیں۔ تھمرو، جس پر نشوونگ ماری تھی، وہ گھوڑے کے دوڑنے سے چونک پڑی۔ اس نے جھانک کر دیکھا، فداوی سوار گھوڑے سے اتر کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پتھر نہیں اسے کس طرح یہ شبہ ہوا کہ یہاں کوئی آدمی موجود ہے۔

شہزادی تھمرو نے جلدی سے شہزادی دو قوز کو بلایا۔ شہزادی دو قوز گہری نیند میں تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا:

”کیا ہوا؟“

یہ مختصر جملہ ایسی آواز میں ادا ہوا کہ فداوی نے کان کھڑے کیے۔ وہ گھوڑے کو دھپ چھوڑ کر تیزی سے آواز کی سمت چلا۔

شہزادی تھمرو جست لگا کر جلدی سے پتھر کے نیچے ہو گئی اور پھر بھال کر دوسری جگہ چھپ گئی۔

شہزادی دو قوز اپنے بھائی جسم کو پتھر کی حرکت نہ دے سکی۔ اس نے بھاگنے کی بہت کوشش کی مگر فداوی تو ابلند کے اس کے سر پر پہنچ گیا۔

”کون ہو تم؟“ فداوی نے بلند آواز میں پوچھا۔

شہزادی کی جواب دہی۔ وہ خاموش رہی اور چاروں طرف نگاہ ڈال کے رہ گئی۔ شاید وہ تھمرو کی مدد کی تلاش میں تھی۔

فدا فی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسی نے پوچھا:

”تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟“

شہزادی دو قوز نے سر کو ہٹائی کے طور پر ہلکا کر اپنی گردن نیچے کر لی۔ اس نے سوچا کہ وہ خود تو بھینس کی ہے نہ کہ اس بلایم کیوں مبتلا کرے۔

فدا فی دو قدم بڑھا کر دو قوز کے اور قریب آ گیا۔

فدا فی نے ڈب سے سورج کی روشنی میں جس کی آخری کڑی نہیں بھاڑیوں سے گزر کر وہاں تک پہنچ رہی تھیں، تلوار چمکائی اور کڑک کر بولا:

”بتاؤ تم کون ہو۔ تمہارے ساتھ اور کون ہے۔ بتاؤ ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔“

شہزادی دو قوز نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ فدا فی نے دو قدم اور آگے بڑھا کر تلوار کی نوک شہزادی دو قوز کے سینے پر رکھ دی مگر پھر خود ہی ایک پیچ مار کر لڑکھڑا گیا۔

تقریباً سبھی فدا فی کی پشت میں پیوست ہو چکا تھا۔

فدا فی لڑکھڑاتا ہوا بیٹا۔ تقریباً اس کی زد میں تھی۔ اس نے تلوار کے دار سے بچنے کی کوشش کی مگر فدا فی تلوار اس کے شانے میں گمراہی ڈال کر رہی۔ اس کے شانے سے خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ تقریباً خود کو بہت سنبھالا مگر فدا فی کے بھرپور دار نے اتنا گمراہی ڈال دیا کہ تقریباً وہ ایک پیچ کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ فدا فی پہلے ہی زمین پر گر چکا تھا۔ تقریباً سبھی پشت سے گزر کر اس کے دل تک پہنچ چکا تھا۔

دو قوز بھاگ کر تقریباً کے پاس آئی اور اس کا سر گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ تقریباً غشی ماری ہو رہی تھی۔ اس وقت بہت سے سواروں کے آنے کی آواز آئی۔

شہزادی تقریباً نے زور لگا کر آنکھیں کھولیں اور لرزرتے پیچے میں کہا:

”دو قوز۔ اپنی جان بچاؤ۔ گود سے پر بیٹھ کر بھاگ جاؤ۔“

”اور تم؟“ دو قوز کے آنسو تقریباً کے چہرے پر گرنے لگے۔

”جلدی کرو۔“ تقریباً نے جیسے حکم دیا۔

شہزادی دو قوز نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ سوار قریب پہنچ چکے تھے۔ دو قوز گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ سوار اور قریب آ گئے۔ دو قوز نے گھوڑے کو ایڑی۔ سواروں نے دو قوز خاتون کو گھیر لیا۔ شہزادی دو قوز کا دل ڈوبنے لگا لیکن شہزادی کو گھیرنے والے سوار گھوڑوں سے اتر پڑے۔ انہوں نے شہزادی کے گرد حلقہ بنایا اور مرتبہ لڑکھڑا کر کہنے ہو گئے۔ یہ سب مغل سوار تھے۔

شہزادی کے پرستار چہرے پر اک دم رونق آ گئی۔ پھر نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ وہ گھوڑے سے اتر کر جاڑیوں کی طرف بھاگی۔ تمام سوار اس کے پیچھے تھے۔

دو قوز شہزادی تقریباً کے پاس پہنچی۔ تقریباً بائیں خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ دو قوز نے شہزادی تقریباً کو اٹھانے کا حکم دیا۔ تقریباً نے حال ہو کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

سواروں نے پہلے اس کے زخم پر پیٹی باندھی۔ پھر ایک سوار نے رحمی تقریباً کو اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ دو قوز فدا فیوں کے خطرے سے دور ہو چکی تھی۔ اس کے سوار اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ وہ آزاد غشی گمراہی کا دل شہزادی تقریباً کے بے مثال کردار کا غلام ہو چکا تھا۔

وہ اپنی لشکر گاہ کی طرف جا رہی تھی، لشکر آرا نگہوں کے ساتھ



فدا فیوں کو بیرونی امداد مل سکی۔ قلعہ الموت کو مغل لشکر دو درون تک گھیرے ہوئے تھا۔ قلعہ الموت میں ہزار کے لشکر کے ساتھ فدا فیوں کے چھوٹے قلعوں کو تباہ کر رہا تھا۔ جو فدا فی دستے قلعہ الموت کا رخ کرتے وہ مغلوں کے ہاتھوں پر گرفت ہو جاتے۔

فدا فیوں پر مصیبت تنگ ہو گیا۔ قلعہ الموت پر نفرت کے شعلے والے گولے رات دن برسائے جاتے۔ مغل بڑھتے بڑھتے قلعہ الموت کے سنگین دروازے تک پہنچ گئے۔

اس دروازے کو توڑنا مشکل تھا۔ اس کے آس پاس کی تمام سرنگیں بھی پتھر کی سلوں سے جوڑ دی گئی تھیں۔ دروازے نہ ٹوٹ سکے تو مغلوں نے فیصل پر چڑھنا شروع کر دیا۔

فدا فیوں نے سخت مدافعت کی۔ دن بھر سخت لڑائی ہوئی۔ رات ہوئی تو نہ انہوں نے آقا سے نڈاری کی۔ خواجہ نصیر الدین طوسی نے جان کی امان کے عوض قلعہ کا دروازہ کھولنے کا وعدہ کیا۔ ہلاک خواں نے فوراً خواجہ کو امان دیدی۔ آدھی رات گزرتے ہی قلعہ الموت کا دروازہ کھل گیا۔

مغل فوج قلعہ میں آج نہیں تو کل داخل ہو ہی جاتی مگر مفاد پرست خواجہ طوسی نے آنے والے کا استقبال کیا۔ دروازہ کھلتے ہی مغل بڑی دل کی طرح قلعہ میں داخل ہو گئے۔ خواجہ طوسی نے ہلاک خواں کی شہینا بھیل کی ہناہ گاہ تک رہبری کی۔

شہینا بھیل، خواجہ طوسی کو ہلاک خواں کے ساتھ دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ شہینا بھیل کو گرفتار کر لیا گیا۔

شیخ اجل کے متعلق ہر ذہن میں الگ الگ نقشے اور عظیم تھم گمردہ تو عالم آدمیوں کی طرح تھا۔ لہذا ہزار سالوں تک، چوڑے شانے، آنکھوں میں دوسروں سے زیادہ چمک تھی۔

قلعہ الموت پر موت کے سائے لہرانے لگے۔ مغلوں نے قتل عام شروع کر دیا۔ دودھ قتل و خونبارت کھلی جاتی رہی۔ شیخ اجل نے کئی بار امان کی درخواست کی مگر خواجہ طوسی نے منظور نہ ہونے دی۔ خواجہ جانتا تھا کہ اگر قلعہ کا ایک خدائی بھی زندہ بچ گیا تو وہ خواجہ سے اس ملک حرامی کا بدلہ لے گا۔ ایسے کسی میں مہری (جینی) کے ڈلے گھولے جاتے ہیں۔

تمام خدائیوں کو قتل کر دیا۔ قلعہ سے بچ کر ایک خدائی بھی باہر نہ جاسکا۔

قلعہ کے رہنے والوں میں سوائے شیخ اجل کے اور کوئی مرد فداقت باقی نہ رہا اور اب لوٹ مار کی بارگاہ

ڈاکو ڈپہ ڈاکہ پڑا تھا۔ چھ سو سال سے لوٹا ہوا مال اس قلعہ کے تہ خانوں میں بھرا ہوا تھا۔ مال تمام ہوا۔ حرام رفت، مغلوں نے اس حرام کے مال کو حرام کا مال ہی سمجھ کر لوٹا۔ تہ خانوں کی چابیاں خواجہ طوسی نے پسپائیں اور راستہ بھی دکھایا۔ کہتے ہیں کہ قلعہ کے تہ خانوں سے ہلاکو کو اتنا سونا چاندی ملا کہ جتنا چنگیز خان بھی نہ ملا ہو گا۔

شیخ اجل خورشاد کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی جنت کی ہلاکو خان کو میر کر لے۔

شیخ اجل، چہرہ اسی طرح آگے آگے ہلاکو خان، خواجہ طوسی اور دیگر مغل سردار جنت میں داخل ہوئے۔ راستوں پر زمر کے شکرے بکھرے ہوئے تھے۔ ہلاکو خان اس قدر زمر دیدیکھ کر دنگ رہ گیا۔

خواجہ طوسی ہنسنا اور بولا:

”شاہ ایران تعجب نہ فرمائیں۔ یہ سب نقلی ہیں۔“

خواجہ طوسی نے زمین سے ایک زمر کا ٹکڑا اٹھا کر ہلاکو خان کو دکھایا۔ واقعی وہ پتھر تھا لیکن نہایت خوبصورتی سے رنگا گیا تھا۔

”یہاں کی ہر چیز نقلی ہے۔“ خواجہ طوسی نے بتایا۔

”پھر جنت میں آنے والے دھوکہ کیونکر کھاتے تھے؟“ ہلاکو نے دلچسپی سے پوچھا۔

”حنیش کا نشہ انہیں سوچنے سمجھنے کب دیتا تھا؟“ خواجہ نے ہلاکو خان کو سنجایا:

”یہ درخت، یہ پھل، یہ پرندے سب نقلی ہیں۔“

”اور یہ دودھ کی نہریں۔ کیا یہ سفید پانی ہے؟“ ہلاکو کو جیسے خواجہ طوسی کی باتوں پر شبہ ہوا۔

خود نہریں اٹھڑال کر دیکھی حیرہ پانی نہیں بلکہ واقعی دودھ تھا۔

”یہ واقعی دودھ ہے شاہ ایران؟“ خواجہ طوسی نے کہا:

”قلعہ میں ایک پختہ حوض ہے۔ حوض سے ایک سرنگ باہر کی طرف جاتی ہے، باہر ایک کنواں تعمیر کیا ہے۔ خدائی اس کنوئیں تک دور دور سے دودھ اکٹھا کر کے لاتے ہیں۔ دودھ کنوئیں میں اندھا ہے۔ ہلاکو کے ذریعے حوض تک پہنچتا ہے اور حوض سے نہریں جاری ہوتی ہیں۔ دودھ کو میٹھا کرنے کے لیے اس میں مہری (جینی) کے ڈلے گھولے جاتے ہیں۔“

ہلاکو خان مغلوں کے چلتے ہوئے درو دیوار کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

ان درو دیوار پر طبع سازی کی کنگہ ہے میرے آقا۔“ خواجہ طوسی نے بتایا۔

پھر خواجہ طوسی، ہلاکو خان کو اس مینار کے پاس لے گیا جس میں بیٹھ کر وہ ستاروں کی چابلیں دیکھتا تھا۔

یہ ہلاکو خان کو اپنی تجربہ گاہ بھی دکھائی۔ اس نے شنیشی سے ایک سفوف فرش پر ڈالا۔ پھر دوسری شنیشی سے

ایک سفوف بیچے سفوف پر بچھ کر کا۔ فوراً آگ لگ گئی اور ایک شعلہ بلند ہوا۔

یہ بار دہا تھا لیکن خواجہ طوسی کے تجربے سے پہلے ہی بارو کی ایکاد ہو چکی تھی۔ جینی نہ صرف بارود سے

متھے بلکہ وہ اسے استعمال بھی کر رہے تھے۔

ہلاکو خان نے حکم دیا کہ مینار توڑ دیا جائے۔

خواجہ طوسی دم خود رہ گیا۔

مینار دم کے دم میں مسمار کر دیا گیا۔

ہلاکو خان نے دوسرا حکم دیا اور خواجہ طوسی کی تجربہ گاہ کو زمرہ نشق کر دیا گیا۔ اس کی تمام کتابیں خاکستر

ہو گئیں۔ دم نہ مارا۔ کتابوں سے شعلہ بلند ہوتے تو ہلاکو قہقہے لگاتا۔

ہلاکو خان نے خواجہ طوسی کے کانڈھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

”خواجہ! ہم ان تمام چیزوں کو ختم کر دینا چاہتے ہیں جن کے زور پر تو شیخ اجل پر حاوی تھا۔ ہم تیری

خفیہ کیلئے ہیں درنہ تو قابل اعتماد آدمی نہیں ہے۔ تو اپنے نامک کا نہ ہوا تو قراقرم کے ایک خاں کا

اور بے گناہ۔“

خواجہ نے مذمت سے نظریں نیچی کر لیں۔

”بلکہ ناقان مگو خان نے تجھے قراقرم ملایا ہے۔ ہم تجھے اپنے ساتھ رکھیں گے۔ تیری عقل سے نام نہ اٹھائیں

اور بعد ازاں کی ذبح کے بعد قراقرم بھیج دیں گے۔“

ہلاکو خان کھٹار اور خواجہ طوسی سر جھکا لے سنڈارا۔

قلعہ الموت میں تیرہ ہزار عورتیں موجود تھیں۔ تین ہزار کنوئیں اور دس ہزار جنت کی خور۔ ہلاکو خان

اب وہ ملکہ ایران و فارس تھی۔ اس کی بادشاہت کی سرحدیں مشرق میں برصغیر پاک و ہند و جنوب میں ہلاکھل کی وحشیانہ حرکتیں رات بھر دیکھتی رہتیں۔ بعد مجبوری ہلاکھل اس صورت کے ساتھ

ایسی کمزور حرکتیں کرتا کہ شرم بھی اپنا منہ چھپا لیتی۔

بصحنہ چڑھے ایرانی موسیقی کی مدھنناؤں سے ہلاکو خاں کو سیدار کیلجانا۔ ہلاکو دہاں سے اٹھ کر پہنچ جاتا۔ منہ ہاتھ دھونا اور غسل کرنا شاید جنگیری یا سا (دستور) میں درج نہ تھا۔ دربار میں مضبوطی کا حکم اس کے سردار اس کے منظر ہوتے۔ ہلاکو میں نائنت نہ کرتا گند سے ہاتھ نہ لیتی چادروں اور قالین پر سات کرتار پھر قہقہے لگا کر ان قصیدوں کی داد دیتا جو شاعر اک کی شان میں پڑھتے اور جن کا ایک لفظ غلام وہ قاصر تھا۔

ہلاکو خاں نے قلعہ الموت کی فتح کی خبر خاقان منگو خاں کو قراقرم بھجوائی۔ خبر لے جانے والوں ہلاکو خاں نے شہنشاہ جیش شیخ الجبل خورشاہ کو بھی قراقرم روانہ کیا۔ خاقان کو قلعے کی فتح کی خبر کسی اور پہلے ہی مل گئی تھی۔ اس کا مقصد ہلاکو خاں کے پاس یہ فرمان لے کر آ رہا تھا کہ فوراً بغداد کا رخ کیا جائے شیخ الجبل کو قراقرم بھیجنے کے بجائے مقتدر کو دیا جائے اور اس کا خون زمین پر نہ گرنے پائے۔ مغول کا خیال کسی بادشاہ کا خون زمین پر گرے تو اس سے آسمان کی ٹولہ در (روحیں) ناراض ہو جاتی ہیں۔

شیخ الجبل کے گلے میں پھندا ڈال کر موت کی نیند سلا دیا گیا۔

فاطمی شمس الدین قزوینی کی آرزو پوری ہو گئی لیکن ہلاکو خاں عالم اسلام اور خصوصاً دارالاسلام جس روپ میں ظاہر ہوا وہ شیخ الجبل سے بھی زیادہ خوفناک اور خطرناک ثابت ہوا۔ ایک ساپ مارا گیا اور بغداد کو ڈسنے کے لیے لہرانے لگے۔



فتح کے اس جشن میں ہلاکو خاں یا شہزادی دو توڑ کو شہزادی قمر کی ایک لمحے کے لیے بھی یاد نہ تھی جس تلوار سے زخمی ہوئی تھی وہ زہر آلود تھی۔ معقول علاج معالجہ نہ ہونے کی وجہ سے۔ ہر جگہ کے خون میں پھیلے لگا۔ اس کا زخم خراب ہو گیا۔ خون زیادہ بہ جانے کی وجہ سے وہ پیسے ہی نہ تھا تو اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور ہو گئی۔ اس کی خدمت پر مامور صرف دو لونڈیاں تھیں۔ شہزادی کی کمزوری بڑھ گئی کہ اب دن کے بیشتر وقت میں اس پر غشی طاری رہتی۔

شہزادی قمر کی خوش نصیبی سے اس کی لونڈیوں میں سے ایک بیمار ہو گئی۔ اسے مغلہ واک کے گیا۔ اس کی جگہ دوسری لونڈی بھیجی گئی۔ اس لونڈی کا تعلق شہزادی کی ریاست قفقاز سے تھا۔ شہزادی

صورت سے اسے فوراً پہچان لیا۔

شہزادی نے اس سے اس کے وطن کا نام پوچھا۔ لونڈی نے شرم کی وجہ سے قفقاز کے بجائے کوئی اور نام بتایا۔ قفقاز کی عورتیں غلامی کو بہت بری لعنت سمجھتی تھیں۔ شہزادی نے اسے تسلی دی اور جب یہ بتایا کہ وہ ملکہ روسودان کی بیٹی شہزادی قمر ہے تو لونڈی اس کے پیروں سے لپٹ کر بہت رونے لگی۔

شہزادی قمر اپنے وطن کی ایک عورت سے مل کر اس قدر خوش ہوئی کہ اس کے ناتواں جسم میں جیسے پھر سے جان آگئی۔ اس نے لونڈی سے کہا:

”مجھے پکڑ کر تیکوں کے سہارے بٹھا دو۔“

لونڈی نے شہزادی کو بٹھا دیا۔

شہزادی زخم کی تکلیف کو جیسے بھول گئی۔ اس نے لونڈی سے پوچھا:

”میری بہن اب بتاؤ کہ میری ماں کے مرنے کے بعد میری ریاست پر کیا گزری اور وہاں کا اب کیا حال ہے۔“

اس سوال پر لونڈی کے پھر آنسو نکل آئے۔ اس نے روتے ہوئے بتایا:

”ملکہ روسودان کی خودکشی کے بعد قفقاز والوں نے ہتھیار ڈال دیے بکسیوں کو کہنا چاہیے کہ ہمارے تباہ باپ کی قبر پر گئے۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں ماتم نہ ہوا ہو۔ اگر جہتانی جوان جو بچ گئے۔ انہوں نے گھائیوں میں چھپ کر اپنی جان بچائی۔ پھر مغل فوجیں واپس چلی گئیں اور اپنے ساتھ ملکہ کی لاش بھی لے گئیں۔“

شہزادی نے چونک کر پوچھا:

”مغل میری ماں کی لاش کہاں لے گئے؟“

”مسلحہ کہہ باتو خاں نے لاش منگوالی اور اپنے شہر میں دفن کر کے مقبرہ بنا دیا۔ لونڈی کی ہچکچاہٹ بڑھ گئی۔“

”افسوس کہ میری بہن کو اپنی ریاست میں دفن ہونا بھی نصیب نہ ہوا۔ شہزادی قمر کو زخم میں ٹیس سی محسوس ہونے لگی مگر اس نے ضبط سے کام لیا اور پوچھا:

”ہاں میں اس کے بعد قفقاز پر کیا گزری۔ مجھے جلد بتا دو۔ شاید میں زیادہ دن زندہ نہ رہ سکوں اور تم سے پھر باتیں نہ ہو سکیں۔“

لونڈی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا:

”پھر قفقاز کو آزاد کر دیا گیا اور شاہ جیشوں کو قفقاز کا بادشاہ بنا دیا گیا۔“

”جیٹوں: شہزادی نے تعجب سے پوچھا:

”یہ جیٹوں کون ہے؟“

”مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں، لونڈی نے بتایا:

”لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ آپ کے خاندان کا ایک شہزادہ جیٹوں موصل میں موجود ہے تو لوڈے کے گرجے کا ایک وفد وہاں گیا۔ موصل کا نیا جزل بائڈ (بائیڈو خان) قراقرم کے خاقان کا ماتحت ہے۔ اس نے جیٹوں ہمارے گرجستان یوں کے حوالے کر دیا۔ لوڈے لوگوں نے اس سے پوچھ گچھ کی اور جب یہ اطمینان ہو گیا کہ جیٹوں واقعی شاہی خاندان سے ہے تو اسے قفقاز کا بادشاہ بنا دیا۔“

شہزادی اس طرح سے میں اپنے دماغ پر زور دے کر جیٹوں کے منتقلی سوچتی رہی تھی۔ آخر اسے اس کی ماں اکثر لکھنا کرتی تھی کہ میری ایک بہن، باپ سے خفا ہو کر میرے اپنے بچوں کے موصل چلی گئی تھی۔

شہزادی نے کہا:

”میں مجھے یاد آگیا۔ ہمارے خاندان کے کچھ لوگ موصل میں آباد ہو گئے تھے۔ جیٹوں مزدور میراٹ ہو گئے۔ شکر ہے کہ قفقاز پر شاہی خاندان کا ہی ایک شہزادہ حاکم ہے۔“
”مگر حکومت کی حقدار تو آپ ہیں۔“ لونڈی جذباتی انداز میں بولی:
”میں آپ کو قفقاز لے چلوں گی۔ مگر جتنا آپ کو اپنے سر پر بٹھائیں گے۔“
”وہ وقت گزر چکا ہے بہن۔ شہزادی نے یہی کہنی ہنسی سنتے ہوئے کہا:
”میں چند دن کی اوجھان ہوں۔ مرنے سے پہلے ایک بار بادشاہ جیٹوں سے ملنے کی ضرورت آ رہی ہے۔“
اگر یہ آرزو پوری ہو جائے تو میں سکون سے جان دے سکوں گی۔“

لونڈی نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے اور بولی:

”شہزادی صاحبہ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی یہ آرزو میں پوری کراؤں گی۔“

”تم.... مگر تم تو خود مجبور ہو! شہزادی نے حیرت سے کہا۔“

”یہ ٹھیک ہے کہ میں اس وقت لونڈی ہوں مگر جلد ہی آزاد ہو جاؤں گی۔ میں نے سنا ہے کہ شہزادہ جیٹوں دن میں ہلاکو خان کے پاس آنے والا ہے۔“

پھر لونڈی نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے کہا:

”اور ہمیں ہلاکو کے سردار قلا بونا کے دستوں نے زبردستی ہمارے علاقے سے کچھ کر لونڈی بنایا ہے۔“
”نئے بغداد پر حملے کے لیے گرجستانی دستے منگوا لئے ہیں۔ شاہ جیٹوں کو ہمارے کپڑے جلانے کی خبر ہو چکی ہے۔“

اپنے دوستوں کے ساتھ آ رہا ہے۔ اس کے آتے ہی ہم سب آزاد ہو جائیں گے۔“

شہزادی کے لفظ سے لونڈی کے چہرے پر روشنی آ گئی: اس نے کہا:

”میں شاہ جیٹوں سے ملوں گی۔ وہ نیک بادشاہ ہے۔“

”کاش ایسا ہو سکے۔“ شہزادی نے کہا۔

اب اس کا زخم چرّا اٹھا تھا۔ لونڈی نے اسے آرام سے لٹا دیا اور شہزادی کے زخم کے لیے تازہ مرہم

لونڈی کی دیکھ بھال سے شہزادی کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ لونڈی دن بھر شہزادی کا دل بھلانے کے لیے قفقاز کی باتیں کرتی رہتی۔ شہزادی کو سہارا مل گیا اور شدید تنہائی کا جان بوا کر دور ہو گیا۔



ہلاکو خان نے قلعہ الموت کی فتح کے بعد جنوب مغربی سرحد کے سالار بائڈو خان (جزل بائڈو) کو حکم بھیجا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مغل لشکر میں آکر شامل ہو جائے۔ اسے یہ بھی حکم دیا گیا کہ قفقاز کے شاہ جیٹوں کو بھی اس کے لشکر کے لیتا آئے۔

چارمخاں کے بعد بائڈو خان قراقرم کی طرف سے جنوب مغربی سرحد کا سالار مقرر ہوا تھا۔ اس کا مستقر موصل تھا۔ ہلاکو خان کے حکم کے تحت بائڈو خان موصل سے روانہ ہوا۔ شاہ جیٹوں چونکہ مغلوں کا حلیف تھا اس لیے وہ بھی اپنے دوستوں کو لے کر بائڈو خان کے ساتھ ہوا۔

ہلاکو خان کے قبضے میں اس وقت فارس، ایران اور عراق عجم کا بڑا طول طویل علاقہ آگیا تھا لیکن اس نے اس پر صبر نہ کیا۔ ملک گیری کی ہوس اس پر سوار رہی۔ وہ چپکے چپکے ایک بڑی سیکم بنا رہا تھا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ ہلاکو خان بغداد پر حملہ کرے گا لیکن جب اس کے سامنے بغداد کا نام آتا تو وہ ہنس کر مٹا جاتا اور بالکل دلچسپی کا اظہار نہ کرتا بلکہ اس کی جنگی تیاریاں زور دینا چاہتا تھا۔ موصل سے بائڈو خان کا مدد فوجی دستوں کے آگے گرجستان یوں کی فوج کو بلایا جاتا۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں جو کسی ہم کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

پہلے لوگوں کو گمان ہوا کہ شاہ ہلاکو خان بردہ خیر یار کے ہند پر حملہ کرے گا لیکن اس کے ہرا دل دستوں کو نصیر الدین شمشاد ہند کے لشکر کے ہاتھوں لاہور کے قریب ایسی مار پڑی تھی کہ مغل فوجی اور ہلاکو خان ادھر کا رخ کرنے کی ہمت بھی نہ کر سکتے تھے۔

بائیڈو خاں مغل اردو لشکر میں پہنچا تو ہلاکوخاں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہلاکوخاں، بائیڈو خاں نہ کرتا تھا کیونکہ بائیڈو خاں، خاقان قزاقم کا نوکر تھا اور ہلاکو قزاقم کے جوئے کو اپنے سر سے اتار بیٹھتا تھا۔ ہلاکو کے پاس اب خاقان سے بھی بڑا علاقہ موجود تھا۔ اسے یہ پسند نہ تھا کہ بائیڈو خاں اس کے علاقے قزاقم کا دم بھرتا ہے لیکن ہلاکوخاں نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے بائیڈو خاں کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اس خطے سے پوری طرح واقف تھا اور ہلاکوخاں اس کی اس واقعیت سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

ہلاکوخاں نے شاہ قفقاز حیثیوں کی بھی بہت پزیرائی کی۔ قفقاز کا علاقہ اس کی اور باتوخاں کی سرحد پر ہلاکوخاں گرجستانیوں کو اپنا دوست بنانا چاہتا تھا تا کہ ضرورت کے وقت باتوخاں کے خلاف گرجستانیوں کا کام لیا جاسکے۔

چنانچہ جب شاہ حیثیوں نے گرجستانی خواتین کی بے حرمتی اور گرفتاری کی ہلاکوخاں سے شکایت کی تو انہوں نے قذو بونا کے ان دستوں کو سرزنش کی جنہوں نے یہ حرکت کی تھی۔ پھر اس نے تمام گرجستانی عورتوں کو روبا کا فوری حکم صادر کیا۔

رہائی پانے والی ان عورتوں میں شہزادی تھرو کی خدمت کرنے والی لونڈی بھی تھی۔ اس نے شاہ قفقاز کو مل کر شہزادی تھرو کے پورے حالات سے آگاہ کیا۔ شاہ حیثیوں کے دل میں عکس درمکس ودان اور اس کی بیٹی کی عزت تھی۔ وہ ان ماں بیٹی کی ملکی اور قومی خدمات کا ذکر لوگوں سے سن چکا تھا۔

دوسرے دن بھر سے دربار میں شاہ حیثیوں نے ہلاکوخاں سے شہزادی تھرو کا ذکر پھیرا۔ اور اس نے ملنے کی خواہش کی۔

ہلاکوخاں اپنی فتح کے نشے میں شہزادی تھرو کو بھول گیا تھا۔ شہزادی دو قوز کو شہزادی تھرو کا انصرنا آتا لیکن اب.... عکس ایران کا تاج اس کے سر پر تھا۔ مکہ کے وقار کے خلاف تھا کہ وہ کسی بیماری کے مزاج کے لیے چل کر جائے احسان فراموشی مغل و حیثیوں کی سرشت میں داخل تھی۔ دو قوز بھی مغل شہزادی تھی۔ احسان فراموشی کا مظاہرہ کیوں نہ کرتی۔

شاہ حیثیوں کو شہزادی تھرو سے ملنے کی فوراً اجازت دے دیا گئی۔ شاہ حیثیوں اپنے چند سرداروں ساتھ شہزادی تھرو سے ملنے گیا۔

شہزادی کو شاہ حیثیوں کی آمد کی خبر کر دی گئی تھی۔ شہزادی اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اپنی یہ حسرت پوری نہ کر سکی۔ اس کی حالت اتنی بگڑ چکی تھی کہ جب شاہ حیثیوں اس کے پاس پہنچا تو اس میں آنکھوں کو لے کی بھی طاقت نہ تھی۔

شاہ حیثیوں نے شہزادی تھرو کے سامنے پہنچ کر اپنے سر سے تاج اتارا اور اس کے پیروں میں رکھ دیا۔ شہزادی پر فشتی طاری تھی۔ شاہ حیثیوں سر جھکانے اس کی پائنتی کے پاس کھڑا تھا۔

شہزادی کی وہ گرجستانی لونڈی جو اب آزاد ہو کر شاہ حیثیوں کے ساتھ آئی تھی، وہ آگے بڑھ کر شہزادی کے بستر کے پاس گئی اور منہ شہزادی کے کان کے پاس لے جا کر کہا:

”شہزادی آنکھیں کھولو۔ شاہ حیثیوں تم سے ملنے آئے ہیں۔“

لونڈی نے وقفہ وقفہ سے کئی بار شہزادی کے کان میں یہ الفاظ کہے۔

شاہ حیثیوں کی نظریں شہزادی تھرو کے زرد چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ آنکھوں میں آئے ہوئے اشکوں کو ڈی خشک سے روک رہا تھا۔ پھر شہزادی کی پلوں میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔

شاہ حیثیوں شہزادی کے بستر سے الگ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا:

”شہزادی صاحبہ، ملک دو قوم کو آپ پر ناز ہے۔ میں آپ کا غلام ہوں۔ میرے ساتھ قفقاز چلیے۔ پوری گرجستانی قوم آپ کو سر آنکھوں پر بیٹھائے گی۔“

شہزادی کے خشک ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔ اس نے خیف آواز میں کہا:

”حیثیوں! قفقاز کا تاج تمہیں مبارک ہو۔ اپنی قوم کا ہمیشہ خیال رکھنا....“ پھر شہزادی کی آواز لرزنے لگی مگر سانس بھی چل رہی تھی۔

سب کی آنکھیں اشک برسانے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد شہزادی کے ہونٹوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ بولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شہزادی تھرو جو جسم سے جان گھٹ کر ہونٹوں پر لا رہی ہے۔

حیثیوں شہزادی پر جھک گیا۔ شہزادی نے کہا:

”حیثیوں! مغلوں کو دوست نہ گھبنا۔ باتوخاں سے بدلہ لینا!

باتوخاں مرچکا ہے شہزادی! حیثیوں نے اسے خوشخبری سنائی۔

شہزادی کے چہرے پر چمک سی پیدا ہوئی۔ سورج کی ڈویتی کہ نون کی طرح۔ اس نے بے حد خیف لیے میں کہا:

”شاہ حیثیوں! تم نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ ایک اور آرزو ہے۔“

شاہ حیثیوں نے کان شہزادی کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیا۔

شہزادی تھرو نے ایک ایک کر کہا:

”میری آخری آرزو۔ مجھے قفقاز کی پختہ چوٹی نصب کر دینا۔“
پھر شہزادی قمر کی آواز ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔ اس کا سراپا ملک ڈھل گیا۔
شہزادی قمر کی لاش قفقاز کے جا کر نصب کی چوٹی پر دفن کی گئی۔ جینڈن نے شہزادی کی آواز
آرزو پوری کر دی۔

④ بغداد کی تباہی

ہلاکو خان نے مرانہ پہنچ کر اپنے لشکر کو از سر نو تشکیل دینا شروع کیا۔ وہ مرانہ میں تھا مگر اس کی نظر
دارالاسلام بغداد پر لگی تھیں۔

دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر پھر سلجوقیہ مشغول کی دوشنی سے جنگ کر رہا تھا، اذان مغرب کو ابھی زیادہ
دیر نہ گزری تھی۔
قصر کے مشرقی دروازے کے سامنے والی بڑی راہداری میں مویلا الدین بن علقمی بڑے جھینکے سے ٹپ
رہا تھا۔ وہ بار بار مگر دروازے کی طرف دیکھتا، شاید اسے کسی کا انتظار تھا۔
خلافت عباسیہ کا یہ وزیر اعظم اپنی حق و فراست کے لیے تمام بغداد میں مشہور تھا۔ مگر اس کی ذہانت اور ذکاوت
فرد پرستی اور ذاتی بغاوت کی جھینٹ چڑھ گئی تھی۔ بربریت کا منہ اتر رہا، ہلاکو خان کی شکل اختیار کر کے مرانہ میں
بیٹھا اپنے دانت تیز کر رہا تھا۔ لیکن ابن علقمی کو عملاتی سازشوں سے فرصت نہ تھی۔ امیروں، وزیروں کی تقرری اور
سرداروں کے مشغلے تھے۔

ابن علقمی نے عباسی خلیفہ مستعصم کے گرد جاسوسوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ یوں بھی خلیفہ اپنی کمزور طبیعت و
غرور کی وجہ سے ابن علقمی کا دست نکل رہا تھا۔ ابن علقمی نے اپنی مقصد براری کے لیے خلیفہ وقت کو شراب و شباب
کا چمکھ ڈال دیا تھا۔ عظیم خلافت میں ہر وقت سرور و فخر کی محفلیں گرم رہتیں۔ حسین و جمیل کنیزیں، زرق برق
لباس میں خلیفہ پر اپروانوں کی طرح منڈلاتی رہتیں۔

ایسی ہی کنیزوں میں ایک کنیز جرثیمہ تھی جس کا انتظار وزیر حکومت ابن علقمی کر رہا تھا۔
جرثیمہ اپنے جسم میں لاثانی تھی۔ وہ کون تھی اور کہاں سے آئی تھی؟ اس کا کسی کو علم نہ تھا اور نہ کسی کو جاننے
کا ضرورت تھی۔ وہ تو صرف یہ جانتے تھے کہ جرثیمہ کو ابن علقمی نے دوسری حسین کنیزوں کی طرح جہلم خلافت میں داخل

جراثیم نے ابنِ علقمی کو راہداری میں دیکھا تو رومال چہرے سے ہٹا دیا۔ اس کے حسن کی ملک نے راہداری کی غلوں کو جھلکا دیا جیسے بجلی کا جھکا کا ہو جائے۔

ابنِ علقمی راہداری کی آخری میٹھی پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جراثیم نے اپنا مریں ہاتھ اس کے قدمیں دے دیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے ابنِ علقمی کا ہاتھ کانپ رہا ہو۔ اس نے ابنِ علقمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا:

”غیب و شہنشاہ حضور کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“

ابنِ علقمی واقعی گھرایا ہوا تھا۔ جراثیم ہمیشہ لہنت شب کے بعد آتی تھی اور اس وقت خلاف توقع وہ غروبِ آفتاب کے بعد آتی تھی۔ ابنِ علقمی اسی وجہ سے پریشان تھا۔ ملک و قوم کے اندر ہمیشہ بزدل ہی ہوا کرتے ہیں۔ ابنِ علقمی خود کو سمجھتا تھا۔ وہ جراثیم پر اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ابنِ علقمی نے جراثیم کا ہاتھ اپنی طرف کھینچے ہوئے کہا:

”میں تو ٹھیک ہوں مگر دل ضرور بے چین ہے۔“

ابنِ علقمی نے بڑے جھوٹے انداز میں اپنی بخت جتانے کی کوشش کی۔ جراثیم شاید سمجھتا تھی۔ اس نے مہربانی سے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

راہداری سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جراثیم نے پوچھا:

”آپ کو میرے آنے کی خبر کیسے ہوئی؟“

”دل کو دل سے راہ ہوتی ہے جراثیم۔“ ابنِ علقمی کی طرف سے جھوٹی محبت کا یہ بھرپور اظہار تھا۔... پھر اس نے بتایا:

”میں بے مقصد بالائی منزل پر ٹپس رہتا تھا کہ اتفاقاً میری نظر دریا کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں تمہاری کشتی کنارے سے لگ رہی تھی۔ بس میں تمہیں لینے بیٹھے پہنچ گیا۔“

جراثیم کے دل کو کچھ اطمینان نہ ہوا۔ اس نے کہا:

”دریا کے کنارے بڑا اندھیرا تھا۔ آپ نے اتنی دور سے میری کشتی کیسے دیکھ لی؟“

ابنِ علقمی ایک دریں مسند کے سارے بیٹھ گیا اور جراثیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

”بولی جراثیم۔ تمہاری کشتی میں ایک فانوس کا مشعل ہے۔ جب تمہاری کشتی چلتی ہے تو مشعل روشن ہو کر رہتی ہے اور اس طرح ساحل والوں کو تمہاری آمد کا پتہ لگ جاتا ہے۔ روشن مشعل دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ تم آ رہی ہو۔“

گوایا ہے جراثیم کا حسن، نصر خلافت کے آسمان پر ماہِ موزون کی چمک چمک حسن کی چمک مک کے سامنے دوسری کینڑوں اور بیگمات شاہی کا حسن ستاروں کی طرح پھیکا پڑ گیا۔

مگر جراثیم اپنے خاک ابنِ علقمی کی وفادار تھی۔ بظاہر اسے فقرِ خداوندی غلیف مستعقم کے پردے پہننے کا غرض حاصل تھا لیکن اس کا اصل کام ابنِ علقمی کے لیے جاسوسی کرنا اور سنا (اہم باتوں کی خبر) ابنِ علقمی کے پاس پہنچانا تھا۔ ابنِ علقمی نے جراثیم کو نہ صرف اس عظیم مرتبے تک پہنچایا تھا بلکہ اپنی بیگم بنانے کا سبز باغ بھی دکھایا تھا۔ جراثیم بڑی وفاداری سے خدمت انجام دے رہی تھی۔ وہ دن بھر کے اہم واقعات اپنے ذہن پر نقش کرتی رہتی اور نصف شب گزرنے کے بعد فقرِ سلجوتیہ پہنچ کر ابنِ علقمی کو آگاہ کرتی۔

حکیم خلافت اور فقرِ سلجوتیہ جس میں ابنِ علقمی عارضی طور پر رہائش پذیر تھا، کے درمیان دریلے دریلے حائل تھا۔ جراثیم خلافت یعنی خلیفہ مستعقم کا عملدریا کے مشرقی کنارے پر اور فقرِ سلجوتیہ مغربی کنارے پر واقع تھا۔ دریا پر کشتیوں کا مرن ایک پل تھا جو مشرق و مغرب کی آمد و رفت کا واحد ذریعہ تھا۔

جراثیم، سرِ قیامت اور شہنشاہی ملک کی بہت سی جانبِ نظر عورت تھی۔ وہ اپنے کچھ ہونے ابردار و راہداری آنکھوں کو جب گردشِ دیتی تو دل والوں کی دینا زبرد زبرد ہو جاتی۔

خلیفہ مستعقم نے اسے اپنے عمل ”فقرِ جعفر“ کا ناظم بنایا تھا۔ جراثیم کے حکم کے بغیر عمل کا پتہ تک نہ ملتا تھا۔ بیگمات ملک کو اپنے ملک کے لیے جراثیم کا منہ دیکھنا پڑتا۔ ولی مہندزادہ ولیکر اور شہزادہ عبدالرحمن دونوں جراثیم کی نگاہِ ناز کے گھائل تھے۔

جراثیم نے وجہ کے مغربی کنارے پر کشتی سے باہر قدم رکھا۔ اس کا چہرہ سولے چمکدار اور روشن آنکھوں کے ایک سیاہ دھال سے پوشیدہ تھا۔ جراثیم ہمیشہ کشتی کے ذریعے آتی جاتی تھی۔ ابنِ علقمی نے اس کے لیے ایک کشتی مخصوص کرادی تھی جو ساحل و وجہ کے اس جانب ہر وقت تیار رکھتی رہتی جس جانب جراثیم موجود ہوتی۔ کشتیوں کے بل کی گزرگاہ جراثیم کے لیے مخصوص تھی۔ جراثیم بڑی پوسٹنیدگی سے ہر رات ملنے آتی اور صبح ہونے تک ابنِ علقمی کے شہنشاہ کو رونق بخشتی۔

ابنِ علقمی کے پہرے دار جراثیم کے دائیں بائیں چلتے ہوئے اسے راہداری تک لے آئے پھر خاموشی سے واپس چلے گئے۔

ابن علقمی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

حرم خلافت میں کیا ہوا؟

جراثیم کیوں آئی؟

یہ باتیں معلوم کرنے کے لیے وہ بے چین تھا لیکن جراثیم اُدھر آتی ہی نہ تھی اور ابن علقمی خود اس سے پرہیز میں سکی محسوس کر رہا تھا۔

جراثیم نے مزید کوئی سوال نہ کیا وہ خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔ شاید وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اس قدر شاذ و اعیار انسان سے یہ کس طرح امید کی جاتی ہے کہ وہ جراثیم جیسی کینز کو اپنی بیگم بنائے گا۔
تنگ آکر ابن علقمی کو سوال کرنا پڑا:

"بارگاہ خلافت میں ایسی کیا بات ہوئی کہ تمہیں اتنی جلدی آنے کی ضرورت پیش آگئی؟"

جراثیم واقعی ابن علقمی کے ہی بارے میں سوچ رہی تھی اسے یہ سوال بڑا غلط اور بے موقع لگا۔ اس نے منہ بنا کر جواب دیا:

"آپ کو میرا جلد آگیا گوارا گزارا ہوتا میں واپس چلی جاؤں۔"

جراثیم کے لیے میں بھی تھی۔ کسک تھی۔

"نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔" ابن علقمی نے اپنے دھڑکنے والے دل کو دیا:

"میں نے تو بس یونہی پوچھ لیا۔ اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔"

جراثیم کو ابن علقمی کا یہ جواب بھی کچھ بچا نہیں۔ اسے اپنے حسن پر بھی بجا طور پر غور تھا۔ اس کا حسن ایسا نہ تھا کہ دیکھنے والے کو سحرزدہ نہ بنادے۔ وہ حسن شہزادے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالتا وہ اسے بخوشی اپنے حرم میں داخل کرنے میں غر محسوس کرتا لیکن وہ چالیس سالہ وزیراعظم کے ساتھ اس لیے لگی تھی کہ اس نے اسے اپنی بیگم بنانے کا فریب دیا تھا اور یہ بھی کتا تھا کہ اگر وہ خلیفہ ہو گیا تو جراثیم حکم بغداد ہو جائے گی۔ یہ تمام باتیں جراثیم کے دل کے گوشوں سے نکل کر اس کے تصور میں گھومتی گئیں۔

بڑی دیر تک دونوں خاموش اپنے اپنے خیالوں میں کھٹے رہے۔ ابن علقمی نے خود سے کوئی سوال کیا نہ نہ سمجھا اور جراثیم کو ابن علقمی کی کچھ باتیں اور مدد سے یاد آ رہے تھے جن پر باؤسی بھاری تھی۔

تقریباً چھ ماہ کی کینزوں اور غلاموں نے حسب دستور اپنا کام شروع کر دیا۔ ہر رات اسی طرح شراب و شراب کی عقل اس محل میں سجتی تھی۔ یہی محل کیا، ایسی عقلیں ہر محل اور ہر رئیس کے یہاں منعقد ہوتیں۔ شراب اسلام میں حرام ہے لیکن بعض خلفاء اور شاہوں کی فرمائش پر علماء غمخوئے سے پہلے بنیاد (تذی) کو جائز قرار دیا اور پھر رفتہ رفتہ

شراب نے نینک بگھنے لے لی اور اس کا استعمال خاص و عام میں ماک ہو گیا۔

ابن علقمی کی مسند کے سامنے ایک چھوٹی میز پر جس کے پائے چاندی کے تھے۔ ساغر و مینا سجادیے گئے۔

شراب اس کے پہلو میں موجود تھا۔ کمرے کی کھڑکیوں پر زربفت اور کتبائے کتبے ہوئے پودے کھول دیے گئے۔ کینز و غلام رخصت ہو گئے اور ہر پہر ہلکے لگے۔

جراثیم نے اپنی قدرتی غمور آنکھیں اٹھا کر ابن علقمی کو دیکھا۔ ابن علقمی جراثیم کے بوقت آنے کا سبب معلوم

کرنے کے لیے بے چین تھا۔ پھر اس نے جراثیم کا دل رکھنے کے لیے مسکو اگر ساغر و مینا کی طرف اشارہ کیا۔

جراثیم جو کسی حد تک خود پر قابو پا چکی تھی اس نے شراب کمن کا جھجکا ابن علقمی کو دیا اور بولی:

"آپ میرے اس وقت کے آنے سے یقیناً پریشان ہوں گے۔"

یہ کہہ کر جراثیم نے ابن علقمی کی طرف دیکھا۔

"میں تمہاری موجودگی میں کسی پریشانی کو اپنے پاس پھینکنے نہیں دیتا۔" ابن علقمی نے انتہائی چالاکी سے جراثیم کو

اپنی شدید محبت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

"میں خلیفہ عزم کے پائے مبارک داب رہی تھی۔ جراثیم نے رک رک کر کنا شروع کیا۔

ابن علقمی کا پیر ملا جام اس کے منہ کے قریب جلتے ہوئے رک گیا۔ اس نے غور سے جراثیم کو دیکھا۔

"پھر کیا ہوا؟" ابن علقمی کا ہاتھ کا پنا اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

"امیر مرابی، خلیفہ سے ملنے کا خواہش مند ہے۔" جراثیم نے بتایا۔

ابن علقمی کا منہ سرخ ہو گیا۔ وہ تذبذب میں مبتلا:

"مگر اسے خلیفہ سے ملنے کی جرات کیسے ہوئی۔ اسے تو میں نے معزول کر کے بغداد سے نکلوا دیا تھا۔"

"امیر مرابی کے ساتھ سپہ سالار امیر دیودار، امیر نور الدین اور امیر مدید الدین بھی آئے ہیں۔"

دو آتش کا سا غرا بن علقمی کے ہاتھ سے چوٹ گیا اور ایک چٹکنے کے ساتھ زمین پر گر کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔

وہ منہ سے ٹھٹھے ہو کر عالم اضطراب میں ٹپٹنے لگا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔" جراثیم نے اسے تسلی دی:

"خلیفہ نے کہہ دیا ہے کہ ان لوگوں سے صرف وزیراعظم ابن علقمی کی موجودگی میں ملاقات ہو سکتی ہے۔"

ابن علقمی کو ذرا اطمینان ہوا۔ وہ بڑبڑایا:

"قسم ہے مجھے امام اعلیٰ مقام کی۔ جب تک ان کے سر میری ٹوکروں میں نہ آئیں گے میں چین سے نہ بیٹھوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

ماتے بدبوش! بوش میں آ۔ ایک دن تجھے وزیر بننا ہے۔ اگر تیرے ہی لچن رہے تو کام کس طرح چلے گا
یوں خاندان کو بدنام کرنا ہے۔ اگر تو ان کاموں سے باز نہیں آسکتا تو کم از کم ان سیاہ کاریوں پر ایسا بندہ تو ڈال کہ
ہم کو نظر نہ آئیں:

سعادت مند بیٹے نے باپ کی باتیں سنیں مگر عمل آخری بات پر کیا۔ وہ اب بھی رنگین مخفیں جھاتا مگر عوام کی
وں سے پوشیدہ ہو کر پھر اس نے ایک قصر، محلہ غریب کے صوب میں تعمیر کرایا۔ یہی قصر جعفریہ کے نام سے مشہور
ہلاک و رنگ تو اس قصر کی مٹی اور گارے میں شامل تھا۔

ابن علقمی کے حرم خلافت میں داخل ہوتے ہی محفل نشاط پر خامت کر دی گئی۔ خلیفہ کے حضور میں آنے کے لیے
بھی کو اجازت لینے کے لیے ضرورت نہ تھی اور نہ کسی محافظ میں اتنی ہمت تھی کہ وہ ابن علقمی کو اندر آنے سے روک
دے۔ اس کے داخلی ہوتے ہی خلیفہ سلطنت عباسیہ مسند خلافت سے کھڑا ہو گیا۔ خود سر ابن علقمی نے بھی تعظیم کی بھی
تذکرہ خلیفہ اس کی طرف یوں بڑھا جیسے کہ مستعصم کے بھائے ابن علقمی خلیفہ ہے۔

پھر خلیفہ مستعصم ابن علقمی کا ہاتھ پکڑ کر مسند خلافت تک لایا اور اپنے ساتھ بٹھالیا۔

”میں نے سنا ہے کہ امیر عراقی آیا تھا۔“

ابن علقمی کا جواب اتنی ہی تند تھا۔ اس نے خلیفہ سے یوں خطاب کیا جیسے کسی ادنیٰ ملازم سے کیا جاتا ہے۔
”مستعصم اس کے بڑے تیور دیکھ کر کھم گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا:
’اے ابن علقمہ!‘

’کیوں آیا تھا۔ ہم نے تو اسے معزول کر کے شہر بدر کر دیا تھا۔ ابن علقمی کے بھے میں اب تک تلخی تھا۔

’ہم نے اس سے کہہ دیا کہ اگر تمہیں یا کسی اور کو قدیم موسیٰ کی ضرورت ہو تو اس وقت آؤ جب ہمارا وزیر اعظم
’علیقہ موجود ہو۔‘ خلیفہ نے سہمے انداز میں ابن علقمی کے سامنے اپنی صفائی پیش کی۔

’علیقہ اعظم۔‘ ابن علقمی نے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا:

’یہ چھوٹے لوگ منہ لگانے کے قابل نہیں۔ خلیفہ کے ملازموں کو صرف اپنی ملازمت سے سروکار رکھنا
’یہ وہ خلیفہ کو تکلیف دینے کیوں آتے ہیں۔ جیسے ایسے لوگوں سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں۔‘

’ایسے لوگوں سے جیسے ملنے کی ضرورت نہیں۔‘ خلیفہ نے ابن علقمی کے الفاظ دہرائے:

’تمہارا خیال درست ہے ابن علقمی۔‘

’ابن علقمی کا خیال غلط ہے خلیفہ معظم۔‘

یہ آواز سپر سالار دیو دار کی تھی جو بروہی حرم خلافت میں گھس چلا کر مانغا:

’آپ اس وقت نہ جائیں۔ شاہی قلعہ آپ کو پس کے محل میں ڈھونڈھ کر پہلے جائیں گے۔ کسی کو کیا پتہ
آپ اپنی راتیں دریا کے اس باقصر سلوٹ میں گزارتے ہیں۔‘

’یہ تو ٹھیک ہے۔‘ ابن علقمی نے جرثیمہ سے اپنا دامن چھڑاتے ہوئے کہا:

’لیکن میرا خلیفہ سے اسی وقت حاضر ہونی ہے۔ کہیں رات میں وہ کم ہمت کوئی اور صف نہ کھڑا کر دیں نصف
فوج اب بھی دیو دار کی کان میں رہے۔‘

ابن علقمی تیزی سے دروازے سے باہر آیا پھر کچھ سوچ کر رکا اور پلٹ کر کہا:

’تم میرا انتظار کرنا۔ قصر جعفر سے میں سیدھا تمہارے پاس آؤں گا۔‘



دارالخلافہ بغداد اور اصل خلافت عباسیہ کے پانچ سو سالہ عروج و زوال کی جیتی جاگتی تاریخ ہے۔ یہ شہر
دریا تے دجلہ کے دونوں جانب آباد ہے۔ عباسی خلیفہ پانچ سو سال تک مغربی کنارے پر اقامت گزیر رہے
پھر مغرب کی رونقیں مشرقی حصے میں سمٹ آئیں اور زوال عباسیہ تک تمام خلیفہ اسی حصے میں رہتے تھے۔
خلیفہ مستعصم کا قصر جعفر مشرقی بغداد کے جنوبی حصے میں دجلہ کے کنارے عکس غلام کے پاس واقع تھا عباسی
وزیر جعفر برمکی کا بنایا ہوا یہ قصر ماموں رشید کے زمانے میں قصر مامونی نور وزیر حسن ابن مل کے وقت میں قصر حسن
مشہور رہا لیکن عوام اسے ہمیشہ قصر جعفر ہی کہتے تھے۔

قصر جعفر کی شان و شوکت اس کے گھر سے نائنے میں بھی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کا انداز صرف اس بات
سے کیا جاسکتا تھا کہ خلیفہ مستعصم کے خاص کمرے کا جو فرش تھا وہ سونے کے تاروں سے بنایا تھا اور گھر ہر اوقات سے
حرص تھا۔ اس کمرے اور پورے محل کی چابیاں سونے کی سلاخوں سے بنائی گئی تھیں۔

جس وقت موملہ الدین ابن علقمی خلیفہ کے حضور پہنچا تو محفل راگ و رنگ اپنے شباب پر تھا۔ دراصل قصر جعفر
کی تعمیر ہی راگ و رنگ کی خاطر ہوئی تھی۔ اس قصر سے کئی الف لیلوی انسانے وابستہ ہیں۔ مشہور مورخ یا قوت کا بیان
ہے کہ جب جعفر برمکی جوان تھا اور اس کا باپ عیسیٰ خلیفہ ہارون رشید کا وزیر تھا تو فوجان جعفر ہر وقت نشے میں ڈوبا
رہتا۔ اس کے لیے عیش و طرب کے سب سامان بنیائے تھے۔ شراب و شباب کی محفلیں جتیں شاہ رقصا پڑھتے اور
مال مال ہونے اور محفلیں میں میٹھی میٹھی راگیاں سن کر جھجکا دل بھلاتیں۔ اس کا باپ ہمیشہ اسے ملامت کرتا

ابن علقمی اور سپہ سالار دیودار میں تلخی و نزشتی بڑھتی جا رہی تھی مگر خلیفہ ثوقت دم بخود تھا۔ اس میں ان دونوں کو رد کرنے اور منع کرنے کی جرات نہ تھی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس وقت ولی عہد شہزادہ ابوبکر آگیا۔ ابوبکر ہندی و سخت گیری میں ابن علقمی سے بھی لگے تھا۔ ابن علقمی اگر بغداد میں کسی سے غلط تھا تو ابوبکر سے۔

اسے دیکھ کر ابن علقمی نے خاموشی اختیار کر لی۔ امیر دیودار نے بھی اب بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ خلیفہ کو ولی عہد کے آنے سے جیسے سدا مل گیا اس نے فوراً کہا:

"ابن علقمی اور امیر دیودار۔ اس وقت تم دونوں چلے جاؤ۔ ہم غور و فکر کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے۔"

ابن علقمی نے موقع غیبت چانا اور فوراً غائب ہو گیا۔

امیر دیودار جانے لگا تو ولی عہد نے اسے روکے ہوئے کہا:

"معرسہ سال۔ آپ تشریف رکھیں مجھے آپ سے ایک اہم معاملے پر گفتگو کرنا ہے۔"

ولی عہد ابوبکر کے کہنے پر امیر دیودار رک گیا اسے امید ہوئی کہ شاید اب اس کی بات سنی جائے اور خلیفہ غائب خرگوش سے بیدار ہو جائے۔

خلیفہ مستعصم کو بھی امیر دیودار کے باتوں سے آنے والے خطرے کا کچھ کچھ احساس ہو رہا تھا لیکن وہ ولی عہد کے اس طرح عمل میں اچانک کہانے سے ہی پریشان تھا۔ ولی عہد کو اس حرم میں آنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اس کی وجہ بھی دراصل حرم کی حسین کینز جڑی ہی تھی۔

خلیفہ کے کانوں تک یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ ابن علقمی نے بپا بیٹوں میں اختلاف پیدا کرنے کے لیے یہ خراسان تک پہنچا دی تھی کہ ولی عہد ابوبکر بھی جڑیہ کو پسند کرتا ہے۔ خلیفہ اس وجہ سے ابوبکر سے ناراض تھا اور اس نے اپنے قریبی شہزادے کی آکدورفت بند کر دی تھی۔

خلیفہ نے ولی عہد سے بڑی محبت سے پوچھا:

"شہزادے! کیا تم نے ہمارے قریبی بھائی اجازت کے ہمارے حکم عدوی نہیں کی؟"

پدر عالی مقام۔ مجھے یہ جرات مجبوراً کرنا پڑی۔ ابوبکر نے بھی کمال محبت و پیار سے جواب دیا۔

پھر شہزادے نے اپنی جیب سے دو خط لکال خلیفہ کے سامنے رکھے اور کہا:

"خلیفہ معظم ان خطوط کو ملاحظہ فرمائیں۔ ان خطوں کے لے جانے والے کو میرے آدمیوں نے سرحد پر گرفتار کیا ہے اور وہ میری قید میں ہے۔"

خلیفہ نے بے دلی کے ساتھ ایک خط اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ وہ خط کی تحریر جو جوں پڑھتا جاتا تھا اس کا رنگ فق ہو جاتا تھا۔

"میں دوبارہ خلافت سے گستاخی کی معافی مانگتے ہوئے کہتا ہوں کہ ہمارا اس وقت خلیفہ سے ملنا ہر ضروری ہے۔ اب تو وزیر اعظم خود بھی موجود ہیں۔"

خلیفہ مستعصم ہکا بکا کھی ابن علقمی کا مزہ دیکھتا اور کھی امیر دیودار کا۔

ابن علقمی نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے امیر دیودار سے کہا:

"تم امیر مراء کی کو اپنے ساتھ کیوں لائے۔ ہم نے اسے معزول کر کے شہر بدر کر دیا ہے۔"

امیر دیودار کلاں کر بولا:

"کیا وزیر اعظم اس کی وفات فرمائیں گے کہ امیر مراء جیسے وفادار فوجی سردار کو کس جرم میں معزول کر دیا ہے۔ کیا یہی امیر نہیں جس نے خلافت کے جھگڑے میں خلیفہ معظم کا ساتھ دیا تھا؟"

"یہ انتقامی معاملہ ہے۔ ابن علقمی نے کہا:

"یہ سوچنا وزیر اعظم کا کہہ کہ کون وفادار ہے اور کون غدار۔"

امیر دیودار کو غصہ آگیا۔ اس نے تیز لہجے میں کہا:

"اور میرے آدھے لشکر کو برخاست کر دینا کون سا انتقامی معاملہ ہے۔ نصف فوج کو برخاست کرنے کے ذریعہ سپہ سالار کا مشورہ ضروری تھا۔ عوام کی جان و مال کی حفاظت فوج اور سپہ سالار فوج پر عائد ہوتی ہے۔"

ابن علقمی نے اخراجات کی زیادتی کا بڑا کھڑا کر کے خلیفہ سے نصف لشکر کو برخاست کرنے کا مطالبہ

مائل کیا تھا کہ ہلاکو خاں بغداد پر حملہ آور ہو تو اس کے لیے میدان صاف ہو۔

ابن علقمی کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا اس لیے اس نے غصے کے بجائے تہذیب کا ہتھیار استعمال

اور بولا:

"امیر دیودار۔ ہم اور خلیفہ عباسیہ تمہاری وفاداری کی قدر کرتے ہیں۔ تم صرف فوجی آدمی ہو اس لیے

تمہیں یہ معلوم نہیں کہ حکومت کی آمدنی کس قدر گھٹ چکی ہے۔ خزانے میں تو بقیہ فوج کو تنخواہ دینے کے

بھی رقم موجود نہیں۔"

لیکن فوجی امیر دیودار کو ابن علقمی کا تہذیبی برتاؤ نہ کر سکا اس نے فوراً جواب دیا:

"آپ کہتے ہیں کہ تنخواہ کے لیے خزانے میں رقم نہیں ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ فوج کے ایک ایک

اخراجات حرم خلافت میں برپا ہونے والی محفل نشا ط کے صرف ایک دن کے خرچ کے بھی برابر نہیں۔

وزیر اعظم کو یہ سوچنا چاہیے کہ ہلاکو خاں کی تلوار بغداد کے سر پر لٹک رہی ہے۔ وہ کسی بھی وقت ادھر

رخ کر سکتا ہے۔"

خط پڑھنے کے بعد خلیفہ نے وہ خط امیر دیودار کی طرف بڑھا دیا اور دوسرا خط پڑھنے لگا۔ اس کے پڑھنے کے دوران بھی اس کا چہرہ متغیر ہوتا رہا۔

امیر دیودار نے بھی دونوں خطوط پڑھ لیے لیکن اس کا چہرہ رفتی ہونے کے بجائے غصے سے سرخ ہو گیا۔ "غدار آہستہ سے اس کی زبان سے نکلا۔

"کیا یہ سب سچ ہے؟" خلیفہ نے مردہ آواز میں پوچھا۔

"بالکل درست ہے پیر عمرتم" ابو بکر نے کہا:

"آپ کا حکم ہوتا میں خط لے جانے والے کو آپ کے حضور پیش کروں؟

خلیفہ مستعصم نے ایک مرد آہ بھری اور بولا:

"شہزادے۔ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ خود ہماری رعایا بغداد کو ہلاک خان کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔"

"ان غداروں نے کتنی دیدہ دلیری سے ہلاکو سے بغداد پر حملہ کرنے کی درخواست کی ہے۔" امیر دیودار کہتے ہوئے خون کھولنے لگا۔

"اب آپ کا کیا حکم ہے خلیفہ عظیم" ابو بکر نے پوچھا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" خلیفہ پتھر درگ سے بولا:

"حکم دینے کے تو ہم قابل ہی نہیں رہے۔"

ابو بکر نے امیر دیودار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"امیر لشکر۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ ان غداروں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

امیر جواب سوچ رہا تھا کہ خلیفہ نے حکم صادر کر دیا:

"ان دونوں کو اسی وقت گرفتار کر کے قتل کر دیا جائے تاکہ دوسرے ایسی حرکت نہ کر سکیں۔"

شہزادہ ابو بکر اور امیر دیودار کی بھی یہی خواہش تھی۔ خلیفہ کے حکم کی دیر تھی۔ سپہ سالار امیر دیودار نے فوج کو

دستہ شہزادے کے ساتھ کر دیا۔ اس دستے کا سردار زالدین نامی ایک امیر تھا۔ امیر دیودار نے اسے گھوڑا کے تھام

کے احکامات کی پوری پوری تعمیل کی جائے۔

ہلاکو خان کو یہ دونوں خط مل کر بخ کر کے دو آدمیوں نے ایک ارباب قاصد کے ہاتھ بھجوائے تھے جو صبح پھر شہزادہ

کے سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔

حملہ کر بغداد کے مغربی حصے میں آباد تھا اور خطوط بھیجنے والے صلاوات کے نام کو بٹہ لگانے والے غدار تھے۔ درجہ

یہ سب کچھ ابن طغی کے اشارے پر ہو رہا تھا۔ وہ خلافت عباسیہ کو ختم کر کے خلافت ملوہ کے قیام کا خواب دیکھ رہا تھا۔

ابو بکر اور نور الدین نے دریائے دجلہ پار کر کے غداروں کے گھروں پر چھا پھار مارا۔ رات کا وقت تھا۔ اس لیے دونوں گھر پر ہی مل گئے۔

فوج کے آنے سے محل میں ہنگامہ مچ گیا۔ فوج نے دونوں کو گرفتار کر لیا۔ یہ دونوں محلے کے کھاتے پیتے گھرانے کے ہاتھ لوگ تھے اور ان کا خاندان بھی بڑا تھا۔ پورا محلہ ایک ہی غارت سے تعلق رکھتا تھا۔ انہوں نے فوج کی مزاحمت کی۔

فوج نے محلے پر قبضہ کر لیا۔ محلہ کوٹ لیا اور گھروں کو آگ لگا دی۔

دونوں غداروں کو بازار کے چوک میں لٹا کر قتل کر دیا گیا۔

اس لوٹ اور پکڑ و کھڑکی خبر پورے مغربی بغداد میں پھیل گئی۔ جریشہ اس وقت فخر سلوکیہ میں بیٹھی ابن طغی کا

انتظار کر رہی تھی۔ یہ فخر بھی مغربی بغداد میں تھا اور ابن طغی کی سازشوں اور میاں کشیوں کا ڈھ تھا۔ جریشہ نے سوچا کہ کس

فوج اس فخر پر بھی حملہ کر دے۔ اس نے یہی بہتر خیال کیا کہ ابن طغی کا انتظار کرنے کے بجائے پہلے اپنی جان بچائی

جائے۔ وہ محافظوں کے ساتھ دریا پر آئی اور کشتی میں بیٹھ کر مشرقی بغداد پہنچ گئی۔



رات کافی لار چکی تھی۔ جریشہ کشتی کے ذریعے مشرقی ساحل پر آزی۔ کشتی اسے اتار کر واپس ہو گئی۔

جریم خلافت جانے والے راستے پر فوجی پہنچ گیا تھا۔ جریشہ اس وقت خود بھی حرم خلافت نہیں جانا چاہتی

تھی۔ اس نے فخر جعفر کی پشت پر اس محل میں جانے کا فیصلہ کیا جس میں بیگمات اور خلیفہ کی خواہش اور خاص کینزوں رہا

کوتی تھیں۔ خلافت عباسیہ کی یہ نشان تھی کہ کینزوں اور خواہشوں کی رہائش کے لیے بھی محنت تعمیر کرانے لگے تھے۔

جریشہ بھی وہی وقت پہنچی تھی کہ کسی نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ جریشہ نے ہلٹ کر دیکھا۔ اسے پکڑنے والا وضع

نقصے فوجی لگا تھا۔ اندیشہ ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ صاف سے نظر آ رہا تھا۔

"تم کون ہو۔ مجھے کیوں پکڑا ہے؟" جریشہ نے تکلف سے پوچھا۔

"مشرق کن رے پر کشتی کے ذریعے کسی کو آنے کی اجازت نہیں۔" سپاہی نے اسے سمجھایا:

"تم کون سے کیوں نہیں آئیں؟" سپاہی نے اسے جواب دینے کے بعد اس سے سوال کیا۔

"پابندی کس کی طرف سے لگائی گئی ہے؟" جریشہ نے پھر تکلف سے سوال کیا۔

سپاہی کچھ چڑ گیا۔ اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا:
 "معاذوں۔ ایک تو تم اتنی رات گئے کشتی کی سیر کر رہی تھیں۔ پھر ایسی اگر دکھا رہی ہو جیسے بغداد کی گدگد
 چپ چاپ میرے ساتھ حفاظتی چکی چلو۔ وہاں پہلے تمہاری شناخت ہوگی۔ پھر جانے کی اجازت ملے گی
 جوشیہ نے دیکھا کہ سپاہی بالکل اجداد گنوار ہے۔ اس سے بحث کرنا بیکار ہے۔ وہ چپ چاپ اس کے رہ
 چلے گی۔ اس کے چہرے پر نصف نقاب تھا۔ سپاہی مضبوطی سے اس کا بازو پکڑے تھا۔
 "میں تمہارے ساتھ چل تو رہی ہوں۔ میرا باقہ چھوڑ دو۔"

جوشیہ کا بازو دکھنے لگا تھا۔ اس نے چلتے چلتے سپاہی سے درخواست کی۔ سپاہی نے کوئی جواب نہ دیا
 نہ اس کا بازو چھوڑا۔

"تم حرمِ خلافت میں کبھی گئے ہو؟ جوشیہ نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں۔ صرف ایک بار۔ سپاہی حرمِ خلافت کا نام سن کر جواب دینے پر مجبور ہو گیا۔

"کیوں گئے تھے وہاں۔ کسی وجہ سے تھے وہاں۔ جوشیہ نے بات اگے بڑھا لی۔

"میری..... سپاہی کہتے ہوئے جھبکا۔

جوشیہ نے اسے تسلی دی اور کہا:

"گھبراؤ نہیں۔ بتاؤ وہاں تمہاری کنہ ہے۔ میں ہر عورت سے واقف ہوں۔"

"تم عازانی کو بھی جانتی ہو؟" سپاہی نے بے تابی سے پوچھا۔

سپاہی کو یوں محسوس ہوا جیسے عازانی کا نام سن کر وہ ہنسی ہے جوشیہ کے چہرے پر نقاب، پھر اندھیر

سپاہی نے صرف اندازہ لگایا اسے جواب نہ ملا تو اس نے اپنا سوال دہرایا مگر الفاظ بدل کر۔ اس نے کہا:

"یہ ضروری تو نہیں کہ تم عازانی کو جانتی ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ تمہارا فعلی حرمِ خلافت سے ہو۔"

جوشیہ اس کے پیسے سوال پر واقعی ہنسی تھی۔ جوشیہ نے خلافت میں کثیر مقررہ کنیزوں کی سرداری پر غور کیا۔

عازانی اس کی ماتحت تھی۔

چودھ پندرہ سال کا ارمنی لڑکی۔ وہی ہے نا عازانی؟ جوشیہ نے سپاہی کو اس کی محبوبہ کا طریقہ بتایا۔

عازانی کا ذکر جس انداز میں سپاہی نے کیا تھا اس سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ اسے عازانی سے دلچسپی ہے

یا پھر وہ اس کی سنگین تر ہے۔

جوشیہ کو اپنے بازو پر سپاہی کی گرفت دیکھ کر محسوس ہوئی۔ اس نے سپاہی کے جواب کا انتظار کیے پھر

خود ہی کہا:

عازانی صرف دو ماہ پہلے قصرِ خلافت میں آئی ہے۔ مدار و نہ مطبخ (ماورجی خانے کا ناظم) اس کا سفارشی تھا:

سپاہی کی گرفت اور دھمکی ہو گئی۔

"آج کل وہ خواص اور کنیزوں کی سرداری جوشیہ کی ذاتی کنیز ہے۔ جوشیہ نے جھمکن کیا تو سپاہی نے گھبرا کر

اس کا بازو چھوڑ دیا۔

"تم کون ہو۔ تم عازانی کے بارے میں اتنی بہت سی باتیں کیسے جانتی ہو؟ سپاہی ہی کے سوال میں تجسس اور

گہرا ہٹ تھا۔

"میں جوشیہ ہوں عازانی میری کنیز خاص ہے۔"

سپاہی کا سر پکڑنے لگا۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ پھر جوشیہ سے اپنی گستاخی کی سمانی لگی۔

"آپ کہاں جانا چاہتی ہیں۔ میں آپ کو وہاں تک پہنچاؤں گا۔ سپاہی کا رویہ یکسر تبدیل ہو گیا اور وہ چلتے

چلتے لگ گیا۔

پہلے یہ بتاؤ کہ شہزادہ ابو بکر کہاں ہے؟ جوشیہ نے سوال کیا۔

"آپ کے آنے سے تو طوری دیر پہلے وہ امیر نور الدین کے ساتھ ادھر سے گزرے تھے جہاں آپ کشتی سے

اڑی ہیں۔" سپاہی نے بڑے مودب انداز میں جوشیہ کو بتایا:

"ممکن ہے کہ اپنے محل میں گئے ہوں۔ یہ سپاہی کا اپنا اندازہ تھا۔

"اچھا تم میرے ساتھ آؤ۔ جوشیہ نے جیسے اسے حکم دیا۔

سپاہی اس سے دو قدم پیچھے ہو کر چلنے لگا۔

حرمِ خلافت کے پیچھے کنیزوں کا محل تھا۔ دونوں اس کے دروازے پر پہنچ گئے۔ جوشیہ بڑے دعوازے

سے داخل ہوئی۔ سپاہی جھلک کر رک گیا۔ مشعل کی تیز روشنی میں اس نے چار پہرے داروں کو اپنی طرف آتے

ہوئے دیکھا۔

پہلے آؤ۔ جوشیہ نے کہا۔

پھر مدار جوشیہ کی آواز سن کر واپس ہو گئے۔ جوشیہ اور سپاہی پھولدار روشنوں کو طے کر کے محل کے بلکے

میں پہنچ گئے۔ کئی کنیزیں دوڑ کر جوشیہ کے پاس آ گئیں۔

"اس سپاہی کو عزت سے بٹھایا جائے۔ جوشیہ نے حکم دیا:

"یہ عازانی کا.... عازانی کا کچھ لگتا ہے۔"

جوشیہ نے چہرے سے رومال ہٹایا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ کنیزیں بھی ہنسنے لگیں۔

سپاہی کو ایک اکراستہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

جریشہ آگے بڑھی۔ ایک طرف سے عازانی آتی دکھائی دی۔

”ادھر آؤ عازانی“ جرشہ نے اسے آواز دی۔ عازانی ہلک کر اس کے پاس آگئی۔

جریشہ نے کہا:

”تھکنے کے کمرے میں تم آرامان بیٹھو۔ جلدوں سے ملو۔ چاہو تو اس کے ساتھ جاسکتی ہو۔ تمہیں شرم

کچھٹی دی جاتی ہے۔“

عازانی کی نگاہ میں کچھ نہ آیا۔ پھر بھی اس کے قدم کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔

جریشہ نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ پھر سولہ گھنٹہ کر کے باہر آئی۔ کینزین اس کا صحنہ دیکھ کر تعجب کرنے

لگیں۔ جرشہ چودھویں کا چاند اور شعلہ جولاہی بھٹی تھی۔ دُجالے دار سرے نے اس کی چوڑوں کو اور غضب ناک بنا

دیا تھا۔ اس نے انتہائی بھرپور لباس زیب تن کیا تھا۔ تمام لباس طرح طرح کی خوشبوؤں سے بساتھا۔ جس طرف سے

فلکی، یوں معلوم ہوتا کہ گلستان کے جھونکے گزر رہے ہیں۔

یہ بناؤ گھٹا کسی اہم کام کا پیش نیمہ تھا۔ جرشہ نے اتنی تیاری صرف اس وقت کی تھی جب وہ پہلی مرتبہ

خلیفہ کے حضور میں پیش ہونے جا رہی تھی یا پھر وہ آج اتنی جی سنوری تھی۔

اس نے خاص خاص کینزین کو ہلکا کر کچھ ہلکات دیں۔ پھر اس کمرے میں گئی جہاں عازانی اور اسے لے لے لے لے

سپاہی بیٹھتے تھے۔ عازانی جرشہ کو دیکھ کر ہونچکا گئی۔ اسے یوں لگا جیسے پرستان سے کوئی پری اتر آئی ہو۔

عازانی اور سپاہی، جرشہ کو دیکھ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔

جرشہ مسکراتی ہوئی عازانی کے پاس گئی۔ اک ادا نے ناز سے اس کے کا نہ بھ پڑا ہونے کا اور پوچھا:

”یہ سپاہی تیرا کیا لگتا ہے؟“

عازانی نے جواب دینے کے بجائے شرم کے سر ہلکایا۔

”یہ تیری کون ہے؟“ جرشہ نے عازانی سے جواب نہ پا کر سپاہی سے سوال کیا۔

”منگیتر“ سپاہی نے بے جھجک کہا:

”ہم دونوں کی شادی جلد ہونے والی ہے۔“

عازانی متوجہ نظروں سے اپنے منگیتر کو گھورنے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ مرد بھی کتنے بے شرم ہوتے ہیں۔

”تمہارا نام کیا ہے سپاہی؟“ جرشہ نے پوچھا۔

”جلال الدین اناک“ سپاہی بولا۔ ”ویرانی کا محافظ دستے میں سپاہی ہوں۔“

”آج سے تم ہمارے صافحتی دستے میں رہو گے۔ جرشہ نے مسکرا کر کہا۔

اناک، جرشہ کا منہ دیکھ کر وہ گیا۔ وہ جرشہ کے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ جانتا تھا اور جو کچھ باقی رہ

گیا تھا وہ اس مختصر ملاقات میں عازانی نے اسے بتا دیا تھا۔ وہ کچھ گیا کہ جرشہ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ حکم کا دہرہ

رکتا ہے۔

اختہ میں ایک کینزین نے جرشہ کو اطلاع دی کہ سواری کا انتظام ہو گیا ہے۔

جرشہ نے اناک اور عازانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”تم دونوں میرے ساتھ چلو گے۔“

”جی ہاں؟“ عازانی نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں تم ہی۔“ اناک نے اناک کے ساتھ ساتھ جرشہ نے قسم کی ایسی بھلی لگائی کہ اگر کوئی دل والا ہوتا

تو جان گنا بیٹھتا۔

”اور انا عازانی: تم گھوڑے پر سواری کر سکتی ہو؟“

”جی ہاں۔“ عازانی نے جواب دیا۔

عازانی سپاہی زوی قہ پاپ اور بھائی کی اچانک موت نے اسے بے سارا کر دیا تھا۔ اس کی ماں کا پہلے

ہی انتقال ہو چکا تھا۔ اناک اس کے محلے کا ایک نیک دل جوان سپاہی تھا۔ ان کا رشتہ بچپن ہی میں پکا ہو گیا

تھا لیکن نکاح و رخصتی نہ ہوئی تھی۔ سپاہی زادی گھر سواری کے علاوہ تھوڑی بہت شمشیر زنی سے بھی واقف تھی۔

باہر تین گھوڑے تیار تھے۔

پہلے جرشہ سوار ہوئی۔ پھر اس کے اشارے پر عازانی اور اناک نے اس میں بیٹھالیں۔ ایک ایسے مقام

پر جہاں سے دوسرے مختلف سمتوں میں جاتی تھیں جرشہ نے اپنا گھوڑا روکا۔ اناک اور عازانی بھی رک گئے۔

جرشہ دونوں مردوں کو دیکھ رہی تھی اور کسی خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔

ان میں ایک راستہ تقرر کیا کہ اور دوسرا تقرر کیا جن کو جلتا تھا۔ یہ دونوں تقرر شہزادہ ابوبکر کے قبضے

میں تھے تقرر شہزادہ میں اس کی حرم سرا تھی اور تقرر شہزادہ کی عشرت کہہ تھی۔ عشرت کہہ کے علاق

محل معاملات کے صلاح و مشورے کے لیے بھی شہزادہ اس تقرر کو استعمال کرتا تھا۔

جرشہ کو انتظامی یا ملکی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن چونکہ وہ بغداد کی سیاست کا ایک اہم ہندو

اور وزیر اعظم ابن علفی کی جاسوسی خاص تھی اس لیے ہر اہم معاملے کی آواز اس کے کانوں سے ضرور ٹھکانی تھی۔ اسے

معلوم تھا کہ شہزادہ ابوبکر اور ابن علفی میں سخت عداوت ہے۔ بغاوردہ ایک دوسرے سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں

چلے گا۔



لیکن ہر وقت ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے رہتے تھے۔
ابن عقیلی ہر چند کہ خلیفہ پر پوری طرح حاوی تھا لیکن شہزادے کے اثر و سحر اور دلا مہم ہونے کے وجہ سے بعض معاملات میں اسے بڑی احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا۔

شہزادے کو کسی طرح یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ جرشہ اہل اہل عقیلی میں گہرے تعلقات ہیں۔ اس لیے ان کی حالت کی ایک وجہ وہ خود بھی جانی ہوئی تھی۔

ان تمام باتوں کے باوجود جرشہ اس وقت شہزادہ ابوبکر سے ملنے جا رہی تھی۔ اس وقت جبکہ ہر طرف گہرا اندھا بھلا ہوا تھا اور رات اپنے آخری لمحوں میں تھی۔ آخر اس نے تقریر کا بنی بنی ہلنے کا فیصلہ کیا۔ حکم کر کے پرچہ پائے سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ شہزادہ غریب سرداروں کے ساتھ ہو گا اور ممکن ہے کہ وہ اس وقت بھی تقریر کا بنی بنی میں ان کے ساتھ صلاح و مشورے میں مصروف ہو۔

جرشہ کا خیال درست ثابت ہوا جب وہ تقریر کا بنی بنی کے قریب پہنچی تو اس نے کئی سواروں کو محفل سے نکلے دیکھا۔ ان میں شہزادہ ابوبکر بھی تھا۔

سواروں کے گزر جانے کے بعد قصر کے دروازے پر پہنچی۔ وہاں ہر جگہ تھا اور چند سوے دار ننگی تلواریں لیے حفاظت پر مامور تھے۔

”کون ہے؟“ ایک پرے دار نے دوسرے آواز دی اور تلوار کھینچنے ہوئے آگے بڑھا۔

جرشہ: ”جرشہ نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ اس کا گھوڑا آگے تھا۔

جرشہ کے نام نہ جانے کیا تاثیر تھی کہ پرے دار کی تلوار فوراً پیچھے ہٹ گئی اور وہ حیران ہو کر گھوڑے پر بیٹھ گئی۔ اس بے باک عورت کو گھوڑے نے لگا جس کے جسم سے خوشبو کے بجائے آگ کا دھبہ تھا۔

شہزادہ: ”تقریریں موجود ہیں؟“ جرشہ نے سوالیہ انداز میں کہا۔

پرے دار نے دوسرے پرے دار کو متعلق قریب لانے کو کہا۔ متعلق آگئی تو پرے دار نے متعلق کے جرشہ کے چہرے کی طرف کی۔

جرشہ کے حسن و جوانی کو دیکھ کر پرے دار کے ہاتھ میں متعلق تھر تھرانے لگی۔

”محبوب دو شہزادہ اند ہیں۔ جرشہ نے تمکا نہ انداز میں کہا۔

پرے دار نے فوراً خود کو سنبھالا۔ اور وہیں سے تھر تھرواڑہ کھونٹے کی آواز لگائی۔

دروازہ کھل گیا۔

”اندر تشریف لائیے۔ پرے دار نے باجھت سے کہا اور جرشہ کے گھوڑے کے آگے آگے متعلق لیکر

شہزادہ ابوبکر نے ابھی ابھی امیر نور الدین کو رخصت کیا تھا اور اب وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے جرشہ کے آنے کی اطلاع دی گئی۔

وہ بہت حیران ہوا۔ جرشہ، شہزادے کا ولی مہم ہونے کی وجہ سے اس کا لحاظ ضرور کرنی تھی مگر آج تک اس نے شہزادے کو کبھی لگاؤ کی نظر سے نہ دیکھا تھا۔ اب اس وقت جرشہ کا اس کے عنبرت کے سے میں آنا

اسے خواب سا محسوس ہو رہا تھا۔

شہزادہ کمرے سے نکل کر راہداری تک پہنچا کہ اسے جرشہ ہزاروں قیامتیں جگاتی پھم پھم کرتی اور مسکراہٹیں کبیرتی سامنے سے آتی دکھائی دی۔

شہزادے کے قدم آگے گئے۔ بلکہ اس کے قدم جیسے ہیرت و استعجاب سے زمین نے پکڑ لیے۔ وہ بت بنا جرشہ کو دیکھ رہا تھا۔

مشعل پرواز جو جرشہ کی رہنمائی کر رہا تھا، شہزادے کو دیکھ کر رک گیا اور پھر متعلق لیے واپس چلا گیا۔

شہزادے کو میری آواز ناگوار تو نہیں گزری؟ جرشہ نے ایک قیامت خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

شہزادے نے جرشہ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ جرشہ نے اپنا ہاتھ بے تکلف اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

”اگر یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے تو میں اس سے زیادہ خوشی اور کس بات سے ہو سکتی ہے؟ شہزادے نے خود بخود انکھوں سے جرشہ کے پیکر کا جادو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

شہزادہ ابوبکر کے عنبرت کے سے کی خواب گاہ، حرم خلعت کی خواب گاہ کے کسی طرح کم آراستہ نہ تھی۔ یہاں ہجوم و پیش ہر وہ چیز موجود تھی جو حرم خلعت میں تھی۔ جرشہ اور شہزادہ زرنگار مسند پر آئے جانے بیٹھ گئے۔

”تمہارا اس وقت یہاں آنا تعجب خیز ضرور ہے جرشہ۔“ شہزادے نے غلط انداز میں کہا۔

جرشہ مسکرائی اور بولی:

”شہزادے۔ اپنے دل میں کسی شبے کو جگہ نہ دیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ راج کے چھاپے میں آپ شریک تھے۔

بہن پر نہیں کیوں دل بے چین ہو گیا اور آپ کی غیرت معلوم کرنے فوراً چل پڑی۔

شہزادے کا شبہ کسی حد تک دور ہو گیا۔ اس نے کہا:

”ہمیں سکا اور خوش ہوئے ہیں کہ تمہیں پہلا اتنا فیمل ہے؟ یہ کہتے ہوئے شہزادہ، جرشہ کے ذرا زہید ہو گیا۔

”خیل نہ ہوتا تو یہاں کیوں آتی؟ جرشہ نے اس انداز سے انگریزی کی کہ شہزادے کا دل سینے میں تیزی سے دھڑکنے لگا۔

شہزادہ بے خود ہوتے ہوئے بولا،

”جرشہ! ہم ابھی دلی عہد ہیں۔ اگر قسمت نے یاوری کی تو وقت آنے پر تمہاری ایسی دلداری کریں گے کہ نانا نہ دیکھتا رہ جلتے گا۔“

شہزادہ کچھ اور قریب آ گیا۔

”کرخ میں کتنے غدار مارے گئے؟“ جرشہ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جاسوسی کا سہارا لیا۔

”ہاگو کو خط بھیجنے والے دونوں غدار قتل کر دیے گئے۔“ شہزادہ عویت کے عالم میں بولا،

”لیکن سب سے بڑا غدار ابھی باقی ہے۔“

”وہ کون ہے؟ اسے کیوں چھوڑ دیا آپ نے؟“ جرشہ نے سوال کیا۔

”ابن علقمی۔ تمہارا بھروسہ شہزادے نے ایک بڑا راز بڑی آسانی سے اگل دیا۔

جرشہ، شہزادے سے ذرا دور ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی مصنوعی ناگواری کا اظہار تھا۔ پھر بولی،

”شہزادے۔ آپ دل دکھانے والی بات نہ کریں۔ میں اس کو سوت پر لعنت بھیجتی ہوں۔“

شہزادے کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اس نے کہا:

”جرشہ۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ مگر خ سے جو خطوط بھیجے جا رہے تھے، ہمارا شبہ ہے کہ ان

میں غدار ابن علقمی کا ہاتھ ہے لیکن ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں اس لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“

”کیا ابن علقمی واقعی غدار ہے؟“ جرشہ نے نہ معلوم یہ سوال کیوں کیا۔

”بالکل غدار ہے جرشہ۔“ شہزادے نے کہا:

”تمہیں پتہ نہیں جرشہ۔ ہاگو خاں جب سے فارس پہنچا ہے تمام عالم اسلام پریشان ہے۔ ابھی کچھ دنوں

پہلے مصر سے وفد آیا ہے۔ وہاں کے ملوکوں نے خلیفہ کو فوجی پیش کش کی تھی لیکن ابن علقمی نے انہیں یہ کہہ کر

مستحق کر دیا کہ ہاگو خاں بغداد پر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اسی طرح بعض سلطنتی سرداروں نے بھی دُور

بھیجتے تھے۔“

”کیا خلیفہ معظم کو اس کی خبر ہے؟“ جرشہ نے ایک دم ملکی معاملات میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔

خلیفہ معظم کو تو اس نے اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔ شہزادے نے بے دلی سے کہا:

”وہ تو قمر جعفر سے باہر کی کوئی بات سننا پسند ہی نہیں کرتے۔ آج انہیں غداروں کے خلاف حکم بڑی

دے کرخ پر چھاپہ مارنے کا فرمان حاصل کیا تھا۔“



شہزادے کا ہاتھ جرشہ کے شانے پر پہنچ گیا۔

جرشہ بھول کی طرح اس کی آغوش میں گر گئی۔ شہزادے نے اس کے جسم کا احاطہ کر لیا۔

جرشہ کو آج پہلی بار اندازہ ہوا کہ شہزادہ ابن علقمی سے بالکل مختلف ہے۔ تمام برائیوں کے باوجود شہزادے

مک و قوم کا درد موجود ہے جرشہ کو شہزادے پر بہت پیار آیا۔ اس نے اپنی باہیں شہزادے کے گلے میں

لڑ دین۔

”تم بہت عظیم ہو شہزادے۔“

اور جرشہ کا جسم جیسے بکھرنے لگا۔

”اور تم عمل کی زینت بننے کے قابل ہو جرشہ!“

جرشہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے دل میں بھل سی مچی تھی۔ وہ اس وقت ابن علقمی اور شہزادہ ابوبکر

سے ایک کا انتخاب کرنا چاہتی تھی۔

شہزادہ مردانہ وجاہت کا پیکر اور ابن علقمی شیطان صورت۔

شہزادے کی گرفت میں تناور درخت جیسی مضبوطی تھی جبکہ ابن علقمی کی حیثیت مرجانی ہوئی شاخ سے

لہ نہ تھی۔

شہزادہ ابوبکر شہزادوں میں معروف تھا۔

جرشہ نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور چاہا کہ شہزادے کی گرفت سے نکل جائے لیکن اس کے اعصاب

بے ہنگم ہو گئے۔ پھر وہ اپنے ہی لباس و جسم سے اٹھتی ہوئی خوشبو سے خود ہی مت ہوتی چلی گئی۔ ٹوٹی اور

نہ ہل گئی۔

مجھ کو جرشہ سوچنے لگی کہ اس نے شہزادے کے ساتھ بڑی حیرت انگیز گزاری ہے۔ واپس جانے

کے لیے اس نے شہزادے سے پوچھا:

”آخر یہ ابن علفی چاہتا کیا ہے؟“

”وہ خلافت عباسیہ ختم کر کے خلافت علویہ قائم کرنا چاہتا ہے۔“ شہزادہ نے صاف صاف کہہ دیا۔
جریشہ کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ وہ ایک بدکار عورت تھی۔ ابن علفی کے لیے جاسوسی کر رہی تھی۔
اپنے مفاد کے لیے.... لیکن بغداد کی تباہی اسے منظور نہ تھی۔ مغلوں کی سفاکی اور بربریت کی داستانیں وہ سُر
چکی تھی۔ جرشہ کو خاک و خون میں نہ پتی لاشیں دیکھنا کسی طرح پسند نہ تھا۔

پھر جرشہ نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔ اس نے کہا:

”شہزادہ۔ اگر آپ پسند کریں تو میں ابن علفی سے ملوں۔“

”کس لیے؟“ شہزادہ گھبرا گیا:

”تم تو اسے پسند نہیں کرتیں۔“

”اسی لیے تو میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“ جرشہ نے کہا:

”میں اس سے ملوں گی تو آپ کو اس کی تمام حرکتوں سے آگاہ کر سکوں گی۔ میں اس کی پوری طرح جاسوسی کر

سکتی ہوں۔“

شہزادہ نے خوش ہو کر کہا:

”اگر تم میری خاطر یہ کام کر سکو تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔“

جرشہ ہیکلی ہنسی ہنسی اور بولی:

”شہزادہ۔ میں جو کچھ کہوں گی وہ بغداد کے لیے کروں گی۔ بغداد میری جان ہے۔ میں اسے برباد نہ

ہونے دوں گی۔“

جرشہ جذبہ بانی ہو گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے حب الوطنی کا لاد اس کے اندر سے ایک دم پھوٹ پڑا ہے

شہزادہ اس کی باتوں سے بڑا متاثر ہوا۔

جرشہ اس دقت بھی شہزادے کی ہانوں میں سمٹی ہوئی تھی اور اس کے دونوں ساتھی اہلبک اور عازنی

اس کا انتقال کرتے کرتے تھک کر اب تک سوئے ہوئے تھے.... مگر یہ تھکن بڑی فرحت انگیز تھی۔ وہ دونوں ایک

دوسرے کی موجودگی سے ایک نامعلوم لذت سے سرتاڑتے۔

ابن علفی حرم خلافت سے اٹھ کر سیدھا چلنے چلائی کے پاس پہنچا۔ اس کا بھائی مشرقی بغداد میں رہتا تھا۔
سیدھا میریو دار کے تہور بھی بگڑے ہوئے تھے اور شہزادہ ابو بکر اس کے پیسے ہی صاف تھاد یہ دونوں اس کے
راستے کے زبردست روڑے تھے جنہیں ہٹانا ضروری تھا۔

ابن علفی ہر کام اپنی مرضی سے کرنے کا مادی تھا لیکن اس وقت اسے اپنے بھائی کی مدد کی ضرورت تھی۔ مشرقی
بغداد میں وہ صرف اسی پر اعتبار کر سکتا تھا۔

بھائی کو اعتماد میں لے کر اس نے بغداد اور ہلاکوناں کے بارے میں بڑی تفصیلی گفتگو کی۔ باتیں
کرتے ہوئے انہیں کافی دیر ہو گئی۔

اسی دوران ابن علفی کے جاسوس نے اسے علم کرخ کی تباہی اور کچھ آدمیوں کو سرعام قتل کیے جانے کا خبر
پہنچی۔ اس خبر سے ابن علفی کے ہوش اڑ گئے۔

کرخ کا زمین شریف کے محلے، ابن علفی کے ہم فرقہ، ہمدان اور عم نوا کوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کی
اماشیں کو اس ہی محلوں سے اقرب ملتی تھی۔

ابن علفی کے جاسوس نے جرشہ کا بھی تعاقب کیا تھا۔ وہ جرشہ کے ساتھ ساتھ اس کے محل تک پہنچ گئے تھے
اسی کو ابن علفی تک پہنچنے کی جلدی تھی اس لیے اس نے جرشہ کا مزید پیچھلے کیا اور ابن علفی کو ڈھونڈتا ہوا یہاں
لٹایا اور جو کچھ سنا اور دیکھا تھا اس سے ابن علفی کو آگاہ کر دیا۔

ابن علفی کا بھائی کمزور طبیعت کا ایک تھا۔ اس نے اسے مشورہ دیا:

”بھائی جان حالات آپ کے خلاف جلد ہے ہیں۔ کیوں نہ آپ کچھ دنوں کے لیے بغداد چھوڑ دیں۔“

ابن علفی کو بھائی پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے کہا:

”تم بزدل ہو۔ حکومت عقل اور طاقت سے حاصل کی جاتی ہے۔ مستعصم کی خلافت میری دستا بردارست سے
بند ہے۔ جس دن یہ دستا راترے گی مخالفت بھی اسی دن ختم ہو جائے گی۔“

”پھر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟“ بھائی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

ابن علفی اٹھ کر بیٹھنے لگا۔ اہم موتوں پر وہ ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ پھر اس نے قدم در رک کر کہا:

”کرخ کی تباہی کا میں ذمے دار ہوں لیکن اس کا بدلہ بھی میں ہی لوں گا۔“

”مگر آپ کس کے کہیں گے کیا؟ شہزادہ آپ کو بھی نہ چھوڑے گا۔“ بھائی کو ابن علفی کی الجھی الجھی باتوں پر
غصے نے لگا۔

ابن علفی نے بھائی کا غصہ محسوس کر لیا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور بڑے پیار سے بولا:

”بیارے“ ہنسی گھرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ سیاست میں ایسے مدوہ و زار آتے ہی رہتے ہیں۔ ان تمہیں میرا ایک کام کرنا ہو گا۔

”مجھے کیا کام کرنا ہو گا؟“ بھائی نے گھبرا کر پوچھا۔

”تم میرا ایک اہم خط لے کر ابن صلابہ کے پاس جاؤ گے۔ ابن علقمی نے اپنی سازش سے پردہ اٹھایا۔ ابن صلابہ کون ہے یہ۔ کہاں رہتا ہے؟“ بھائی کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔ اسے اس وقت ابن علقمی کا

ہونے پر اسوس ہو رہا تھا۔

”پریشان نہ ہو میرے بھائی! ابن علقمی نے اسے قتل دی:

ابن صلابہ میرا نادوست ہے۔ اس وقت وہ اربیل کا حاکم ہے۔ میں اس سے پہلے بھی خط و کتابت رہا ہوں لیکن اب میں سوائے ہمارے کسی اور پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ یہ خط تمہیں ہی اس کے پاس پہنچانا ہے۔

”خط تو کسی اور کے ہاتھ بھی پہنچا جا سکتا ہے؟“ بھائی نے دامن پھیلنے کی کوشش کی۔ اربیل، بغداد سے فارس کا علاقہ تھا اور وہ اس وقت بغداد سے باہر جانے پر آمادہ نہ تھا۔

”خط تم ہی لے کر جاؤ گے۔“ ابن علقمی نے بڑبڑا کر کہا:

”تمہارے یہ سب ٹھٹھاٹ باٹ میری وجہ سے ہیں۔ اگر تم نے انکار کیا تو میں بھی بھول جاؤں گا کہ میرا کوئی بھائی صبح کو تم قید خانے پہنچ جاؤ گے۔“

ابن علقمی کے بھائی میں انکار کی ہمت نہ رہی۔ اس نے اطاعت سے سر جھکا دیا۔

ابن علقمی نے کہا:

”میں خط لکھ رہا ہوں۔ اگر کوئی مجھ سے ملنے آئے تو کہہ دینا کہ میں یہاں نہیں ہوں۔“

ابن علقمی کے بھائی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اس وقت بہت گھبراہٹا ہوا تھا۔ ابن علقمی کی باتوں سے اسے

اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی بڑا قدم اٹھانا چاہتا ہے۔

ابن علقمی نے وہیں بیٹھے بیٹھے ابن صلابہ والی اربیل کو خط لکھا کئی بار پڑھا۔ پھر اس نے حیب سے ہمدان

نکالی کر خطا پر اپنی ہر گائی۔ اس کا بھائی چپ چاپ بیٹھا اسے خط کھتے دیکھتا رہا۔

ابن علقمی نے خط کو نہ کر کے لٹانے میں بند کیا اور کھڑا ہوتے ہوئے کہا:

”تم اپنی تیاری کرو۔ کل شام سے پہلے پہلے تمہیں اربیل روانہ ہونا ہے۔“

اس کے بھائی نے اس بات کا بھی جواب نہ دیا۔

ابن علقمی اس وقت خرات میں گھرا تھا۔ مغربی بغداد میں اس کے ہمدان موجود تھے لیکن اس وقت مغربی بغداد

طرے سے خلا نہ تھا۔ اس نے رات بھائی کے گھر ہی بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔

سرنے سے پہلے اس نے یہ احتیاط کی کہ اپنے لیے ایک ایسا کمرہ منتخب کیا جس کی پشت پر بھی ایک

زینہ اور خطرے کے وقت وہ باسانی اس طرف سے فرار ہو سکتا تھا لیکن رات بغیر حادثے کے گزر گئی۔

صبح کو وہ جلدی جلدی تیار ہوا۔ اسے مغربی بغداد کا حال اپنی آنکھوں سے جائزہ لینا تھا۔ پھر حرم خلا اور جریش سے مل کر خلیفہ اور شہزادہ ابوبکر کے ارادوں سے آگاہی حاصل کرنا تھی۔

قیوں کا اہم اور مشکل تھے لیکن اس نے کشتی مشکل کی پروانہ کی اور بھائی کے گھر سے نکل کر سیدھا اپنے بونہ میں پہنچا۔

قریب چھ مہینے گزر چکے تھے۔ انہوں نے خوب ننگ مرچ لگا کر ابن علقمی کے کان بھرے۔

انہیں یہ کہہ کر تسی دی کہ ایک خون کے بدلے ہزار خون کیے جائیں گے۔ اس نے تباہ شدہ املاک کے نئے کی ادائیگی کا بھی وعدہ کیا۔

دوپہر کے وقت اس نے حرم خلافت جانے کا قصد کیا۔ یہ مرحلہ بڑا خطرناک تھا۔ وہ گرفتار ہو سکتا تھا قتل بھی سکتا تھا مگر اس نے کسی بات کی پروا نہ کی۔

حرم خلافت پر اس کا حسب سابق استقبال کیا گیا۔ لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس وقت شہزادہ ابوبکر کے پاس موجود ہے تو وہ ذرا سا پریشان ہوا۔ واپس جانے کا اب سوال نہ پیدا ہوتا تھا۔

ابن علقمی نے دربار میں داخل ہو کر آج خلیفہ کو تعظیم پیش کی۔ حالانکہ وہ ان تکلفات سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

ہے کہ اس نے تعظیم کا اظہار شہزادے پر اثر ڈالنے کے لیے کیا ہو۔

شہزادہ ابوبکر، خلیفہ کے دائیں جانب بڑی بے تکلفی سے بیٹھا تھا خلیفہ نے ابن علقمی کو دیکھتے ہی کہا:

”اؤ ابن علقمی! ہم تو تمہارا صبح سے انتظار کر رہے تھے۔“

”ننگ خوار صبح سے مہلک ترخ گیا ہوا تھا خلیفہ معظم!“ ابن علقمی نے نہایت عاجزی کا اظہار کیا۔

خوب خوب۔ خلیفہ ہنسی کر بولا:

”تو تمہیں معلوم ہو گیا کہ ہم نے ہمدانوں کو کیا سزا دی ہے۔“

”جی ان خلیفہ معظم!“ ابن علقمی نے کہا:

”خدا اسی مسئلے میں موٹا گیا تھا۔“

”تم نے وہاں کیا محسوس کیا؟“ خلیفہ نے پوچھا:

”کڑخ والوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کے بارے میں عوام کے کیا تاثرات ہیں؟“

خلیفہ معظم: "ابن علقمی نے سوچ سوچ کر کتنا شروع کیا:

"اہل محلہ، خلیفہ کے اقدام کو بردقت آمد دست سمجھتے ہیں۔ ان کا اور خود اس خادم کا خیال ہے کہ غ میں کچھ لوگ اور بھی ہیں جو اسی منرا کے مستحق ہیں۔"

شہزادے کا دل چاہا کہ وہ بھیج کر کہے: "سب سے بڑا غدار تو تو خود ہے؟"

خلیفہ نے ابن علقمی کو جانے کی اجازت دے دیا۔

شہزادہ ابوبکر صبح سے خلیفہ کے پاس بیٹھا بڑے ادب سے اونچ نیچ بھارا تھا۔ خلیفہ اس کی باتیں سنتے

بغداد میں اس سازش کے انکشاف کے بعد حالات کا تقاضا تو یہ تھا کہ خلیفہ مستعصم کی آنکھیں کھل

خلیفہ مستعصم نے یہ جملے بڑی متانت سے ادا کیے۔ ایک طرف ابن علقمی کا دیرینہ خوف، دوسری طرف ان کا پڑھ کر اس کے تدارک کی کوشش کرنا لیکن اس نے کیا یہ کہ شہزادے کے جاتے ہی

حکم کی دیر تھی۔ سازندوں نے ساز جوڑے۔ مگر ملائے اور حسین مغنیوں نے تانیں بکھیرنا شروع

خلیفہ معظم: "یہ تو یہ ہے کہ علیحدہ نے یہاں قدم اٹھا کر اپنی ذمے داریوں کا پورا ثبوت دیا ہے۔ اور بن۔ عمل کے درو دیوار راگ را گینوں سے گونج لٹے۔ شاہی بیگیت اور خوبصورت کمیزوں نے خلیفہ کو گھیرا۔

پھر غمہ خنجر کی تانوں اور درقاہوں کے توڑوں پر جھوم جھوم کر ان پر زور و جاہر بچھا اور کرتار ہا۔ نہ اسے

دوپہر سے شام ہو گئی۔ تب کہیں جا کے خلیفہ کی مکدر طبیعت کچھ بحال ہوئی اور غصہ رنگ و بو کو ختم

شہزادے دیکھا کہ تم نے۔ ہمارا وزیر اعظم کیسا دور اندیش ہے۔ اب تم اپنے دل سے یہ خیال نکالو

ابن علقمی اپنے فرقتے کا طرف دار ہے۔

خلیفہ نے اپنے بھولے پن میں شہزادے کی کئی ہوئی وہ بات بھی اگلی دی جو اسے ابن علقمی کے ماہ

کنا چاہیے تھی۔

ابن علقمی کو موقع مل گیا۔ اس نے فوراً کہا:

دولت عباد کو میں یقین دلانا ہوں کہ مجھے خلافت عباسیہ سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔

نہ فرقہ، نہ مذہب، نہ گھر اور نہ اہل خانہ۔

شہزادہ کیا کہتا۔ خلیفہ نے اسے ابن علقمی کے سامنے ایک طرح سے ذلیل کر دیا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔

ابن علقمی نے خلیفہ کو ہموار کر لیا تھا۔ اس نے وہاں زیادہ پر بٹھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا:

"خلیفہ معظم! مجازت مرحمت فرمائیں۔ خادم کو مشرق بغداد کے محلوں کا کچھ لگا کر غداروں کا پ

لگانا ہے۔"



ابنِ علقمی اپنے انتظامات میں اس قدر منہمک تھا کہ وہ کئی دن تک جریشہ سے نزل نہ کر سکا۔
دریائے جلع کے دونوں کناروں پر دیوار کے سپاہی ہمہ سہ دے رہے تھے۔ اس لیے جریشہ
قصر بھوقہ جلنے کی کوشش نہ کی۔ اب وہ خود سے وہاں جانا ہی نہ چاہتی تھی۔ ابنِ علقمی سے اس کا دل
اچاٹ ہو گیا تھا بلکہ اسے اب اس سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ اس بدکارانہ کامیہ نہ سہل کیسے جاگ اٹھا
سے اک دم بے پند محبت ہو گئی تھی۔ وہ بغداد کی بربادی کے تصور ہی سے کانپ اٹھتی تھی۔
پھر ایک دن بغداد میں جگہ جگہ فرقہ دارانہ فساد پھوٹ پڑے۔

مدیوں سے ایک ساتھ رہنے بسنے والے ایک دوسرے کا گلہ کاٹنے لگے۔ یہ فساد کوئی نہ
لیکن اس دور میں جب کہ دشمن سر پر مڈلارہ تھا اس فساد نے بڑا نقصان پہنچایا۔ دیوار نے بڑا
کی کہ صورت حال نہ بگڑے لیکن ابنِ علقمی اس کے ہوا سے رہا تھا۔
جریشہ کی ملاقات شہزادہ ابوبکر سے بھی کہی ہوئی۔ حرمِ خلافت میں آتے جلتے کبھی ان کا سامنا
وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہزاروں داستانیں بیان کر دلاتے۔

اُس شام جریشہ کی بے چینی میں بے حد فائدہ ہو گیا جب اس کی ایک سہیلی کینز نے جریشہ کو بڑی
انداز میں ایک اہم خبر سنائی۔

کینز نے جریشہ کو بتایا:

”آج کی رات شہزادہ ابوبکر پر بہت بھاری ہے۔“

”کیا بکواس کر رہی ہے تو؟“ جریشہ نے اسے پھر ڈک دیا۔

”مکہ! میں جو کہہ رہی ہوں وہ ٹھیک ہے۔“ جریشہ کی سہیلی کینز میں اسے محبت سے مکہ کہتی تھی۔

جریشہ گھبرا گئی۔ اس نے پیار سے پوچھا:

”کیا مطلب ہے تو؟ ٹھیک ٹھیک بتا مجھے!“

”صبح کو تم سنو گی کہ شہزادہ ابوبکر قتل....“ کینز کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی جریشہ نے

منہ پر ہاتھ رکھ دیا:

”تیرے منہ میں خاک۔ کیسی بد شکونی! تمہیں کو رہی ہے۔“ جریشہ نے بکڑ کر کہا:

”اگر شہزادہ نہ رہے گا تو بغداد بھی باقی نہ رہے گا۔ ایسی بات منہ سے نہ نکال۔“

جریشہ خاموش ہو کر کینز کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ کینز کو ڈانٹ پڑی تو وہ منہ چھلک کر

نے دیکھا کہ کینز نہارا میں ہو گئی ہے تو اسے محبت سے پکڑ کر اس نے اپنے پاس بٹھالیا اور چرچٹ

خدا پر رحم لے لیا۔

کینز جنس پڑی جریشہ بھی سننے لگی۔

”ہاں اب بتا۔ تو نے یہ بات کس سے سنی۔ میرا تو کچھ دہلایا جا رہا ہے۔“ جریشہ نے پیار سے پوچھا۔

”شہزادے کے قصر ریحان میں ایک محافظ بھڑلا رہا ہے۔“ کینز نے بتایا:

”اس محافظ کی بیوی ہمارے داروغہ صلیح کی بہن ہے۔ اس کی بیوی اپنے بھائی سے ملنے آئی ہوئی تھی۔“

عند اسے لے کر فوراً چلا گیا۔ داروغہ صلیح بھی جان بچانا پھر رہا ہے۔ خدا جانے کچھ رات کیا ہوگا۔“

یہ کینز جاہل سی تھی۔ اس نے ایک مختصر بات کو اس قدر گھما پھرا کر بتایا کہ جریشہ کی سمجھ میں بات آگئی اور وہ

شہزادے کے انجام اسے کانپ اٹھی۔ وہ سمجھ گئی کہ شہزادے کے محل ریحان میں کے محافظوں میں بھی ابنِ علقمی کے

اڈی شامل ہیں اور شاید وہی موقع پاکہ شہزادے کا حاتمہ کر دیں گے۔

جریشہ نے فوراً عازانی کو بلا دیا۔ عازانی پر جریشہ پوری طرح اعتماد کرتی تھی۔ اس کے منیکٹر کو جریشہ نے اپنے

محل کے محافظوں کا داروغہ مقرر کر دیا تھا۔

جریشہ عازانی کو تنہائی میں لے گئی اور بولی:

”عازانی! میں ایک ضروری کام سے مغربی بغداد جا رہی ہوں۔“

”وزیرِ اعظم ابنِ علقمی سے ملنے.....“ عازانی نے ہلکتے ہوئے جریشہ کی بات کاٹ دی۔

”خدا کی مار اس منحوس پر۔“ جریشہ نے کہا:

”اں۔ میں اسی سے ملنے جا رہی ہوں لیکن ایک نہایت ضروری کام کے لیے۔ میری مدد موجودگی میں تمہارا کام

ہے کہ حرمِ خلافت پر نظر رکھو۔ یوں سمجھو کہ تمہیں میری جگہ کام کرنا ہے۔ شہزادہ ابوبکر ممکن ہے کہ خلیفہ سے ملنے آئے

تم اس کے قریب سے گزرتے ہوئے بڑی ہوشیاری سے میرا یہ پیغام دینا کہ وہ اپنے قصر ریحان میں اس وقت

ٹھک نہ جائے۔ جس تک میں اس سے نزل لوں۔“

عازانی کی سمجھ میں جریشہ کی بات اچھی طرح نہ آ سکی۔ وہ الجھنے لگی اور بولی:

”تمہارا مطلب ہے کہ شہزادہ تمہارا انتظار کرے۔“

”صرف انتظار رہی نہیں بلکہ جب تک میں واپس آ کر اسے قصر میں جانے کی اجازت نہ دوں ہاں ادھر کا

کسی صورت میں رخ نہ کرے۔“ جریشہ نے اسے جلدی جلدی سمجھانے کی کوشش کی۔

”اب میں سمجھ گئی۔“ عازانی نے کہا:

”تمہارا مطلب ہے کہ شہزادے کو قصر ریحان میں خطرہ ہے۔ وہاں نہ جلتے اور تمہارا انتظار کرے۔“

جریشہ کو ہنسی آگئی اور بولی:

"ما زانی۔ اب تو سمجھا رہی ہو گئی ہے۔ میں اس مجھے کو تیری رخصتی کرادوں گی۔"
ما زانی نے شرمناک مہر جھکا لیا۔

جریشہ تیز بہہ قدموں سے صدر دروازے کا طرف بڑھی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد وہ رک اور پوچھا۔
ہوئے واپس آگئی۔

"خیر تو ہے۔ واپس کیوں آگئی؟" ما زانی نے حیرانی سے پوچھا۔

"میں پشت کے دروازے سے جاؤں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا بیچا کیا جائے۔" یہ کہتی ہوئی جریشہ
دروازوں کے اس جھنڈ میں غائب ہو گئی جہاں ایک خفیہ دروازہ موجود تھا۔



جریشہ، بغداد کی مام خواتین کے لباس میں تھی۔ اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ وہ پیادہ پا سڑکوں کی گلیوں
عبور کرتی پل پر پہنچی۔ پل پر فوج کا پسر رہ تھا۔ فوجیوں کے علاوہ اسے ابن علقمی کے جاسوس بھی ادھر ادھر گھومنا
دکھائی دیے۔ ان جاسوسوں کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ جاسوس بھی اس سے واقف تھے لیکن معمولی کپڑوں کی وجہ سے
اسے کوئی نہ پہچان سکا۔

پل سے تھوڑی ہی دور قصر سلجوقیہ تھا جہاں اس نے کتنی ہی رنگین راتیں گزاری تھیں لیکن اس وقت اس
دھڑک رہا تھا۔ وہ شہزادے کے لیے اپنے دل میں ایک کسک سی محسوس کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے شہزادہ
سے اتنی ہمدردی کیوں ہو گئی ہے۔ کہیں اسے محبت تو نہیں ہو گئی۔

قصر کے دروازے میں داخل ہونے لگی تو ایک پسرے دارنے اسے روک لیا۔ وہ بڑھ کر اس کے کمرے
اور حشرات سے اسے دیکھنے لگا۔

جریشہ کو اس کی حشرات یا حاکمت پر ہنسی آگئی۔

"جریشہ!" جیشہ نے آہستہ سے پھر پیادہ سے کہا اور پھر سے دار یہ نام سن کر اچھل کر اس طرح چمچے
جیسے کوئی ساپ کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جائے۔

جریشہ محل میں داخل ہو گئی لیکن محل میں اسے کبھی جگہ اپنے نام کا سہارا لینا پڑا۔ ایک پسرے دار نے
اس کا نام سن کر بھی اسے آگے جانے کی اجازت نہ دی۔ اور جیشہ کو مجبوراً منہ پر بیٹھا ہوا رومال بنا کر لے

چہرہ دکھانا پڑا۔

ابن علقمی اپنے حواریوں میں گھبراہٹ مٹا تھا لیکن جیشہ کی آمد کی خبر سن کر اس نے سب کو رخصت کر دیا اور اس
کمرے میں آیا جہاں جیشہ بیٹھی تھی۔

ابن علقمی نے آتے ہی کہا:

"کہاں رہ گئی تھیں جیشہ۔ تمہیں دیکھنے کو تو آئیں تری گئیں۔"

ابن علقمی نے دیکھ کر یہ منہ دیکھی باتیں۔ ہم نے دیکھ لی آپ کی محبت۔ جیشہ نے ایسے اٹھلا کے کہا کہ ابن علقمی
کا دل سے چین ہو گیا۔

ابن علقمی اس کے پاس بیٹھ گیا اور محبت سے بولا:

"معتل کرنا جیشہ۔ ادھر کچھ دنوں سے کام میں ایسا لکھ گیا ہوں کہ مجھے تن بدن کا ہوش نہیں۔ تم سناؤ
کیا خبریں ہیں ہمارے خلیفہ ہمدرد کی۔"

"آپ کا ابھی سے یہ حالت ہے۔ کچھ دن جانے کے بعد تو شاید آپ اس بونڈی کا ام بھی بھول جائیں گے۔"
جیشہ نے سناں سنی کر کے ٹکاوٹ کا انداز اختیار کیا۔ دراصل وہ چاہتی تھی کہ ابن علقمی کچھ گھلے اور ابن علقمی اس سے
جویم خلافت کی خبریں سننے کے لیے بے چین تھا۔

"میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتا جیشہ۔" ابن علقمی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

"میں سناؤ۔ کیا مال ہے خلیفہ معظم کا۔" ابن علقمی کو پھر خبر نہ سننے کا دورہ پڑا۔

"خلیفہ کیا کرے گا لیکن شہزادہ ابوبکر کا زردن ہلن بڑھتا جا رہا ہے۔ جیشہ نے دار کے جواب میں خود بھی
دار کر دیا۔

ابن علقمی بڑا چالاک تھا لیکن عورت جسے ناقص العقل کہا جاتا ہے اس کی خفیہ صلاحیتوں سے جیسے ناواقف تھا۔ وہ
جیشہ کے جھول کا مطلب نہ سمجھ سکا اور اس نے فوراً ڈینگ ماری:

"اس حرامی بچے کی فکر نہ کرو۔ اسے کل کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔"

جریشہ نے بڑے ضبط سے کام لیا اور کسی رد عمل کا چہرے سے اظہار نہ ہونے دیا بلکہ بڑے اطمینان
سے بولی:

"آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں بھی یہی کہنے والی تھی کہ اس کا منہ کو فوراً نکال دیا جائے۔"
ابن علقمی ہنس کر بولا:

"ہم نے ماری آرزو کہنے سے پہلے ہی پوری کرنے کا بندر بست کر دیا۔ اب تو تم خوش ہو! "

جراثیم جو اب تک ابنِ علقی کے پیلو سے پہلو ملے بیٹھی تھی اک دم ایسے چوکی جیسے اسے کوئی زبردست خطرہ محسوس ہوا ہو۔

”کیا ہوا تمہیں؟“ ابنِ علقی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

جراثیم جس نے اپنے چہرے پر شدید پریشانی کے آثار پوری طرح طاری کر دیے تھے اس نے اپنے ہاتھ ابنِ علقی کے گلے میں ڈال دیے اور پھر بھرائی ہوئی آواز اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ بڑے دکھ بھر انداز میں بولی:

”نہ..... نہ..... مجھے تو آپ کی زندگی چاہیے۔ شہزادے کے قتل ہونے پر دیو دارفت کو دس خدا نوا سنتے آپ..... آپ..... میں آپ کو زندہ رکھنا چاہتی ہوں۔“

ابنِ علقی، جراثیم کے جذبات سے بڑا متاثر ہوا اس نے سوچا جراثیم کو واقعی اس سے محبت ہو گئی ہے ابنِ علقی نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا:

”جراثیم! تم بالکل ٹھیک نہ کر دو۔ یہ قتل اس طرح ہو گا کہ اس کی خبر کسی کو نہ ہو سکے گی!“

”میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔“ جراثیم نے حیرت کا اظہار کیا۔ اس نے اب تک جو مکاری یا دھمکاری کی تھی وہ تمام تر مقصد ہی تھا کہ وہ ابنِ علقی سے یہ معلوم کرے کہ اس نے شہزادے کو قتل کرانے کے لیے کیا طریق اختیار کیا ہے۔

ابنِ علقی نے بڑی محبت سے جراثیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”شہزادہ آج رات قہر تلج سے قہر رہا میں جلتے گا۔ اس نے سپہ سالار اور دوسرے سرداروں کی دعوت قہر تلج اور قہر رہا نہیں کے درمیان غریبی کی ایک ذیلی سرک چھوٹی سی پھلیا ہے۔ شہزادے کے ساتھ چار آدھ میوں سے زیادہ نہ ہوں گے۔ پھیلا پھینچتے ہی ہمارے آدمی اسے گھیر کر گرفتار کریں گے۔ قتل کر دیں گے۔ کبھی کاؤں کان خبر بھی نہ ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی بغداد کے گلے کو چوں میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ سب اپنی اپنی بڑھانے لگی۔ شہزادے کو کون تلاش کرے گا۔“

گنتا گنت منصوبہ تھا ابنِ علقی کا۔

جراثیم ابنِ علقی کی باتوں میں جکڑی تھی لیکن اس کا جسم خوف سے قہر قہر لے لگا۔ ابنِ علقی نے اسے کہتے ہوئے سن کر کہا:

”بس ڈر گئیں۔ آخر ہونا عورت!“

جراثیم نے اسے تو کوئی جواب نہ دیا لیکن دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر وقت ملا تو وہ ابنِ علقی کو دکھائے گی کہ وہ

حالت ہوتی ہے۔

لاہین شریف کا ایک وفد ابنِ علقی سے ملنے آیا۔ اسے مجبوراً جراثیم کو چھوڑ کر جانا پڑا۔ جراثیم دل سے یہ باتی تھی اس کے آنے کا مقصد تو پورا ہو گیا تھا۔

ابنِ علقی باہر جانے لگا تو جراثیم بولی:

”میں رات کو پھر آ جاؤں گی۔“

ابنِ علقی نے رک کر کچھ سوچا پھر کہا:

”نہیں۔ آج رات نہیں۔ میں خود نہیں بلواؤں گا۔“

جراثیم کی جان بھٹی اس نے روال مز پر ڈالا اور جس راہ سے آئی تھی اسی راستے سے تیز قدم اٹھاتی اپنے محل کو روانہ ہوئی۔ اس کا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا مگر قدم خود بخود تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔

محل میں بھاگتے ہوئے وہ لوہوں داخل ہوئی جیسے موت اس کا پیچھا کر رہی ہو۔ وہ ادھر ادھر کر دلوں میں بھاگتی پھر رہی تھی۔ اسے عازانی کی تلاش تھی۔

جراثیم کو معلوم ہوا کہ عازانی حرمِ خلافت گئی ہے۔ اسے یہ بھی بتایا گیا کہ خلیفہ مستعصم نے اسے بھی بلا بھیجا ہے۔ جراثیم نے حرمِ خلافت کا رخ کیا۔۔۔۔۔ مگر کچھ سوچ کر رک گئی۔

وقت بڑا قیمتی تھا۔ وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہتی تھی۔ حرمِ خلافت میں داخل ہونا آسان تھا لیکن وہاں سے واپسی بغیر خلیفہ کی مرضی کے نہیں ہو سکتی تھی اور خلیفہ کی مرضی میں کون دخل دے سکتا تھا۔

وہ اسی اصرار میں تھی کہ عازانی واپس آئی دکھائی دی۔ اسے دیکھ کر جراثیم کی جان میں بان لگئی۔

”شہزادہ ابوبکر کہاں ہے؟“ جراثیم کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ عازانی کو دیکھ کر بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی تھی۔

”شہزادے کو پیغام پہنچا دیا گیا ہے۔ عازانی نے بتایا۔“

جراثیم کے دل سے جیسے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔

جراثیم، عازانی کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ پھر لوہچا:

”خلیفہ نے مجھے کیوں طلب کیا تھا؟“

”بس یونہی عازانی بولی:

”تمہارے بھائی میں خود گئی تھی۔ خلیفہ کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ تم کئی دن سے حرمِ خلافت نہیں

گئی ہو۔۔۔۔۔“

ہوں۔ تم نے میرے بارے میں ضیغہ سے کیا کہا؟ جراثیم نے بے پنی سے پوچھا۔
"میں نے کہہ دیا کہ جراثیم کئی دن سے بیمار ہے۔ وہ اپنے کمرے سے کم ہی نکلتی ہے۔ عازانی نے جو
ظلیغہ سے کہا تھا وہ بیان کر دیا۔

"شاباش عازانی! کج تم نے بڑا کام کیا! جراثیم کے چہرے پر رونق آگئی۔
"تمہارے اس کام کا کیا بنا جس کے لیے تم کئی تھیں۔ عازانی نے دلچسپی سے مسکراتے ہوئے کہا:
"ابن علقمی نے تو نہایت خوب خاطر میں کی ہوں گی۔"

جراثیم اسے کوئی تفصیل نہ بتانا چاہتی تھی۔ اس نے ہنس کر بات ٹال دی اور پوچھا:
"شہزادہ کب آیا تھا۔ میرے پیغام کا اس نے کیا جواب دیا؟"

"تم خود ہی جا کر اندے پوچھ لو۔ ظلیغہ قیلولہ فرما رہے ہیں۔ شہزادہ ان کے بیدار ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔
عازانی کی زبان سے یہ بات سن کر جراثیم بہت خوش ہوئی۔ اس نے اسی وقت شہزادے سے ملنے کا ارادہ کر لیا۔
"عازانی! میں شہزادے سے ملنا چاہتی ہوں۔ جراثیم لولی؛

"لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں خود اس کے پاس جاؤں یا اسے یہاں بلاؤں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟
عازانی نے ایک لمحہ سوچا پھر کہا:

"میں دونوں باتوں کے غلط ہوں۔ شہزادے سے وہاں یا یہاں دونوں جگہ ملاحظہ سے خالی نہیں۔
وزیر اعظم کے پاس ہر جگہ منڈلا رہے ہیں۔
جراثیم کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ اس نے عازانی کا مشورہ قبول کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ جراثیم
دراصل اس وقت بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔ اسے شہزادہ ابوبکر کے ساتھ گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور وہ ہر صورت میں
آج کی سازش کا تفصیل سے اسے آگاہ کرنا چاہتی تھی۔

"اچھا تو پھر یہ کام تمہیں کرنا ہو گا۔ جراثیم نے کہا:

"تم شہزادے کو میرا دوسرا پیغام پہنچا دو۔ بہت ہوشیاری سے۔ کوئی دوسرا نہ سننے پائے۔
پیغام اتار دے۔ عازانی نے ہنس کر کہا:

"اب کوئی اچھا پیغام دیتے ہیں۔ وہ بے چلے سے پہلا پیغام سن کر ہی بہت پریشان ہیں۔

"میں اچھے پیغام کا کتاب شاید ہی وقت آئے۔ جراثیم کے دل سے اس کا ہوا کسی اچھی:

"تم شہزادے کو جا کر یہ پیغام دو کہ قہر تاج اور قہر پائیں مکے درمیان، نہر عیسیٰ کی ذیلی نہر پر جو چھوٹی پلیا ہے
اس پر شہزادے کی موت نے قبضہ کر رکھا ہے۔ سنا پیغام۔"

وہاں۔ سمجھ لیا اور یاد بھی کر لیا۔ عازانی نے جراثیم کو اطمینان دلایا۔
"یوں نہیں۔ جراثیم نے کہا:

"میرا پیغام تم اپنی زبان سے دہراؤ۔ پھر مجھے اطمینان ہو گا عازانی یاد رکھو۔ اگر پیغام میں ذرا غلطی ہو گئی تو
شہزادہ ابوبکر زندہ نہ رہے گا۔ تمہیں اس پیغام کی اہمیت اپنے ذہن میں رکھنی چاہیے۔
عازانی نے جراثیم کے اطمینان کے لیے اس کا پیغام دہرایا۔ اس نے ایک لفظ بھی ادھر ادھر نہ کیا۔ یہ پیغام
تو جیسے اس کے دل پر نقش ہو گیا تھا۔

عازانی چلی گئی اور جراثیم کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگی۔

رات کو نہر عیسیٰ کی ذیلی نہر کی پلار پر ایک زبردست معرکہ ہوا۔ خوب تلوار چلی۔ لوگوں نے پچاس لاشیں نہر
میں ہتی ہوئی دیکھیں۔

مرنے والے کون تھے؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔



ابن علقمی، قہر سلوکیہ میں بیٹھا شہزادے کے قتل ہونے کی خبر سننے کے لیے بے چین تھا۔ نہر پر لڑائی ہوئی۔
یہ خبر تو اس تک پہنچ گئی تھی لیکن وہ لوگ جنہیں شہزادے کے قتل پر مامور کیا گیا تھا، ابھی تک ان میں سے
ایک بھی واپس نہ آیا تھا۔

جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

ابن علقمی کے فساد برپا کرنے والے آدمی محلے محلے چھپے حکم کا انتظار کر رہے تھے لیکن انہیں کوئی حکم نہ ملا۔
ابن علقمی کیسے احکام جاری کرتا۔ ابھی تک اسے شہزادہ ابوبکر کے قتل کی خبر نہ ملی تھی۔ اور پھر اسے ایک بلے حد
پریشانی تک خبر پہنچائی گئی۔

مغربی بغداد کا ایک شہری گھرایا ہوا قہر سلوکیہ پہنچا۔ اسے فوراً ابن علقمی کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کی
پریشانی اور گہرا ہٹ ہی سے ابن علقمی کا دل ٹوٹنے لگا۔ اسے شہری سے کوئی سوال کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

شہری نے خود ہی زبان کھولی:

"وزیر اعظم محرم! ہمارا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ ہمارے تمام آدمی مارے گئے۔ ایک بھی زندہ نہ بچا۔ دیودار
کے لشکر کی لگی کوچوں میں نیکی تلواریں لیے گھوم رہے ہیں۔"

ابن علفی کی آنکھوں میں اندھیرا سا ہو گیا۔ اسے پرانے ستر مکتوبہ گھومتا ہوا معلوم ہوا۔ قصر کی مشعلیں جھلک رہی تھیں۔ اس نے سانس سے ایک لگائی۔

شہری چپ چاپ ابن علفی کا مچھایا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ابن علفی نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور بڑی مشکل سے کہا:

”اور شہزادہ ابو بکر....“ اور اس کے گلے میں اٹک گئی۔ ابن علفی جملہ پورا نہ کر سکا۔

”شہزادہ ابو بکر گھوڑے پر سوار دیو دار کے ساتھ پورے بغداد میں گشت کر رہا ہے۔ فوجی دستے اس کا حفاظت کر رہے ہیں....“

شہری نے کچھ اور تفصیل بھی بتائی مگر ابن علفی کچھ نہ سن سکا۔ اس کا تہا آمدن سن سنا رہا تھا۔ اس نے منہ کے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ شاید اسے غش آ گیا تھا۔



سمنے کے ایک بڑے طشت میں بیس عدد تر بوڑ رکھے تھے۔ طشت چاندی کی چھوٹی چوکی پر رکھا تھا۔ تر بوڑوں کا چھلکا اتار دیا گیا تھا۔ گول گول سرخ تر بوڑ دور سے انسانی سر دکھائی دیتے تھے جن سے خون ٹپک رہا ہو۔

ہلاکو خان کو سمرقندی تر بوڑ بہت پسند تھے۔ وہ اندر سے خون جیسے سرخ ہوتے تھے۔ دوسری چوکی پر سفید گھوڑی کے دودھ کی چار بالٹیاں بھری رکھی تھیں۔.... تیسری چوکی پر اعلیٰ قسم کی ایرانی شراب کے قدحے دھرے تھے۔

یہ ہلاکو خان کا دربار تھا۔ وہ فارس و عراق کا بادشاہ تھا۔ وہ فارس جس پر کسریٰ وجہت یہ حکومت کر چکے تھے جس کی مٹی میں آج بھی شہب زان اسلام کے خون کی خونچوم موجود تھی۔

ہلاکو بغداد سے ابن علفی کا خط لانے والے کو حشرات سے دیکھ رہا تھا۔ قاصد ابن علفی کا چھوٹا بھائی تھا۔ ہلاکو کے ایک طرف خواجہ نصیر الدین طوسی دست بستہ کھڑا تھا۔ ہلاکو نے اسے دربار قرار میں پھینکنے کے بجائے اپنا وزیر اعظم بنایا تھا۔ ہلاکو اس فلسفی اور کیمیاگر کی باتیں بڑے نور سے سنتا اور اس سے مشورہ لیتا تھا۔

خواجہ طوسی کے برابر اریل کا حکم ابن صلابا تھا۔ ابن صلابا ابن علفی کے بھائی کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ ہلاکو کے بائیں جانب مکہ فارس دو قوز خاتون کا گرگاجھی تخت تھا۔ وہ بڑی شان سے ایرانی لباس پہنے تخت پر

بیٹھی تھی۔

دو قوز کے تخت کے پیچھے مغل سپہ سالار فطو بونا گلے میں صلیب لٹکاٹے موجود تھا۔ قوط بوعف اور دو قوز دونوں ہی سیٹھی ہو چکے تھے۔

ہلاکو کے اشارے پر دو ایرانی خوشہ ڈائیں ساتھی گری کے لیے آگئیں۔ ایک نے گھوڑی کے دودھ کی بالٹی اٹھائی۔ دوسری نے بڑے بڑے گلاس بھر کر ہلاکو خان کو دینا شروع کیے۔

ہلاکو خان کی گلاموں سے سیری نہ ہوئی۔ اس نے لڑکی کے ہاتھ سے بالٹی لے کر منہ سے لگائی اور ایک ہی سانس میں غٹا غٹا حلق سے اتار گیا۔ اس طرح اس نے دوسری بالٹی بھی پی لی۔ پھر اس نے شراب کی طرف اشارہ کیا۔ لڑکیوں نے شراب کے گلاس بھرنا شروع کیے۔ ہلاکو خان کو سرور محسوس ہوا۔

ہلاکو خان نے اپنی مکہ دو قوز کی طرف دیکھا اور پوچھا:

”تو جانتی ہے ابن علفی کون ہے؟“

”ہاں! دو قوز نے جواب دیا:

”بغداد کے خلیفہ کا وزیر اعظم ہے۔“

”پھر تجھے بھی یہی معلوم ہو گا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔“ ہلاکو نے ایک بے سنگم تہقہ لگا یا۔

دو قوز انکار یہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی:

”پتہ نہیں۔ کیا چاہتا ہے۔“

ہلاکو نے خواجہ طوسی کو مخاطب کیا:

”اے پیر دانا۔ پڑھ کہ ابن علفی نے کیا کھلے ہے؟“

ابن صلابا نے خط خواجہ طوسی کی طرف بڑھا دیا۔ خواجہ طوسی نے نفاذ چاک کر کے خط نکالا اور پڑھنا

شروع کیا:

”موبد الدین محمد بن علفی وزیر اعظم خلافت عباسیہ کی طرف سے!“

ہلاکو خان نجات دہندہ کے نام....“

نجات دہندہ کے نام پر ہلاکو خان چونکا۔ اس نے خواجہ طوسی سے پوچھا:

”پیر دانا۔ یہ نجات دہندہ کیا جو تلم ہے؟“

”نجات دہندہ کے معنی میں مظلوم کو ظالم کے ہاتھ سے چھٹکارا دلانے والا۔“ خواجہ طوسی نے

ذرا سست کی۔

ہلا کو کچھ سوچتے ہوئے بولا:

"لیکن میں نے کس مظلوم کو چھٹکارا دلا یا؟"

"آپ نے شیخ ابیہل کو ختم کر کے اس کے ظلم سے لوگوں کو نجات دلائی ہے۔" خواجہ طوسی نے بے پروائی
اظہار کیا۔

"خوب خوب۔ ہاں وہاں ہشتے ہوئے بول:

"میں نے شیخ ابیہل کو قتل کر کے اس کے علاقے کے تمام لوگوں کو تہ تیغ کر کے ان کو زندگ سے چھڑ
دلا دیا۔ ابین علی بھی چاہتا ہے کہ میں بغداد کے تمام لوگوں کو زندگی سے نجات دلا دوں۔"

"جی ہاں۔" خواجہ طوسی بول:

"ابین علی کا یہی مطلب ہے۔"

خواجہ نے خطا آگے بڑھنا شروع کیا:

"ابن بغداد عباسی خلیفہ کے ظلم و ستم سے عاجز ہیں۔ وہ ایک

نجات دہندہ کے منتظر ہیں اور وہ نجات دہندہ صرف آپ ہو سکتے

ہیں۔ ہم آپ کا استقبال کریں گے۔ ہم پورے تعاون کیلئے

آمادہ ہیں بشرطیکہ فتح بغداد کے بعد ہمیں اور ہمارے بعض محلوں

کے لوگوں کی جان و مال کی امان کا وعدہ کیا جائے۔۔۔"

ابین علی نے اپنے طویل خط میں اپنے لیے بھی بعض مراعات کی درخواست کی تھی اور لکھا تھا کہ بغداد پر فوراً حملہ
کر دیا جائے ورنہ اس کا امکان ہے کہ معری فوجیں خلیفہ کی مدد کو آجائیں گی۔

مصر کا نام سن کر ہلا کو خان کو جیشہ غصہ آجاتا تھا۔ مصر کی فتح کا حکم اس کے دادا چنگیز خان نے بھی دیا تھا اور اب

خاقان منگو خان نے اسے قراقرم سے جوئر لیغ (دفران) بھیجا تھا اس میں بھی درج تھا کہ سمرقند سے مصر کے آڑی ہر

تک فتوحات حاصل کر دو اور چنگیز خان کے قانون کو جاری کر دیجئے خان کے قانون سے شاید یہ مراد تھی کہ ہر

ملک کو فتح کر دے یا ختم کر کے زمین بوس کر دو اور آبادی کا قتل عام کر کے مردوں کے مینار بناؤ۔

۶۲۰ ہجری میں جب بغداد کے عباسی خلیفہ مستنصر باللہ کا انتقال ہوا تو اہلسنت اور قیامت کے منتظر

سے مستنصر کا بھائی ختاجی سب سے زیادہ خلافت کا مستحق تھا لیکن امیر دیودار (دیوار دیوار) اور امیر رانی دیورک

کو ششوں سے مستنصر باللہ جو اجرائی ایک لوندی کے بطن سے تھا، بغداد کا خلیفہ بن گیا۔

خلیفہ مستنصر میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ وہ نیک فطرت، نرم خو، شیریں زبان اور خوش اخلاق تھا لیکن جہانبا

کے اوصاف سے تھی وامن تھا۔ اس میں نہ تو مستنصر جیسا رعب و اب تھا اور نہ امور سلطنت سے واقفیت تھی۔ اس کا
مار دقت گانے بجانے، منسی مذاق اور تفریحی مشاغل میں گزرتا تھا۔ خلیفہ کی انہی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ابین علی
سیاہ و سفید کا ملک بن بیٹھا تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود خلافت بغداد کو ایک دینی حکومت کی حیثیت حاصل
تھی۔ مسلمانوں کو عباسی خلافت کے ساتھ مذہبی عقیدت تھی۔ اس پر ہاتھ ڈالنے سے دینائے اسلام کے بگڑ جانے
کا اندیشہ تھا۔

اب سے چالیس سال پہلے جب ہلا کو خان کے دادا چنگیز خان نے یغما کی تھی تو اس نے بھی بغداد میں داخل
ہونے کی کوشش نہ کی اور اس کا لشکر بغداد کی تھلی سرحدوں کے ساتھ مغرب کی طرف نکل گیا۔

ہلا کو خان کو خلافت عباسیہ کے وزیر اعظم کی حمایت حاصل ہو گئی۔ بغداد کے دو محلوں کرج اور جی الکاظمیہ

کے لوگوں نے بھی ہلا کو خان کو اپنے بڑے تعاون کا یقین دلایا۔ اس کے باوجود ہلا کو خان خلافت عباسیہ کے

مذہبی تقدس کی وجہ سے بغداد پر حملہ کرتے دردمند تھا اسے دوسو سونے گچھر رکھنا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ ہمیں

خلافت عباسیہ کو بھرتے سے اس پر کوئی آفت نہ نازل ہو جائے۔

پھر اس نے ایک دن خواجہ نصیر الدین طوسی کو تنہا میں بلا کر اس سے سوال کیا:

"اے پیر وانا! تیرا خلیفہ مستنصر اور بغداد کے بارے میں کیا مشورہ ہے؟"

خواجہ نصیر الدین طوسی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہلا کو خان بغداد پر حملہ کرنے کے لیے بے چین ہے۔ پھر اسے

ابین علی کا ایک خط بھی موصول ہو چکا تھا جس میں اس نے خواجہ سے درخواست کی تھی کہ ہلا کو خان کو بغداد پر حملہ

کرنے کے لیے آمادہ کرے۔ خواجہ، بغداد کا باغی بھی تھا۔

خواجہ نے بڑے حلیفانہ انداز میں ہلا کو خان کو کھجایا:

"اے شاہ فارس و عراق! اس دنیا کا کام ایسی چیز پر مبنی ہے۔ یہی بن ذکر یا اور حسین بن علیؑ مسلمانوں کی

بڑی عظیم المرتبت اور محبوب بستیاں تھیں۔ ان کے ہی سر تسلیم کر دیے گئے تو کیا ہوا۔ کوئی قیامت نہیں لگئی۔ یہ

مستنصر ان سے زیادہ غم غم ہے اور نہ محبوب۔ یہ قتل ہو جائے گا تو کیا فرق پڑ جائے گا؟"

خواجہ کی یہ تقریر ہلا کو خان کے دل کو لگ گئی۔ اس کے دوسو سونے گچھے۔ درد در ہو گیا۔

ہلا کو خان نے کہا:

"خلیفہ مستنصر کو اسی وقت خط لکھو۔"

خواجہ نصیر الدین طوسی نے قہقراں سنجالا۔

ہلا کو خان نے کھجایا:

تم جانتے ہو کہ دنیا کی مختلف قوموں کا جنگیز خاں کے زمانے سے اب تک مغل فوجوں کے ہاتھوں کیا حشر ہوا۔ بغداد کے دروازے کبھی خوارزمیوں اور سلجوقیوں پر بند نہیں ہوئے تو پھر تم ہمیں کیونکر داخل ہونے سے روک سکتے ہو۔ دیکھو پرچم جنگیزی کے مقابلے پر نہ آنا ورنہ غماری خیر نہیں۔

اگر رحم کے خواہاں ہو تو دیودار، سیدمان شاہ مرانی یا اعلیٰ کو ہمارے دربار میں بھیجو۔

اس خط کی تحریر خود پکار کر کہتی ہے کہ یہ صرف ہلاکو خاں کی تحریر نہیں بلکہ اس کے پس پردہ خواجہ فیروز طوسی کا دماغ کا فرما ہے۔ خواجہ فیروز اور سلجوقیوں کا حوالہ ہلاکو خاں جیسا جابل کس طرح دے سکتا تھا۔ یہ خط نہیں ہلاکو خاں کا اعلان جنگ تھا۔



دربار خلافت کچھ بھرا تھا اور خلیفہ مستعصم باللہ تخت پر سر جھکا کر بیٹھا تھا۔ تمام عاملین سلطنت دست کھڑے تھے۔ بغداد کی تمام مساجد اور مکاتب کے ناظم و قاضی خاص بلاو سے پر حاضر دربار تھے۔ خلیفہ بغداد مستعصم کے سترو سالہ دور حکومت کا یہ پہلا اور آخری دربار تھا۔ مستعصم نے خلافت کے حصول کے بعد کبھی نہ ملگایا تھا۔ حریم خلافت کے باہر اسے قدم نہ لگانے کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ ہلاکو خاں کا اعلان جنگ، خلیفہ کے حکم سے درباریوں کو پڑھ کر سنایا گیا۔

دربار میں موت جیسا سننا اچھا گیا۔ سب دم بخود تھے۔ وہ ایک دوسرے کا منہ حیرت سے کھٹکے اور ہر چہ لینے۔ کسی میں دم مارنے کا بار نہ تھا۔

خلیفہ مستعصم نے نظریں اٹھا کر درباریوں کو دیکھا۔ پھر قاضی اعظم سے بولا:

”قاضی صاحب! میں اپنے خدا اور اس کے ان بندوں سے شرمندہ ہوں جن کی نیابت کی اس نے مجھے ذمہ داری بخشی۔ میں نے خدا کی امانت میں بیعت کی۔ میں کفرانِ نعمت کا جرم ہوں۔ اب وقت نہیں کہ میں کفارہ ادا کر سکوں اور عصیان کے داغوں کو اپنے دامن سے دھو سکوں۔ مجھے تو صرف اتنا بتایا ہے کہ اسے بے دین ہلاکو خاں کو بغداد سے کیا جواب بھیج سکتے ہیں؟

قاضی نے دربار میں موجود علماء دین پر ایک نظر ڈالی۔ پھر بڑے استہاد سے کہا:

”یہ خلیفہ بغداد۔ قاضی پر آئو ہمارا مسلمان کا شیوہ نہیں اور کافروں کے سامنے مجتہد انا بدلت خور ہے۔

قاضی صاحب! مجھے صرف قرآن و سنت کا حکم چاہیے۔ صرف ایک لفظ میں صلح جنگ یا باطل کی بان دیتی ہے۔ اے افاضی میں ہر اکرب اور بڑی بے چینی تھی۔

قاضی نے پیسے سے زیادہ بلند آواز میں کہا:

”یہ دین اگر اعلان جنگ کر دے تو اس سے صلح جائز نہیں۔ جنگ اس بے کار لڑائی کو کہا جاتا ہے جس کا مقصد نہ ہو اور باطل کی بالادستی اسلحا کے کبھی برداشت نہیں کی۔

قاضی عترت! خلیفہ نے مضطرب ہو کر کہا:

”اگر میں اسلام کے ان باریک کموتوں سے واقف ہوتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ براہِ کم خجے کوئی واضح اور مختصر دیتے۔“

”تو پھر اس اعلان جنگ کا جواب اعلانِ جہاد ہے۔“ قاضی نے اعلان کیا۔

”لاریب، لاریب، لاریب، لاریب۔“ کے شور سے دربار خلافت گونج اٹھا۔

خلیفہ مستعصم کی بے خواب آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک پیدا ہوئی۔ لوگوں میں جوش و خروش اٹھ اٹھا۔

خلیفہ نے ہاتھ کے اشارے سے درباریوں کو خاموش کیا۔ پھر اٹھا:

”اسلام کے پرستارو! قاضی کا نعرہ جہاد تمہارے دل کی آواز ہے۔ میرے دل کو بھی یہ آواز ہے۔ میں جہاد لیتا ہوں۔ میدانِ جنگ میں آپ مجھے مجاہدوں کے درمیان پائیں گے۔“

جوش و خروش اور تحسین و آفرین کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ خلیفہ کی طبیعت میں اس بار پشما اور قہقہوں کو سب سے زیادہ تعجب تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا یہ وہی مستعصم ہے جو چار موزیوں پر

مل کر کھڑوں کے ہجر محمد میں حریمِ خلافت میں گھسا بیٹھا رہتا ہے۔ علماء دین تو مستعصم کو مسلمان بھی تسلیم نہ کرتے۔ بلکہ وہ تختِ خلافت کو عرشِ معنی سمجھتا تھا اس نے قصرِ جہڑ کو کعبے کا نمونہ بنایا ہوا تھا۔ اس نے قصر کے آستانے

کو کعبے رنگ کا ایک سپاہ پھر رکھ دیا تھا جسے لوگ چوتھے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بھروسے سے مہار کو کعبہ آستین لٹکتی تھی جسے لوگ مغرب کعبہ کی طرح آنکھوں سے لگاتے تھے۔

اللہ اللہ! کیا انقلاب تھا۔ یہ اللہ کی دین ہی تو تھی کہ اس نے عرب بے سادہ کا قلب پلٹا دیا کہ اس نے

نمود و ناش اور عیش و عشرت کے جملہ لوازمات سے منہ موڑ لیا۔ شراب کے منکے توڑے گئے۔ سامانِ ہوس
فرش پر بکھر گئیں۔ سازندے مکان سے بھاگ گئے۔ رقی صاوی اور غنیوں نے منہ چھپا لیے۔ آستانے کے
نذر دجلہ کیا۔ اعلیٰ آستین کی دھجیاں اڑ گئیں۔

اور بغداد میں.....!

مشرق و مغرب بغداد کی مسجدیں نمازیوں سے بھر گئیں۔ گھروں سے اٹھتے ہوئے ساز و آواز کے شور
میں اردوں سے لہجہ داؤدی اور طرزِ بامالی میں ازانوں کی اہانِ فردوز اور ایمان آموز صدائیں بلند ہوئیں۔ گناہ
گنہیں۔ چلے پڑھنے لگے۔ تلواریں صیقل ہوئیں۔ خنجر و کواکب دی گئی۔ غدار کو نوں میں دھکے اور درواز
کوزیر زمین جانا پڑا۔

ہر طرف جہاد..... جہاد..... حرفِ جہاد کی صدا تھی!



اور پھر ایک دن شام کے دھندلوں میں چار میں پٹا ہوا ایک سایہ جامعہ نصریہ کی عالی شان مسجد کی
حرکت کو تادکھائی دیا ناظمِ مسجد نے حجرے سے اسے دیکھا اور نکل کر باہر آیا۔ سایہ بزرگ کے قریب پہنچا
پہنچے مارے ان کے قدموں سے لپٹ گیا۔

بزرگ عالمِ دین نے اسے زمین سے اٹھایا۔ سینے سے لگایا پھر سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا:
"کون ہے تو بیٹا اور کون سا جہد بہ تجھے خانہِ خدا تک پہنچ لایا؟" بزرگ نے جنت سے پوچھا۔
اُسے پارسا اور دین کے رکھوالے "ماتے نے زبان کھولی:

تیں گناہگار ہوں۔ بدکار ہوں۔ میں حرمِ خلافت کی کینز، ابنِ علی کی حاسوس اور شہزادے ابوبکر
جوشیہ ہوں۔ تجھے اپنے دامن میں پناہ دے۔ دعا کر کہ میری توبہ قبول ہو اور میرے دل کو سکون مل جائے۔
تو توبہ بھی بند نہیں ہوتا بیٹا! بزرگ نے کہا:

"پناہ حاصل کرنا ہے تو صرفِ دل سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی چادر سے لپٹ جا۔ میں تمہارا
کیا دے سکتا ہوں۔"

جوشیہ کا جسم لرزا۔ آواز بھرائی اور دل پکار اٹھا:

"لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔"

ان الفاظ کا زبان سے سدا ہوتا تھا کہ جوشیہ کا دل ٹھہر گیا۔ سیمان کم ہو گیا۔ طوفانِ فتنہ گیا۔ اس کی آنکھیں چمک
پانی سے اس کا چہرہ گھٹا ہو گیا۔

چہرہ عالمِ دین کے دامن میں منہ چھپا کر اتنا روئی کہ بچکیاں بندھ گئیں اور دامنِ انسِ ندامت سے

یہ سکونِ قلب کی انتہائی جوشیہ کو اسی کی تلاش تھی!

اسے بزرگ میں نے جو چاہی تیری دعا سے مل گیا۔ بس ایک خواہش اور ہے اس کے لیے دعا فرما "جوشیہ آنسو
ڈالے ہو۔"

بزرگ نے منبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

اس سولا کی نظریں اپنے گھر کے منبر سے کبھی نہیں ہٹتیں۔ یوں جگہ تیری شہ رگ سے زیادہ قریب تر ہے
نایاب کر میں دعا کے لیے ہاتھ بند کرنا ہوں۔"

میری خواہش ہے کہ میں شہادت کے درجے پر سرفراز ہوں۔ "جوشیہ نے بڑے درد سے کہا۔

بزرگ ناظمِ جامعہ نے ہاتھ نیچے کر لیے اور بولا:

"بیٹا! اس خواہش کو دعا کی سفارش کی ضرورت نہیں۔ آج بغداد کے ہر بوڑھے اور بچے کے دل کی یہی
دعا اور ان کی آواز میں آواز ملا۔ کیا عجب کہ تیری خواہش وہ مولائے کریم پوری کر دے۔"

جوشیہ ایک نئے جذبے سے سرشار تھی۔ اسے اپنا جسم ہکا سوس ہو رہا تھا۔ شوقِ شہادت اس کی رگوں میں خون
دھا تھا۔ وہ عالمی دامنِ آبی تھی اور جھوٹی بھر کے جارہی تھی۔

وہ ٹیڑھیوں پر پہنچی تھی کہ شہزادہ ابوبکر سر چڑھا کر اوپر آتا دکھائی دیا۔ جوشیہ نے جلدی سے رد مال پھر
بڑالیا اور واپس آکر بزرگ عالمِ دین کی اسٹمپ کھڑی ہو گئی۔

شہزادہ اوپر آیا۔

جوشیہ عالمِ دین کی پشت پر دوسری طرف منہ کھلے کھڑی تھی۔ شہزادے نے ناظمِ جامعہ کو سلام کیا۔ پھر جوشیہ
اشارہ کر کے بولا:

"بزرگ محترم..... یہ..... یہ..... وہ کہتے کہتے رہا۔

تجھے معلوم ہے شہزادے۔ یہ جوشیہ ہے۔ ناظم نے کہا۔

شہزادہ کچھ کہنے والا تھا کہ جوشیہ کی آواز سنائی دی:

اُسے پارسا بزرگ۔ شہزادے سے کہہ دیجئے کہ یہ میرے لیے ناظم ہیں۔ میں نے دنیا سے رشتہ توڑ کر

دین سے ناتا جوڑا ہے۔ اب یہ میری صورت بھی نہیں دیکھ سکتے۔

شہزادہ اس نئی صورت حال کے لیے تیار نہ تھا اس نے جرشہ کے الفاظ پر ٹوڑ کیا۔ مہربان
اس کو کچھ میں لگتی تو بولا:

جرشہ: میں تمہارے اسی نئے ناتے سے بہت خوش ہوں لیکن دنیا بھی تو آخر دین کی کا ایک حصہ
دنیا کو چھوڑا تو نہیں کرتے۔

جرشہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا اس نے پریشان ہو کر ناظم جامعہ کی طرف دیکھا۔ شہزادہ نے
اُدھر دیکھتے پایا تو اس نے کہا:

”بزرگ محترم! میں نے سنا ہے کہ دنیا دار کی ہر مشکل کا حل دین میں موجود ہے۔
لیکن میں کیوں نہیں شہزادے! اس کا تو دینِ فطرت ہے۔ یہ تو ہر مشکل کا حل اور ہر مرض کا دوا

نے سبزی سے جواب دیا۔

یہ بات آپ جرشہ کو کھائیے عزم! شہزادے نے کہا۔

بیٹی جرشہ: ناظم جامعہ بولا:

”تو اگر چاہے تو اس کا حل دین میں موجود ہے۔“

جرشہ خاموشی سے کچھ دیر سوچتی رہی۔ شہزادہ ابو بکر بے چینی سے اس کے جواب کا انتظار

”بزرگ عالم دین! جرشہ نے کہا:

”شہزادے سے کہہ دیجئے کہ اگر میرا نقاب اٹھائے تو پہلے شریعت کو درمیان میں لائے

کو گواہ بنائے۔“

”مجھے منظور ہے جرشہ! شہزادہ فوراً بولا۔

پھر اس نے ناظم جامعہ سے کہا:

”بزرگ محترم! جامعہ نصریہ میں اعلان فرمادیجئے کہ ابو بکر بعد نماز عشاء جرشہ سے عقد کر رہے

شہزادہ بغیر جواب کا انتظار کیے، جلدی سے میڑھیاں اتر آؤر گھوڑے پر سوار ہو کر گشت پر

نماز مغرب میں ناظم جامعہ نے شہزادہ ابو بکر اور جرشہ کے بعد نماز عشاء عقد ہونے کا مختصر اعلان

سنا کسی نے نہ سنا کہ یہ خبر پر لگا کر اڑ گئی۔ کوچہ و بازار سے گزر کر حرمِ خلافت کے دروازے

خلیفہ مستعظم نماز عشاء کے لیے جامعہ السلطان جلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے سنا تو بدحواس ہو کر

جامعہ نصریہ کا رخ کیا۔

لوگوں نے دیکھا کہ خلیفہ بھگا چلا آ رہا ہے۔ ننگے پیر، ننگے سر۔ ہاتھوں میں مہمان۔ ایک ایک درود کر کے
آپ خلعت اس کے پیچھے ہو گئی۔

جامعہ نصریہ پہنچتے پہنچتے اتنا ازدحام ہوا کہ مسجد نصریہ میں لوگوں کو نماز کے لیے جگہ نہ مل سکی لوگ باہر ہی
صاف آ رہے تھے۔ امام نے سلام پھیرا دعا ختم کی۔ خلیفہ خلیفہ کی سرگوشیوں اس کے کان تک پہنچیں۔ اس نے

ابو بکر دیکھا خلیفہ مستعظم کچھ صفوں میں عوام کے درمیان بیٹھا تھا۔ وہ عوام جنہیں وہ بھول گیا۔ عوام پھر بھی خوش
تھے۔ انھوں نے اپنے نادان خلیفہ کی غلطیاں معاف کر دی تھیں۔

ناظم جامعہ خلیفہ کو اپنے ساتھ لے کر حجرے میں پہنچا۔ وہاں جرشہ منہ پھیلے پیٹھ موڑے ایک کونے میں
بیٹھ گئی۔

ناظم جامعہ نے ادب سے کہا:

”خلیفہ معظم! بیٹی جرشہ کا عقد شہزادہ ابو بکر سے ہونے والا ہے۔ آپ عقد سے پہلے جرشہ کو آزاد کر
دیجئے۔“

خلیفہ کے آنسو ڈھک اُڑے۔ وہ رقت آمیز لہجے میں بولا:

”امام محترم! جرشہ میری کینہ تھی۔ زرخیز لونڈی نہیں۔ خدا شاہد ہے کہ میں نے جرشہ کو صرف کینہ ہی سمجھا۔

اس کی تصدیق جرشہ سے کر لیجئے۔ آپ بے فکر ہو کر عقد پڑھ لیے۔ میں تو اپنی بیٹی کو رخصت کر لے آیا ہوں۔“

جرشہ نے سنا تو نقاب الٹ کر خلیفہ کے قدموں میں گر گئی۔ مستعظم نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ
پھرا۔

ایکسا لکھ آؤ بیوں کے مجمع میں جرشہ اور ابو بکر کا عقد ہوا۔

رخصتی کا یہ منظر تھا کہ آگے کے خلیفہ کا ہاتھ پٹے سے جرشہ اس کے پیچھے شہزادہ ابو بکر، تمام اراکینِ خلافت اور

عوام کاٹھا بیٹھا مارا جا رہا تھا۔ نہ ڈھول نہ تاشہ نہ باجا نہ گاجا۔ اس مجمع میں کوئی سواری نہ تھی۔ ہر شخص پیدل۔ بغیر کسی

دعوت کے گئے۔ جرشہ جو اب شہزادی جرشہ بن گئی تھی۔ اس خاموش جلوس کے جلو میں فقر ریمانیں پہنچ

دو گئی۔



ہاگو خان نے اپنے اعلانِ جنگ میں مزید گفتگو کے لیے دو دار، سلیمان سرائی اور ابنِ عقیلی کو طلب کیا تھا۔

ہلا کوخان سے مزید کوئی گفتگو نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود خلیفہ مستعصم نے سپہ سالار اور شہزادہ ابوبکر
منصورہ کو کے بعض انکارا حجت کے لیے علی الدین ابن الجوزی اور شرف الدین عبداللہ کو ہلاکو خان کے دربار
بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ابن علی کو یوں نہ بھیجا جاسکتا تھا کہ اس کا کردار مشکوک ہو چکا تھا۔ دیودار اور سلیمان مرزائی
فوجی جرنیل تھے۔ خلیفہ ان کی خدمت میں کو دار پر نہ لگانا چاہتا تھا۔

علی الدین ابن الجوزی اور شرف الدین عبداللہ دربار خلافت کے نمائندے بن کر ہلاکو خان کے پاس
ہلاکو خان نے ان دونوں سے بات تک نہ کی اور سخت غصے کا اظہار کیا۔

سفارت ناکام ہو گئی۔ جنگ کے بادل بغداد پر چھائے۔ بغداد کی قسمت میں ہی بربادی لکھی ہے۔
اس سے پہلے چار بار اجڑا چڑھ کر سنور چکا تھا۔

ذی الحجہ ۶۵۵ھ یا محرم ۶۵۶ھ مطابق جنوری ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان اڑبے کی طرح پھلکڑا بھڑکا
بڑھا۔ ہلاکو خان نے تیس ہزار کا لشکر اپنے دو سرداروں، سوغو خاں اور باجو خان کی سرکردگی میں دے کر اسے
کی طرف سے حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ اس لشکر میں عیسائیوں اور گرجائیوں کی کثیر تعداد تھی۔ عیسائی ساحل
اور عربی مسلمانوں کے ہاتھوں مسلسل شکست کھا رہے تھے۔ اس کا انتقام لینے کے لیے وہ ہلاکو کے لشکر میں
ہو گئے تھے اور چالاک مغل ان کے مذہبی تعصب سے لورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

تاری فوج کا بڑا حصہ حلوان سے نکل کر شہر خراسان پر کوچ کرتا ہوا مشرقی بغداد کی جانب بڑھ رہا
دوسرا حصہ ننگرہت سے جد کو ہر گز رہا تھا۔ پھر وہ اپنا ایک قتل و غارت کرتا ہوا نرسہ عسکری کے کنارے کنار
مغربی بغداد کو اپنے گھیرے میں لینے لگا۔ خلیفہ مستعصم مشرقی بغداد کی کمان خود کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ شہزادہ اب
مجاہد الدین اور صدیق الدین تھے۔ شہزادہ ابوبکر، خلیفہ کے دائیں جانب اور جرجانیہ بائیں جانب تھی۔ عزیزی اور جمال
اتابک ان کی پشت پر تھے۔ مغربی بغداد کی کمان سپہ سالار دیودار کے ہاتھ میں تھی۔

بغداد کے باقاعدہ لشکر کی تعداد صرف دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ ان دس ہزار پیدل و سوار کے مقابلہ
پر ہلاکو خان کا لشکر ایک لاکھ سے کم نہیں زیادہ تھا۔ غلبہ سے کہ مغرب کے متعصب مورخوں نے مسلمانوں کی
تعداد کو بڑھا کر کیوں پیش نہ کیا۔ وہ تو اسے دس لاکھ بھی کہہ سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات اور زیادہ غلبہ
ہے کہ ہمارے مشرقی مورخین نے بغداد کی تباہی اور بربادی پر اتنی ہمارے ہمارے صفات کے صفات لکھ مارے ہیں
دس ہزار مجاہدین بغداد کی بے مثل شہامت اور جواہردی کا تذکرہ کرنے میں بڑے بے عمل سے کام لیں۔

ہلاکو خان نے خود مشرقی بغداد کا رخ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ خلیفہ اسی حصے میں ہے۔ خلیفہ کے پاس
پانچ ہزار کی باقاعدہ فوج تھی۔ ان پر ضرورت تھا کہ بغداد کا ہر جوان بیکہ بوڑھے اور بچے تک فوج بن گئے تھے اور غور

ساہنہ کی تزیین میں مصروف تھیں۔

خلیفہ نے ہلاکو کی بغاوت کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر دباؤ بڑھتا گیا اور خلیفہ پسپا ہو کر تھپے ہٹا گیا۔ ہلاکو
ہلاکو خان نے مشرقی بغداد کے سامنے اپنے خیمے اسنادہ کی طرح عرصہ شروع ہو گیا۔

مغربی عماد پر دیودار نے آگے بڑھ کر مخوں پر حملہ کیا۔ مغل بچے تھے۔ دیودار ان کے لشکر میں داخل ہو
گیا۔ یہ مخوں کی جنگی چال تھی۔ انہوں نے پلٹ کر حملہ کیا۔ دیودار کا بڑا نقصان ہوا۔ اسی وقت وہ ایک بندوٹ
یا جس کی وجہ سے اور زیادہ نقصان ہوا۔

تاری فوج زیادہ تر شہر کے بائیں جانب، برج عجی اور باب جلبہ پر دباؤ ڈال رہی تھی۔ اس کا بایاں بازو باب
لوڈن اور دایاں باب السلطان کے سامنے تھا۔ وہ فوج جو نکرت کی طرف سے وید کو ہر کر کے آتی تھی وہ عضد الدولہ
کے ہمارے (اسپتال) سے خلیفہ کے محل کے سامنے علاقہ قریب تک پہنچا ہوا تھا۔

بغداد کا عرصے میں آچکا تھا لیکن بغداد کا ہر گھر قلعہ اور ہر فرد جنگجو ہو گیا تھا۔ مغل فوج جس طرف سے بغاوت
کی پر تیروں کی بارش ہوتی اور ہزاروں تلواریں سامنے آ جاتیں۔

عامر نے طول کھینچا۔ ایک دن۔ دو دن۔ ہفتہ دو ہفتے۔ پورے پچاس روز بغداد کے مسلح اور غیر مسلح
باہر ہلاکو خان کے لشکر کے سامنے سینہ سپر رہے۔ ہلاکو خان بغداد پر قبضہ نہ کر سکا۔

پھر سیاسی چالیں شروع ہوئیں۔

ہلاکو خان کا مددگار ابن علی مشرقی بغداد میں تھا۔ اس سے ساز باز کیا اور مشرقی کمان کے دونوں سردار
مجاہد الدین اور صدیق الدین کو توڑ دیا۔

ایک رات سازش کے تحت خلیفہ کو اطلاع بھجوائی گئی کہ دیودار دشمنی کے رنگ میں بڑی طرح گھبر گیا ہے اس
نے لگھلکا درخواست کی ہے۔ شہزادہ ابوبکر اور خلیفہ گھبر گئے۔ خلیفہ نے ابوبکر کو ادھر بھیجا۔ جرجانیہ کا نانی اور اتابک
علی اس کے ساتھ چلے گئے۔

ابن علی نے علی کے لیے میدان صاف تھا۔ وہ بھیگی بلی بنا خلیفہ کے سامنے آیا اور سر ہکا کہ کھڑا ہو گیا خلیفہ
اسے دیکھتے ہی برس پڑا۔

’تو میرے سامنے کیوں آیا ہے عذار۔‘

ابن علی بڑی عاجزی سے بولا:

’آپ نفل اللہ ہیں۔ جو چاہیں کہیں لیکن میں آپ کا وفادار ہوں۔‘

’گناہ کیا جانتا ہے؟‘

ابن علیؑ نے اور عاجزی کا اظہار کیا۔ بولا:

”ہا کو خان، بغدادی فوج کی شدید مدافعت سے سخت پریشان ہے۔ اب وہ خلیفہ معظم سے ملا کر ہے۔“

تاوان ظلیفہ ایک بار پھر دھوکا کھا گیا۔ اس نے پوچھا:

”کن شرائط پر صلح ہوگی؟“

ابن علیؑ نے بڑی مکاری سے کہا:

”بغداد اور خلافت عباسیہ ویسے ہی قائم رہے گی۔ کسی کا بال بیکا نہ ہوگا بلکہ وہ اپنی لڑائی کو غلبہ عقد میں دینے کا خواہشمند ہے۔“

خلیفہ سوج میں پڑ گیا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر مجاہد الدین اور سدید الدین کی طرف دیکھا۔ وہ تو یہ سکھاتے پڑھاتے ہوئے تھے۔

سدید الدین نے کہا:

”خلیفہ مالک ہیں۔ چلیے ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔ تمام باتیں زبانی طے کر لیں گے۔“

خلیفہ جال میں پھنس گیا۔ بیٹے کو بھی خبر نہ کی اور مرداروں، اراکین سلطنت اور معزز شہریوں کے رات کی تاریکی میں سفید پرچم کے نیچے ہا کو خان کے خیمے میں پہنچ گیا۔

شکار خود جال میں آ گیا۔

بغداد کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ خلیفہ کو گرفتار کر لیا گیا۔

شہزادہ ابوبکر کو بھڑائی تو اس نے سر پیٹ لیا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیرکان سے نکل چکا تھا۔ شہزادہ

ڈالنے پر آمادہ نہ ہوا۔ دیودار نے شہادت کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔

جریشہ نے عازانی کو قرب ہا کر اپنے سینے سے لگایا اور کہا:

عازانی تو اتنا بک کو لے کر اسی وقت یہاں سے نکل جا۔۔۔۔۔

عازانی رونے لگی۔ اس نے جریشہ کی بات کا ٹٹی جا ہی۔

جریشہ کی آنکھیں خشک تھیں۔ اس نے بڑا وقار انداز میں کہا:

عازانی یہ میرا حکم ہے۔ ایک شہید کا حکم ہے۔ میں نے شہادت کی تمنا کی تھی جو پوری ہونے والا

میں نے جو کہلے اس پر عمل کر۔ یہاں سے سیدھی مہر کا رخ کر اور جا کہہ دے کہ اے اسلام کے آخری نبی۔

کے محافظ! بغداد ہا کو خان کے ہاتھوں فتح نہ ہو سکا مگر۔۔۔۔۔ غداروں کے ہاتھوں شکست کھایا۔ اگر تو

بھی اسلامی غیرت ہے تو اٹھو اور مسلمانوں کے اس خون کا بدلہ لو جو یہ چکا ہے اور جو اپنے والد ہے۔ مہر آخری فلسفہ ہے

آج بڑھو اور ملاک کے ناپاک قدم مصر کی مقدس سرزمین پر نہ پڑنے دو۔

سب ہی کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ دیودار شہزادہ ابوبکر اور جریشہ نے عازانی اور اتنا بک کو رخصت کیا۔

پھر اس رات مجاہدین نے خون کی ہولی کھیلی۔

انہوں نے سر سے کفن باندھے۔ نیامیں پھینک دیں۔ تلواریں بلند کیں اور نعرہ تکبیر لگاتے ہا کو خان کے لشکر پر ٹوٹ پڑے۔

اندھیرے میں تلواریں بجی کی طرح کوندقی رہیں۔ مراٹھ کٹ کر گرتے رہے۔ مجاہدین جام شہادت پیتے رہے کر ہاکے محلے کے قریب ایک چھوٹی کر ہاکا منظر سامنے آ گیا۔

پہلے دیودار نے جام شہادت نوش کیا۔ پھر شہزادہ ابوبکر اور جریشہ ایک ساتھ گھوڑوں سے گرے۔ ان پر پچاسوں مغن تلواریں ایک دم جھک گئیں۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ مجاہدین کے آخری ساتھی نے عین ہا کو خان کے خیمے کے سامنے بغداد پر اسلام کا پر اپنا جہان بچھا کر رکھی۔

ہا کو خان نے قمر جعفر (بعض کے مطابق قمر مہینہ) میں جلوس کیا۔ خلیفہ مستعصم کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔

ہا کو خان نے خلیفہ کے سامنے چاندی کی بجلی اور جو اہرات سے مرصع مودان دکھا اور کہا:

”جو چاندی سونا تم نے جمع کیا ہے وہ کھاؤ۔“

بغداد کے مالک نے کہا:

”میں سونا کیسے کھاؤں؟“

”پھر تم نے سونا جمع کیوں کیا تھا؟“ ہا کو نے بے اعتنائی سے کہا۔

خلیفہ نے خاموشی اختیار کی۔

ہا کو خان نے محل کی سونے کی جالیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا:

”تم نے سونے کی جالیوں کے بجائے لوہے کے تیر کیوں نہ بنوائے۔ تلواریں کیوں نہ ڈھالیں کہ تمہارے ہاتھیں ر۔“

خلیفہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

”اللہ کی ہی مرضی تھی۔“

”تو پھر تم پر جواب گزے گی وہ بھی تمہارے اللہ کی مرضی ہوگی۔“

ہلاکو خان نے حقارت سے کہا:

”میں تمہیں ایسے گھر میں رکھوں گا جہاں تمہیں نہ مردی لگے گی اور نہ بیاسی۔“

ہلاکو خان نے حکم دیا:

”خلیفہ کو ایک سو رکے ہمارے میں پیٹ کر گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل کے مار ڈالا جائے۔“

ابن خلدون کا بیان ہے کہ خلیفہ کو ڈنڈوں سے پیٹ پیٹ کر اور بیروں سے مسل کر ختم کیا گیا۔

(5)

ہلاکو کا خواب

○

پچاس دن کے عرصے کے بعد ہلاکو خان نے برج عجمی پر ایک زبردست حملہ کیا جس سے پورا مشرقی بغداد بے کر رہ گیا۔ پھر بھی مٹی بھر فوج اور بغداد کے ہمارے عوام نے ہتھیار نہیں ڈالے لیکن بغداد کی تخت ربرہ میں پانچویں تباہی مچھی جا چکی تھی۔ مفاد پرست ابن علقمی کے فریب میں کہ خلیفہ مستعصم، وفادارانِ خلافت، علماء و شرفاء بغداد گرفتار ہوئے اور قتل کر دیے گئے۔ خلیفہ مستعصم کو گلگاہ گھوٹ کر مارا گیا اور لاش کو ہاتھی کے پاؤں میں بندھ کر پوسے شہر میں پھرایا گیا۔

ہلاکو خان بغداد میں داخل ہو گیا اور اپنے ناپاک قدموں سے قصر مامونہ کو آلودہ کیا۔

ہلاکو کے حکم سے بغداد چالیس روز تک آگ و خاک و خون کی دھیر چادر میں لپیٹا رہا۔ ایک طرف آگ، دوسری طرف تلواریں خاک و خون کا جوفناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ جامع مسجد سلطانی، مقبرہ موسیٰ الکاظمؑ، مقاصد بنی خلفہ کے مرقے اور بازاروں اور مکانات سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ سورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا لاشیں بے گور و کفن پڑی تھیں۔ آٹھ لاکھ باشندگان بغداد تیر تیر اے دریغ ہوئے۔

تاریخ حرا ص ۶۸ کا مصنف لکھتا ہے کہ:

”بغداد میں کوئی شخص بھی نہ بچا جو اس کی گزشتہ خوبیوں کا تذکرہ کرتا

یا اس کی تباہی کا رونا روتا۔ ہلاکو خان نے دوست دشمن میں نیز

نہ کی اور کاغذیں شریف کو سب سے پہلے برباد کیا۔“

خلیفہ مستعصم کا ٹھکانہ ابوبکر اور اس کی نو بیوتا بیوی جبرئیلہ لڑتے لڑتے شہادت کے درجہ پر فائز ہو گئے۔

چالیس دن تک بغداد میں قتل عام کا بازار گرم رہا۔

دارالسلام بغداد جس کا دروازہ صد سال سے زیارت گاہِ خلائق رہا وہاں زبانِ شمشیر کے سوا کسی اور زبان

دم مارنے کا بازار نہ تھا۔

مغلوں نے دفترِ جلاد سے کتب خانے دریا برد کر دیے کہ دجلہ کا پانی سیاہ ہو گیا۔ آگ، تلواریں، خالاک خون، قیامت بپا تھی۔

جامع مسجد سلطانی، مقبرہ موسیٰ کاظمؑ، مقاصد بنی خلفہ کے مرقے، بازار، مکانات ہر جگہ آگ کے شعلے رقصاں تھے۔ آسمان دھواں دھواں تھا۔ بے گناہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی تھیں۔ بغداد کی آٹھ لاکھ کی آبادی تیر تیر ہو گئی۔ ہلاکو خان نے دوست، دشمن، کوئی تفریق نہ کی بلکہ سب سے پہلے اپنے ابن علقمی کے سامنے کاغذیں شریف کو برباد کیا۔

مغلیہ عاصم نے خلافت عباسیہ اور دارالخلافت بغداد کا خاتمہ کر دیا۔ ۶۲۵ھ سے اب تک بغداد دارالسلام بغداد کی حیثیت دوبارہ نہ حاصل ہو سکی۔ سچ ہے ان اللہ علی کل شیئ قدیر۔

غدار ابن علقمی، وطن فروش ابن علقمی کو کیا ل؟

وزارت گئی۔ ہلاکو خان نے ابن عمران کو حاکم بغداد مقرر کر کے ابن علقمی کو اس کا جیسا ہی بنایا۔ ابن علقمی کی ذات کی زندگی میں کچھ عرصے بعد مر گیا۔

○

صرف عازانی اور جلال الدین آتابک، مرحوم جرنیل کی آخری وصیت پوری کرنے کے لیے بغداد سے کسی نہ کسی طرح نکلے۔
میں، بیاب ہو گئے۔ انھوں نے گھوڑوں پر بیٹھے بیٹھے نہر بنو رکی اور دوسرے کنارے پر پہنچ کر اطمینان
کی سانس لی۔

”خطلہ ٹل گیا۔“ آتابک نے دل میں سوچا۔ لیکن ٹھیک اسی وقت عازانی نے پوری قوت سے اپنے
گھوڑے کی گلابیں کھینچیں۔ گھوڑا رگ گیا۔ آتابک آگے نکل گیا۔ اسے حیرت تھی کہ عازانی نے گھوڑا کیوں روک دیا۔
خوٹری درجہ جا کر دالیں ہوا۔

اس نے عازانی کے پاس پہنچ کر بٹے پیار بھرے لہجے میں کہا:

”جان من۔ خوٹری سمت اور کروا بھی ہم خطرے سے باہر نہیں ہوئے۔“

آتابک کچھ اور بھی کتنا لیکن اس کی نظر عازانی کی آٹابک پر پڑ گئی اور الفاظ اس کے حلق میں الجھ کر رہ گئے۔
عازانی کا بایاں پانچہ خون میں تر ہر تھلا اس کی ران میں ایک تیر چھا ہوا تھا اور خون رس رس کر اس کے پانچے
رنگین کر رہا تھا۔

آتابک جلدی سے اپنے گھوڑے سے اترا۔ اس نے تیر بہ ہاتھ رکھ کر اسے ہلا چاہا۔ تیر دو رنگ گوشت پر
پیوست تھا۔

آتابک نے نظریں اٹھا کر عازانی کو دیکھا۔ عازانی کی کمرنت باگ پر ڈھیلی پڑ چکی تھی اور انہیں بند ہو رہی تھی۔
اگر آتابک تیزی سے جست لگا کر عازانی کے پیچھے نہ میٹھا جاتا تو وہ منٹ کھا کر ضرور زین سے لشکر جاتی۔ آتابک نے
عازانی کو سہارا دے کر اپنی گود میں ڈال لیا۔ اپنے گھوڑے کی راس میں عازانی کے گھوڑے کی زین میں اس میں
آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

چار گھنٹے کی مسافت کے بعد آتابک کو ایک آبادی نظر آئی لیکن جب وہ آبادی میں پہنچا تو اسے بالکل دیرینہ
نہ آدمی نہ آدم زاد۔ ہر طرف ساٹیں ساٹیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بستی کو بڑی جلدی میں خالی کیا گیا ہے۔
ادھر ادھر کھرا تھا اور ابھی کافی سامان مکانوں کے اندر بھی موجود تھا۔ کچھ مولیشی ضرور ادھر ادھر گھومتے ہوئے دکھائی
دیے۔ آتابک کو چال کھانے پینے کی تو ہر چیز مل گئی لیکن اسے تو ایک حکیم، ایک جراح کی ضرورت تھی۔

آتابک نے شام تک اسی آبادی میں قیام کیا۔ اس دوران اس نے عازانی کی ران سے تیر نکالنے کی
تمہیر کی۔ مگر ایک تو اوزار نہ تھے۔ پھر اسے اس کا سابقہ تجربہ بھی نہ تھا۔

عازانی کی بے ہوشی اب تک قائم تھی صرف اتنا ہو سکا کہ زخم سے جو خون بہ رہا تھا اسے آتابک نے
زخم پر پٹیاں کس کر بند کر دیا۔

آتابک کو کھانے پینے کی خواہش تو نہ تھی لیکن اس کے بغیر زندگی بھی دشوار ہے۔ اس نے خالی گھوڑے پر
بیشیار خود رو نوش بار کر لیں تاکہ اگر آگے کچھ حاصل نہ ہو سکے تو وہ ہفتہ دس دن اس سامان سے نکالے تمام کو
بے عازانی کو بڑی مشکل سے گھوڑے پر ڈالا۔ دوسرے گھوڑے کو زین سے باندھا۔ پھر اٹھ ہاتھ لے کر
لڑھا۔

وہ رات بھر بغیر رکے سفر کرتا رہا۔ کئی آبادیاں اور بستیاں نظر پڑیں لیکن انسانوں سے کسی خالی ضرورت
کا چیزیں دہاں بھی موجود تھیں۔ آتابک کی پریشانی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ دو مردان ہو گیا لیکن وہ کسی ایسی جگہ نہ پہنچ
جہاں سے کوئی جراح میسر آجائے۔

آتابک امید کو سینے سے لگائے آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ سچ ہے اس کی ذات اسے کبھی ناامید نہیں ہونا چاہیے
وہ سے لو لگاتے ہیں ان کی مشکل آسان ہو ہی جاتی ہے۔



یہ چوتھا دن اور پانچویں رات تھی۔

آتابک اپنی جیتی عازانی کو لیے ایک ایسی بستی میں پہنچا جس میں مرنے والے بھونپڑیاں ہی بھونپڑیاں تھیں۔ ابھی
بغیر درجہ کر رہا تھا کہ اس جگہ قیام کیا جائے یا آگے بڑھا جائے کہ اسے دو درختوں کے نیچے ایک سایہ مانظر
آتا کہ تو تقریباً ایک ہفتہ بعد یہ پہلا انسانی سایہ نظر آیا تھا۔ وہ گھوڑا بھگانہ سنا تھا۔ اس لیے گھوڑے سے جلدی
نرا اور تیز قدموں سے سایہ کی طرف چلا۔

چاندنی رات میں ساتھ نے بھاگنا شروع کر دیا۔ آتابک نے صاف طور پر دیکھ کر وہ کوئی انسان ہے جو اسے
بڑھا کر رہا ہے۔

آتابک کو خیال گزرا کہ اسے ”مغل“ سمجھ کر وہ بھاگ رہا ہے۔ اس لیے آتابک نے اسے آواز میں دینا شروع
کرایا۔ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ مسلمان ہے۔ مغل نہیں ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے لیکن ساتھ

”آب“ نہ سنی اور وہ جھوٹے ٹیوں کے ادھر ادھر بھاگتا رہا جیسے وہ گمشدہ معقول ملک میں چھب جانا چاہتا ہو۔ آتابک
آواز میں دیتا رہا اور اس کے پیچھے بھاگتا رہا۔ وہ ساتھ کے ساتھ خود بھی سایہ بن گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ
ماریٹ لیا تو عازانی کی زندگی کا پتہ مشکل ہے۔

سایہ بھاگتے بھاگتے ایک حویلی میں گھس گیا۔

ہوا، بیٹی مریم سید کوئی مصیبت زدہ ہے۔

اس کی آواز پر میری طرحوں میں ایک بار پھر روشنی ہوئی اور ایک جوان لڑکی دو سرا چراغ ہاتھ میں لیے بیٹھیاں چڑھ کر اوپر گئی۔

اتابک کم صبران کھڑا دونوں کا منہ دیکھتا رہا۔ اسے یہ نہام باتیں علمی معلوم ہو رہی تھیں۔ مریم ایک لمبی فرک میں جو اس کے پیروں تک اسٹک ہی تھی، بلوس تھی۔ اس کے سر پر ایک سفید رومال پٹی کی طرح پٹا تھا۔ مریم بظاہر خوبصورت تھی لیکن کسی پریشانی نے اس کی رنگت میں پہلاں پیدا کر دیا تھا۔

آدمی نے بغیر کسی تہید کے کہا:

”تیری بیوی کہاں ہے؟“

اتابک جو طرح طرح کے خیالات میں گم تھا، ایک دم چونک پڑا۔ اس نے کہا:

”مہربان، وہ وہاں ہے جہاں سے میں تمہارا تعاقب کرتا ہوں۔ اب تک آیا ہوں۔“

تیرک لگا تھا:

”ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔“

آدمی کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں ابھریں۔ اس نے پوچھا:

”موت ہوش میں ہے۔“

”نہیں بے ہوش ہے۔ اسے اب تک ہوش نہیں آیا۔“

اتابک نے بھی مختصر سے مختصر جواب دینے کی کوشش کی۔ پھر اس نے دیکھا کہ آدمی جو یقیناً مریم کا باپ تھا، اس نے اوپر مریم نے اپنے ہاتھوں سے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ اس سے اتابک کو معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ عیسائی ہیں اس کا دل بٹھنے لگا۔

مریم کے باپ نے شاید اتابک کے دل کی حالت کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے مسکرا کر کہا:

”پریشان نہ ہو۔ میں عیسائی ضرور ہوں لیکن میں اس آبادی کا وید ہوں۔ جراح اور ڈاکٹر ہوں اور سر ڈاکٹر مریض کے سامنے نہ تو عیسائی ہوتا ہے اور نہ مسلمان۔ وہ مرفض ڈاکٹر ہوا کرتا ہے۔ چلو پیسے زخمی کو کہاں لے آئیں۔“

اتابک نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ حویلی سے باہر نکلا۔ دونوں باپ بیٹی اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ رات روشن تھی۔ پرسکون تھی۔

اتابک یوں چل رہا تھا جیسے اس پر سحر کر دیا گیا ہو۔

پوری آبادی میں یہی ایک حویلی تھی۔ شکستہ، صدیوں پرانی حویلی کو دیکھ کر ہی خوف آتا تھا لیکن ایک ہی فکر تھی۔ ایک مقصد تھا۔ فکر اور مقصد انسان کو خوف سے لاپرواہ کر دیتے ہیں۔ اتابک نے حویلی میں اس کا چہرہ چہرہ ڈھونڈنا لیکن وہ سایہ، وہ انسان اسے نظر نہ آیا۔

حویلی کا کوئی کمرہ محفوظ نہ تھا۔ اس لیے اس کی کچھ میں نہ آتا تھا کہ وہ سایہ کہاں چھپ گیا یا سا گیا۔ پوری حویلی ایک بار پھر حیرت انگیز۔

”اے مریم، اے حویلی صبی میوزم سے چھین چھین کے اندر آ رہی تھی۔ اس کمرے میں وہ بیٹھ چکا کہ وہ تاریک تھا۔ اس کی صحت قدرت درست تھی صرف ایک طرف تھوڑی سی ٹوٹی تھی۔ اتابک اس کی دیوار پر لگا۔ پھر اس کا پیڑ کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ اس نے بیٹھ کر اسے دیکھا یہ چند میٹر کے بڑے بڑے کمرے اسے محسوس ہوا کہ چھتر گرم ہے۔ اور ٹوٹا تو اس کا ہاتھ گرم گرم لاکھ پر پڑا۔

اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔

یہ چو لہا تھا جس کی لاکھ اب تک گرم تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس حویلی کے کسی حصہ میں کوئی نہ رہتا ہے۔ مگر کہاں؟ وہ تو کوڑا کوڑا چھان چکا ہے۔

اتابک کمرے کے دروازے پر آیا اور پھر جیسے کسی نہی حفاظت نے اس سے کہلایا:

”اے حویلی کے رہنے والے! یقین کر کہ میں مسلمان ہوں۔ بیٹھوں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں مصیبت ہوں۔ میری بیوی شدید زخمی ہے۔ اس کی ران سے تیر نہ نکال لیا تو وہ مر جائے گی۔ تم کوئی بھی ہو میرا آؤ۔ ورنہ میں روزِ حشر تمہارا دامن پکڑوں گا۔ خدا تمہیں کبھی معاف نہ کرے گا؟“

اتابک کا لمبہ بڑا رقت آمیز تھا۔ اس آواز پر تو بے جان پتھر بھی پانی ہو جاتے پھر جاندار پراس

کیوں نہ ہوتا۔

اس کمرے میں جس کے دروازے پر اتابک کھڑا تھا کچھ کھٹکا ہوا۔ اتابک نے اندر جھانک کر

جیسے زمین کا سینہ شق ہوا اور اس میں سے ایک چراغ باہر آ گیا۔

اتابک ہانک کر اندر پہنچا۔

زمین ایک جگہ سے کھلی تھی اور ایک ادھیر عمر انسان چراغ لیے اس میں سے نکل رہا تھا۔ اتابک

روشنی میں نیچے جانے والی بیٹھیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

آگے والے نے چراغ اتابک کے چہرے کے پاس کر کے سے غور سے دیکھا پھر نیچے جانے والی

طرف رخ کر کے بولا:

بدلتے ہی بے جان ہونے لگے تھے۔ انھوں کی طاقت گھٹتے گھٹتے ختم ہو گئی۔ صرنا آکھوں میں جان تھی یا ایک کڑوی
دار جو جری کوشش کے بعد نکلتی تھی۔

دن، بیسے سال میں تبدیل ہو گئے۔

ایک رات عازانی کی بے چینی بہت بڑھ گئی۔ اس کے چہرے کی رنگت برابر تبدیل ہوتی۔ اس کی چارپائی دن
رے وقت نہ خانے میں اتاری جاتی اور رات کو پھر نکال کر شکستہ چھت کے نیچے پھائی جاتی۔ اس رات عازانی نے اپنی
پائی کھلے آسمان تلے جلنے کا اٹھایا۔ میریم اور انا تب چارپائی اٹھا کر جوئی کے صحن میں لے آئے۔ عازانی کو
عانی کا چھٹا چار اور غشی طاری ہو گئی۔

بڑی رات گئے عازانی کو ہوش آ یا مگر آنکھیں پتھرائی پتھرائی۔ اس نے انا تک بہت قربانے کا اٹھایا۔ وہ
کے قریب آ گیا۔ اور قریب.... اور قریب.... عازانی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ انا تک نے
کان عازانی کے منہ سے لگا دیے۔

عازانی اپنی پوری طاقت ہونٹوں میں کھینچ لائی۔ انا تک نے سنا۔ وہ انا تک کے کہہ رہی تھی:

انا تک۔ میرے بعد سیدھے مصر بانا اور جرش۔ کا بیٹا آدمیوں کے بادشاہ کو پہنچانا.... انا باپ بیٹی نے
یار ہیں دیا اس کا بدلہ کون دے گا۔ میری میری بہن ہے.... ہو سکے تو میرے بعد اسے میری جگہ
..... خدام کو.....

عازانی کی سانس اکھڑ گئی اور آنکھیں بند ہو گئیں۔

انا تک بڑھ کر عازانی سے پوچھ گیا۔

میریم اور جیکب جو اس وقت ذرا ہٹ کر کھڑے ہو گئے تھے وہ دوڑ کر پاس آ گئے۔ بگمب دہاں کیا رکھا تھا۔
عازانی کی روح قوماطی لالہ کی طرف پرواز کر رہی تھی!



نقد اور کے قبضہ نے بلا کو خان کے حوصلے بلند کر دیے۔ وہ قصر مامونہ کی راہداریوں میں چل پھل کرتے ہوئے
چار سالہ قطب کو اس انتہائی پر غرور انداز میں کہتا:

نیکو! تو غانا! اس وہ بغداد ہے جس پر قبضہ کرنے سے میرا دادا انھیں چنگیز خان ہی صربا
انرا بڑا غار جھکا کر کہتا:

عازانی کی رات سے تیر نکالنے میں بڑی مشکل پیش آئی۔ جیکب کے پاس جراحی کے معمولی اکت تھے۔ ہرگز
ہو چکا تھا اور اس میں مواد (پنس) پڑ گیا تھا۔ عازانی کا خون تقریباً پچھڑ چکا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید تھا۔ تیر
نکالنے سے پہلے جیکب اور میریم نے ایک بار پھر اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔

جیکب نے نشتر دینے سے پہلے عازانی کو ہوش میں لانے کے لیے آٹری بار کوشش کی۔ اس نے سب سے
زیادہ بہتر اور تیز دوا کا ایک چھچھو عازانی کے جڑے کھول کر اندر ڈیا۔ کچھ دوا اس کے سحتی سے اثر ہو گئی مگر خون
بکثرت بہ چکا تھا اور نقابہ اتنی تھی کہ عازانی آنکھیں نہ کھول سکی۔

جیکب نے تیر نکالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ تیر گوشت سے گزر کر ہڈی میں داخل ہو گیا
جیکب نے مجبوراً وائش بائش بھی اتنے ہی گھر سے نشتر نکالے۔ پھر اس نے زخم کے اندر ہاتھ ڈال کر تیر کو کھینچا۔
اس کے ساتھ ہی عازانی کی رات کے گوشت کا ایک ٹوٹا بھی.... باہر آ گیا۔ یہ گوشت گل چکا تھا۔

جیکب اور میریم نے جلدی جلدی زخم میں دوا بیں بھر دیں۔ پھر ٹانگے لگا کر پٹی چڑھائی۔

انا تک بالکل چپ چاپ کھڑا دل ہی دل میں عازانی کی زندگی کے لیے دعا بیں کرتا رہا۔ جیکب کا خیال تھا کہ
عازانی تیر نکالنے کے دوران ہی انتقال کر جائے گی مگر ابھی اس کی زندگی باقی تھی اس لیے وہ یہ تعلیم بردار
کر گئی۔

تیر نکل جانے کے تیسرے دن عازانی نے آنکھیں کھولیں۔ جیکب اور میریم نے انا تک کو مبارکباد دی۔
لیکن عازانی فوراً ہی پھر بے ہوش ہو گئی۔ اس حال میں عازانی کو ایک ہفتہ اور گزار گیا۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش
میں مبتلا تھی۔

عازانی کی کمروری کے پیش نظر جب بھی اسے ہوش آیا جیکب پھلوں کے رس کے دو ایک چمچے اس کے منہ
میں مائل دینا جس سے عازانی میں کماہستہ آہستہ طاقت آنے لگی۔

عازانی کی حالت ابی ہر سنبھل رہی تھی لیکن اس کا زخم روز بروز خراب ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا زخم بھرنے کے
بجائے اور بڑھا اور پھیل رہا تھا۔ انا تک اور میریم جو میس گھٹتے اس کی پٹی سے لگے بیٹھے رہتے۔ میریم اتنے غلوں
اور انہماک سے عازانی کی تیمارداری کر رہی تھی کہ جب بھی عازانی کے حواس ذرا درست ہوتے تو وہ پہلے میریم
بات کرنے کی کوشش کرتی۔

عازانی کی بیماری طویل کھینچ گئی۔

وہ موت اور زندگی کے درمیان مشکی ہوئی تھی۔ جیکب نے سر توڑ کوشش کی مگر مرض بڑھ گیا جوں جوں
کی کے مصداق عازانی لاغر ہوتی چلی گئی۔ اس کے پیروں کو دس چمکے تھے۔ چلتا پھرتا کیسا اٹھتا بیٹھا بھی بندھا

ہو، نہ ساعر، وہی جس کے لیے خاقان سگر خان نے ہم سے کہے۔ جس کی فتح کی آرزو، خان
نہ بیگر خان نے کی تھی۔

ہاں خان، قطبوغا نے بدل زبان سے کہا:
”میر میں بغداد سے زیادہ مدافعت ہوگی۔ وہاں کے ملکوں کی باقاعدہ فوج ہے۔ انھوں نے
مراہون (عیسائیوں) کو کئی زبردست شکستیں دی ہیں۔“
”تجھے یہ باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں۔“ ہاکو نے دلچسپی سے پوچھا۔
”مجھے ان عیسائیوں نے بتایا ہے جو دو قوز خاتون کے عبادتی پھیل (رقہ) کے ساتھ ہیں۔“
قطبوغا کو اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے بتایا۔
ہاکو خان ہنسا اور بولا:

”عیسائی تیرے بہت دوست ہیں۔ کہیں تو بھی تو عیسائی نہیں ہو گیا؟“
”دو قوز خاتون بھی تو عیسائی عقیدہ رکھتی ہیں۔“ قطبوغا نے اپنا ہکاؤ کیا۔
قطبوغا نے دو قوز خاتون کا حوالہ دیا تو ہاکو خان نرم پڑ گیا۔ اس نے کہا:
”مخل سپہ سالار۔ میں نے تم پر کوئی الزام تو نہیں لگایا۔ مخلوں کو اجازت ہے وہ جو مذہب
ہیں اختیار کر لیں، خانِ اعظم اور خاقان سے انھار و فاداری پس شرط ہے۔“
قطبوغا نے دیکھا کہ ہاکو خاں کا بگڑتا ہوا دماغ ٹھیک ہو گیا ہے تو وہ بولا:
”خانِ محترم، یہ بات تو آپ تبسم کر رہے ہیں کہ عیسائی ہمارا ساتھ دے رہے ہیں؟“
”یہ بھوٹ ہے قطبوغا۔“ ہاکو نے چحچہ کر کہا:
”عیسائی ہمارا ساتھ نہیں دے رہے بلکہ مسلمانوں سے انتقام لے رہے ہیں۔“
قطبوغا کا سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ اس نے پوچھا:

”خان۔ میں آپ کی بات سمجھ نہیں۔“
ہاکو کو اس کی نادانی پر ہنسی آگئی۔ اس نے اپنے پیلے پیلے دانت نکالے اور کہا:
”تو تو زاسپہ سالار ہے قطبوغا، مسلمانوں نے بحرِ روم کے ساحلِ فلسطین اور افریقہ کے شمالی
زوں میں عیسائیوں کا نام میں دم کر رکھا ہے۔ فرانس کا شہنشاہ بھی ان سے شکست کھا چکا ہے۔ عیسائی
مسلکوں سے مذہبی لڑائی لڑ رہے ہیں جسے یہ صلیبی جنگ کہتے ہیں لیکن انھیں ہر جگہ شکست کا منہ
دینا پڑ رہا ہے۔ اب وہ ہماری مدد سے مسلمانوں سے انتقام لے رہے ہیں۔“

”ہاں خان۔ اس کی فتح تمہاری قیمت میں کبھی نہیں۔“
ہاکو اپنے جھڑپے جوتے تھر تھر کی سنہری جالیوں پر گر پڑا۔ پھر فرائز کی طرف منہ پھیر کر خود ہی بڑبڑا:
”اے کیرولان مذکی وادیوں میں برقان خالدن کے قبرستان میں سونے والے خانِ اعظم (چنگیز) کی
دلیہ جس بغداد کو فتح نہ کر سکا، اس کے تفر و ایمان آج میرے جوتوں کے نیچے ہیں تو مسلمانوں کو نہ خبر کر سکا۔
نے ان کی پسلیاں توڑ کر رکھ دیں۔ اب تو ہی بتا۔ ہاکو خان تیرا بیٹا ہے یا....؟“
وہ کہتے کہتے ترک جانا اور قطبوغا کو دیکھتا۔

قطبوغا اس مغرور مغل کو بہت پسند کرتا تھا کیونکہ وہ خود بھی اتنا ہی مغرور تھا۔ وہ ہنسنے دیتا اور کہتا:
”ہاکو خان۔ تو تمنا خاقانوں سے عظیم ہے۔ خانِ اعظم سے بھی زیادہ بہادر اور طاقتور۔“
قطبوغا اور ہاکو خان کے درمیان اس قسم کے سکاٹے روز کا رستہ تھا۔ ہاکو خان نے اپنے آپ کو خان
سے بڑا تصور کرنا شروع کر دیا تھا۔ بظاہر اس کے سامنے باکوئی ایسی طاقت بھی نہ تھی جو اس کے مقابل آتی۔ بغداد
جنوب اور مغرب میں تمام آبادیوں، بغدادی، بہریت، کامل سن کر خاں ہو چکی تھیں۔ بحرِ روم تک اسے اپنا کھانا
نظر نہ آتا تھا۔

پھر ایک دن ہاکو خان نے نرمی میں کہا:
”قطبوغا۔ اب ہم بحرِ روم کے چمکیلے پانی کا نظارہ کریں گے۔“
قطبوغا خاموش رہا۔
ہاکو خان نے ذرا درشت لہجے میں کہا:
”قطبوغا تو نے ہمارے فیصلے کی ادنیٰ نہیں دی۔ کیا تجھے یقین نہیں کہ ہم بحرِ روم تک پہنچ سکیں؟“
قطبوغا گھبرا گیا اور جلدی سے بولا:
”نہیں تھن۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ہمیں بحرِ روم تک پہنچنے سے کون روک سکتا ہے۔ بغداد کے
بعد مسلمانوں کی طاقت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔....“

”تقریباً نہیں۔ بالکل ختم ہو گئی ہے۔“ ہاکو نے اس کی بات کاٹ دی:
”مسلمانوں کا دارالاسلام ختم ہو گیا۔ ان کی مرکزیت کو ہم نے تو ہلا کر دیا۔ اب وہ کس جگہ جمع ہو کر
مقابلہ کر سکتے ہیں؟“

”شاید مصر میں۔“ قطبوغا کی زبان سے آخر نکل ہی گیا۔
”مصر....“ ہاکو نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر کہا:

قط بونا کو اور زیادہ تعجب ہوا اس نے کہا:

"خان! کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟ مجھ سے کسی میں نے بات نہیں کہی۔"

"تیری دونوں آنکھیں اور دونوں کان بند رہتے ہیں قط بونا، ہلاکو نے اپنے سپہ سالار کو پراخوس کرتے ہوئے کہا:

"کیا تجھے یاد نہیں کہ خان ملکوں خان کے دربار میں ایک فرانسیسی پادری آیا تھا جس نے کو شمشادہ فرانس کا پیغام دیا تھا کہ مسلمان دنیا کے لیے لعنت ہیں انھیں ختم کر دینا چاہیے۔"

قط بونا کچھ مچھتے اور یاد کرتے ہوئے بولا:

"ہاں۔ ایسی بات ہوئی تو سچی مگر میں اس وقت نہیں سمجھ سکا تھا۔"

قط بونا۔ ایک بات یاد رکھ۔ ہلاکو نے اپنے سپہ سالار کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ عیسائی، بیکر جستانی، یہ صلیبی، ٹاٹ۔ ان میں سے کوئی بھی ہمارا دوست نہیں۔ سب اپنے

کے یار ہیں لیکن ہم یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انہیں اپنے ساتھ لگائے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ہم سے انتقام لینا چاہتے ہیں اور ہم ان کے مذہبی جوش سے فی نہہ اٹھا کر مسلمانوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں

مقدمہ دونوں کا ایک ہے۔ جب غرض مشترکہ ہو تو دو دشمن بھی آپس میں مل جاتے ہیں۔"

قط بونا عیسائیوں کے کردار کے بارے میں کچھ اور معلوم کرنا چاہتا تھا مگر وہ ڈرتا تھا کہ کہیں عیسائیوں سے ناراض ہو کر اسے اپنے لشکر ہی سے الگ نہ کر دے اس لیے وہ خاموش ہو گیا۔

ہلاکو خان نے بھی بات آگے نہ بڑھائی حالانکہ وہ بھی مصر کے مسلمانوں کے بارے میں بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ بغداد میں جول سے تلخ غم رہا ہوا اس نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں اور اب وہ ہر قدم پر ہونک کر رکھنا چاہتا تھا۔

ہلاکو خان کو بغداد سے جو دولت حاصل ہوئی وہ اس سے کہیں زیادہ مٹی جتنی دولت سے صاحب قلعہ الموت کی فتح پر ملی تھی۔ اس نے تمام دولت اور قیمتی اشیاء رتھوں پر اور گاڑیوں پر لدا دیں۔

چاہتا تھا کہ کوئی معقول بلکہ دکھائی دے تو پہلے وہ تمام دولت کو اکٹھا کر کے محفوظ کر دے پھر اسے قدم اٹھائے۔

شام کے کھانے کے بعد جب تمام سردار اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے اور ہلاکو کے پاس قط بونا رہ گیا تو دن کی بات ایک بار پھر غم لگئی۔

ہلاکو خان نے بڑے سادہ دارانہ انداز میں پوچھا:

"قط بونا، تو نے مصر کے بادشاہ کا حال اس طرح بیان کیا جیسے تو اس سے غور و خوض ہے۔ کیا واقعی مصر میں سخت مقابلہ نہ ہوا گا؟"

قط بونا، ہلاکو کے اس سوال پر ہونک پڑا۔ اسے محسوس ہوا جیسے ہلاکو اپنے خون کو پھیلانے کیلئے اس کا نام استعمال کر رہا ہے۔ اس نے کہا:

"خان! آپ نے میری توہین کی ہے۔ قط بونا آپ کا سپہ سالار ہے۔ خون جیسا لفظ نہ تو اس نے سنا اور نہ اس پر یقین رکھتا ہے۔ میں ہی کیا، کوئی مغل خون کو اپنے پاس پھینکے نہیں دیتا۔ ہمارے لیے

نن کا ہر مولیٰ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ہمیں تو خان اعظم کا یہ قول یاد ہے کہ مغل، متمدن دینا پر حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔"

قط بونا نے اس کے جواب کا انتظار کیا۔ پھر خود ہی بولا:

"خان کو میرے الفاظ بڑے لگے ہوں تو میں اس کے لیے عافی مانگتا ہوں۔ میں نے مصر کا ذکر اس لیے کیا تھا کہ آپ کو ان حالت سے آگاہ کروں جو میرے کانٹن تک پہنچیں:

ہلاکو خان خوش ہو گیا اس نے کہا:

"نبی بات تو میں خیر سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ تو نے اس کا اٹا مطلب نکال لیا۔ اب اب تاکہ تجھے

مصر کے بارے میں کیا کیا باتیں معلوم ہوئیں۔"

اس نے بڑے ادب سے کنا شروع کیا:

"خان محترم! مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت مصر کی حکومت تین ہستیوں کے ہاتھ میں ہے۔"

"یہ تو نے کیا کہا؟" ہلاکو خان حیرت سے بولا اور بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا:

"ایک حکومت تین بادشاہوں کے پاس کیسے ہو سکتی ہے۔ تو نے غلط سنا ہے۔ ہمارا بھی ایک ہی

نشان ہے۔ بغداد کا بھی ایک ہی خلیفہ تھا۔ پھر مصر میں بیک وقت تین بادشاہ کیسے ہو سکتے ہیں؟"

قط بونا نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا اور نہ اس کے موٹے دماغ نے اس کی ضرورت ہی محسوس کی۔ تو اس نے کہا:

"خان محترم! میں نے جو کچھ سنا ہے وہ آپ سے بیان کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ یہ جھوٹ ہو اور ہلاکو آپ نے کہا ہے کہ ایک حکومت میں تین بادشاہ نہیں ہو سکتے تو پھر یہ بات واقعی جھوٹ ہی ہو گی۔"

قط بونانے بات ختم کر دی۔

ہلاکونے اس کی بات کاٹ کر خود ہی گفتگو کا راستہ بند کیا تھا مگر اس کے دل میں ایک دھڑکا تھا۔ اس سے نہ ہلایا اور پوچھ بیٹھا:

”بھوٹ سچ کا پتہ تو ہم بعد میں لگائیں گے۔ تو یہ بتا کہ تو نے اور کیا کچھ سنبھے مصر کے بارے میں نے تو یہ سنبھے اور یقیناً بھوٹ سنبھے کے مصر پر ایک ساتھ میرسن کا اندازا قسطنطنیہ آشفہ مصر لڑکی شجرۃ الدر کی حکومت ہے۔“

تاریخی اعتبار سے یہ بات قطعی غلط اور بے بنیاد ہے۔ مصر کے متعلق اس قسم کے بے سرو پا تہر کے ایک راہب ولیم کی ہر زمر مرثی ہے جسے مغرب کے مؤرخین نے تاریخی حیثیت دے دی۔ اس راہب یہ بھی دعویٰ تھا کہ وہ مصر تک مصر میں رہا ہے اور اس زمانے میں جب بغداد پر حملہ ہوا تو وہ مصری موجود تھا۔

ہلاکوخان کو جب یہ معلوم ہوا کہ مصر میں ایک لڑکی بھی حاکم ہے تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ اور اس نے پوچھا:

”کیا اس لڑکی نے جس کا تو نے کچھ عجیب ٹیڑھا سنا نام لیا ہے، شادی کر لی ہے۔“

قط بونانے اس طرح ہلاکوکو گھونسا جیسے اسے ہلاکوکا یہ کچر سوال ناگوار گزارا جو لیکن وہ ماتحت تھا کر سکتا تھا۔ اس نے بے دلی سے کہا:

”شان محترم! مجھے اور کوئی تفصیل نہیں معلوم۔ پتہ نہیں وہ شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ۔ کوئی بات نہیں۔ ہم مصر پہنچ کر خود ہی معلوم کر لیں گے۔“ ہلاکوخان نے ایک کمرہ قہر کرتے ہوئے کہا۔



دارالاسلام بغداد کی کتابی سے نہ صرف پورا عالم اسلام ہن کر رہ گیا بلکہ اس کی بازگشت درباریائے دارالاسلام کے کنارے مراٹے باتو میں بھی سنائی دی۔

اس عدتے میں مغلوں کا ایک قزاقرم سے نکالا ہوا خاندان زریں خیل کے نام سے حکومت کر رہا اس خاندان کا مختصر حال یہ ہے کہ تو جین چنگیز خان کی بیوی کو اس کے دشمن اغوا کر کے لے گئے تھے۔

ماں بعد جب واپس آئی تو اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ سنا جائز اولاد کو چنگیز کے لڑکوں نے اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چنگیز خان نے رفع شر کے لیے جوہی خان (ماجاٹز اولاد) کو روس کا علاقہ سے کوتر قزم سے دور بھیج دیا۔

جوہی کے بیٹے ساتیں باتوخان نے روس میں ایک ستم حکومت قائم کر کے مراٹے ہاتھ کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ باتوخان کے بعد اس کا بھائی برقائی خان وہاں کا حاکم ہوا اور مراٹے برقائی کو دارالسلطنت بنا کر حکومت کرنے لگا۔

برقائی خان نے اپنے بھائی کے محمد حکومت ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس نے حاکم ہونے کے بعد خلیفہ بغداد سے سید خدمت بھی حاصل کر لی تھی۔

جب مراٹے ہاتھ اور مراٹے برقائی میں بغداد کی تباہی اور خلیفہ مستعصم کے دہشت ناک قتل کی خبر پہنچی تو برقائی کو بڑا غصہ آیا اسے خلیفہ کے مارے جانے کا صدمہ بھی ہوا کیونکہ وہ خلیفہ کی عزت کرتا تھا۔ ابھی ہلاکوخان، بغداد سے مصر کی فوج کے لیے روانہ نہ ہوا تھا کہ مراٹے برقائی سے ایک وفد ہلاکوخان کے پاس پہنچا۔

ہلاکوخان نے فوراً وفد کو بار بارانی کی اجازت دے دی۔

اس وفد کے تمام ارکان مسلمان تھے۔ دو داخل اور تین چنگ یا قچماقی۔ یہ وفد جب بغداد کے قصبہ مونیہ میں داخل ہوا تو وہاں کی ویرانی دیکھ کر بڑا ملول اور غمگین ہوا۔ خلیفہ عباسی مامون الرشید کا بخوابا ہوا مقبرہ بغداد پر حملے کے دوران کٹی جگہ سے شکستہ ہو گیا تھا۔ مگر اس کی آب و تاب اب بھی برقرار تھی اور عباسیوں کے لڑچ کی داستان دہرائی تھی۔

وفد کے ارکان ہلاکوخان کے سامنے پہنچے انھوں نے مرہو لانے کے بجائے اپنی بیٹائیوں تک ملحقہ لے کر لے آئے۔

ہلاکوخان کی مغرور بیوی دو قوز خاتون تخت پر ہلاکوکے پسو میں بیٹھی تھی۔ اسے وفد کی یہ بات بہت رنجی۔ ہلاکوکے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے سختی سے کہا:

”کیا تمہیں نہیں معلوم کہ تم کس کے سامنے پیش ہو؟“

معلوم ہے کہ ایک کس نے جواب دیا۔

”چہر تم تعظیم کیوں نہیں بجالاٹے؟“ دو قوز خاتون نے کہی:

”بلکہ تمہیں علم ہے کہ ہلاکوخان، جنوب اور جنوب مغرب کا فاتح ہے اور اس تمام علاقہ کی بادشاہت فرمانے والے اسے اور اس کی اولاد کو بخش دی ہے۔“

قراقرم کے خاقان منگوخان نے شیخ اجل کے قلعہ الموت اور بغداد کی فتح کے بعد ہلاکو خان پر لیخ (فرمان) کے ذریعہ ایل خان (چھوٹا خان) کا خطاب دیا تھا اور اس کے تمام مفتوحہ علاقے فتح ہونے والے علاقے ہمیشہ کے لیے ہلاکو اور اس کی اولاد کو بخش دیے تھے۔ دو قوز ناظر اسی بات کی طرف اشارہ کیا تھا۔

وفد نے دو قوز کی باتوں کی قطعی پروا نہ کی۔

ایک رکن نے جواب دیا:

خاتون محترم! آپ کو علم نہیں کہ سرکاری وفد کو کہتے ہیں۔ وفد کے معنی یہ ہیں کہ وفد رکن اس ہستی کی نمائندگی کر رہا ہے جس نے وفد روانہ کیا ہے۔ آپ نے وفد بھیجے والے نہیں کیا۔ آپ نے ہم کو خوش آمدید نہیں کہا۔ ہم نے پھر بھی آپ کو سلام کیا۔ اس سے زیادہ اہم تعظیم کی آپ ہم سے توقع کیوں رکھتی ہیں؟

ہلاکو خان کو غصہ آگیا۔ وہ سختی سے بولا:

”ہم فضول باتیں نہیں سنا چاہتے۔ کیا کہنا اہم ہے برقیانی؟“

ہلاکو خان کے غصے پر ایک رکن، رکن الدین کو ہستانی کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے ہلاکو سے

لجہ اختیار کیا۔

وہ بولا:

”وفد کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اسے واپس جانے کی اجازت دی جائے۔“

ہلاکو خان کا غصہ کافی ہو گیا۔ ایک زمانے کے بعد اس کے سامنے جرات کا یہ مخاطبہ ہوا

نرم لہجے میں کہا:

”کیا تم وہ بات نہ بتاؤ گے جسے کہنے کے لیے تم نے انتظار میں سفر کیا ہے؟“

”ضرور بتائیں گے۔“ رکن الدین نے اسی تیزی سے کہا،

”لیکن آپ نے شمشاد مغرب برقیانی خان کی توہین کی ہے۔ آپ کو ان کا نام بغیر انقاب کے نہ چاہیے۔ کم از کم آپ کو ان کے نام کے ساتھ لفظ ”شان“ تو لگانا چاہیے۔ پھر رشتے میں وہ آپ کی بھی توہین ہے۔“

دو قوز خاتون ریل دیتے ہوئے بولی:

”برقیانی مسلمان ہو گیا ہے۔ وہ خان نہیں رہا۔ پھر وہ ہمارا بھائی کیسے ہو سکتا ہے؟“

”اور دو قوز عیسائی ہو گئی ہے۔“ رکن الدین گر جا

پھر دو قوز، ہلاکو خان کی بیوی کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر مذہب بدلنے سے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں تو آپ کا رشتہ بھی ختم ہو چکا ہے۔

دو قوز لا جواب ہو گئی۔

ہلاکو خان نے اس کے گرتے ہوئے وقار کو سمجھانے کے لیے وفد سے کہا:

”ہم برقیانی خان کو شمشاد مغرب تسلیم نہیں کرتے۔ پھر تم ہمیں کیسے مجبور کر سکتے ہو کہ ہم اس کا نام اٹھائیں؟“

رکن الدین نے

وفد میں سے ایک دوسرے رکن نے بولنے کی کوشش کی مگر رکن الدین نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

خان ہلاکو خان کی یہ بات بالکل درست ہے کہ ہلاکو خان، برقیانی خان کو اپنا بھائی اور شمشاد مغرب تسلیم کرنے کو شمشاد مغرب برقیانی خان بھی ہلاکو خان کو ایل خان اور بغداد کا بادشاہ نہیں سمجھتے۔ یہ باتیں سمجھنے نہیں بلکہ سمجھنے کی ہوا کرتی ہیں۔ ہلاکو خان کو بھی یہ علم ہے کہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تلوار کے زور پر بتائی جاتی ہے۔

گستاخ! ہلاکو خان بیچ بچہ پڑا:

”ہم تمہیں قتل کر سکتے ہیں۔ تم نے ہلاکو خان کی توہین کی ہے۔“

رکن الدین سکرایا اور بولا:

ہلاکو خان وفد کے ارکان اپنے سر جھکی پر لے کر نیر کے دربار میں جایا کرتے ہیں۔ تم ہمیں موت کی گلی دیتے ہو۔ ہماری موت شمشاد مغرب برقیانی خان سے اعلان جنگ ہو گا اور پھر برقیانی لشکر تمہیں دجلہ اور اتر کے درمیان اس طرح محصور کر دے گا کہ تم کو قراقرم واپس جانا نصیب نہ ہو گا۔

ہلاکو خان نے ظہیر میں آکر وفد کو قتل کرنے کا حکم دینا چاہا مگر الفاظ اس کے حلق میں ہی روک گئے۔

لے ہوئے ٹھکانا اور ہونٹوں پر زباں پھیرتے ہوئے کہا:

”ہمیں برقیانی خان کا پیغام آنا چاہیے۔“

برقیانی خان نے بیجا کربانی بھیجنا تھا۔

رکن الدین نے وہ پیغام دہرا دیا:

”تم نے بغداد کے آخری خلیفہ کو مغل گھوڑوں کی ٹاپوں کے بیچ کپڑا کر مار ڈالا۔“

تم نے ایک مقدس مقام (دارالسلام بغداد) کی بے حرمتی کی۔ اور اس محلے میں پہلے اپنے
 کے دوسرے افراد سے مشورہ نہیں لیا۔
 ہلاکو خان نے پیغام بڑے تحمل سے سنا۔ پھر بولا:
 "برقائی خان کا پیغام زبانی ہے اس لیے ہمارا جوابی پیغام بھی زبانی پہنچایا جائے۔
 ارکان ہمارے یہ الفاظ برقائی خان تک پہنچا دیں:
 "ہم نے تماری سرحدوں میں دخل نہیں دیا اس لیے تمہارا شکوہ
 غلط ہے۔ ہم اپنے معاملات کے خودممدار ہے کسی اور کے
 ضرورت نہیں۔
 ہلاکو خان نے یہ پیغام بھیج کر خانہ جنگی کے فوری خطرے کو وقتی طور پر ٹال دیا لیکن وہ برقائی
 کے بگڑے ہوئے تیوروں سے محتاط ہو گیا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ فتح منہر کے بعد وہ برقائی خان کو
 سکھائے گا کہ اس کی تسلیں یا کرتی نہیں گی۔

اس علاقہ کے مسلمان اپنے کو برقائی خان کی رعایا سمجھتے تھے۔ انھوں نے فوراً برقائی کو اطلاع دی کہ اس علاقہ
 کے مسلمانوں کو اذان کی اجازت نہیں اور عیسائیوں کے لیے عید ہو گئی ہے۔ ہرادی اعلیٰ عیسائی سبڑا کر پکڑے
 اپنے گیت گاتا پھرتا ہے۔
 مسلمانوں کے مقابلے میں مغلوں کو اپنا ہمدرد اور غیبی مدد سمجھ کے ہلاکو خان کے اردو (شکر) میں عیسائی
 جیوانٹ۔ یہاں تک کہ صلیبی عیسائی بھی بچے جوتے جارہے تھے اور ہلاکو خان کہتا تھا:
 "میرے لیے دیکھو نہ کہ میرے نصیب کھل جائیں۔
 ہلاکو خان کے دستے جدھر جدھر سے گزرتے مسلمانوں کو الگ الگ دی جاتی اور دھوکے، بل بندہ ہوتے لیکن
 کپڑوں کو کوئی ہاتھ نہ لگاتا۔ ان کی گھنٹیاں بختی رہتیں۔ دو قوز خاتون کے چیل کی گھنٹیاں بھی بختیں۔ تعجب ہے کہ دو قوز
 کے چیل کی گھنٹیاں بغداد کی حدود میں کیوں خاموش رہیں؟ وہ کون سا خوف تھا جس کی وجہ سے دو قوز کو صدمہ لاحق
 رہا؟ پھر بچے بچے اور گھنٹیاں بجانے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس کے چیل کی گھنٹیاں اتنی سمجھدار تھیں کہ وہ صرف ان عداوتوں
 میں بختیں جہاں کلیسا ہوتے اور عیسائی زرق برق لباس میں مغلوں کے استقبال کو تھارا اندر قطار راستوں پر
 لڑے دکھائی دیتے۔

ایک شام ہلاکو خان کے ہراول دستے کے چند سپاہیوں نے آتابک اور مریم کے لیے ایک نئی مسیت کھڑی کر دی
 جلال الدین آتابک، امرنے والی کی نصیحت اور یاد دہانی کے مطابق منہر کے سفر کی تیاری کر رہا تھا۔ آج رات اسے اپنے سفر
 کا آغاز کرنا تھا۔

مریم کا باپ جیکب، آتابک کے سفر کے لیے کچھ موزی سامان ویران آبادی کے گھروں میں ڈھونڈنا پھر رہا
 تھا۔ محل ہراول کے چند سوار ادھر آگئے۔ شام کا چاند لگا تھا۔ وہ اس ویران آبادی سے ہلکے گزرتا چلتے تھے جیکب
 قلعہ میں سامان ڈبلے ایک مکان سے نکل رہا تھا۔ محل سواروں کی نظر اس پر پڑی تو انھوں نے گھوڑوں کا رخ جیکب کی
 ٹانگہ مڑوا کر جیکب نے مغلوں کو آتے دیکھا تو سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ وہ چھپتا ہوا حویلی کی طرف جا رہا تھا۔
 محل سپاہی اس ویرانے میں ایک آدمی کو دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ انھیں شبہ ہوا کہ یہاں اور آدمی بھی
 موجود ہوں گے۔ انھوں نے بھاگتے ہوئے جیکب کا پڑ پڑا اور تنگ گلیوں میں بھی تعاقب جاری رکھا۔ جیکب انھیں
 بھاگایاں دیتا ہوا ایک گلی سے دوسری گلی میں بھاگ رہا تھا لیکن موت امد کے پیچھے گئی تھی۔

پھر جب جاڑے آئے تو ہلاکو خان کی رتھ گاڑی کھڑکھڑاتی ہوئی مغرب میں نمودار ہوئی۔ اس
 رتھ (چکر) الموت اور اسمعیلیوں کے دوسرے قلعوں اور بغداد کے مال غنیمت سے بھرے ہوئے
 ہلاکو خان نے قفقاز کے سلسلہ کوہ کے جنوبی دامن میں اپنا خیمہ نصب کیا۔ یہاں گلوں کے لیے چراگاہوں
 تھی۔ اور بلند وادیوں کا پانی تازہ اور شیریں تھا۔

روس کا شہنشاہ مغرب برقائی خان قفقاز کے اس پار کی چراگاہوں کو بھی اپنا حصہ اور رتھ
 جہاں ہلاکو خان نے خیمہ نصب کیا تھا وہاں سے قفقاز کی چوٹیاں صاف نظر آتی تھیں۔ یا تو خان کی طرف
 بھی اپنے آپ کو خاندان سے جلا وطن خیال کرتا تھا۔ وہ اس کے لیے قطعاً تیار نہ تھا کہ کوئی اور محل
 سرحدوں پر دخل و مقولہ کرے۔

یہاں ہلاکو خان نے ایک رصد گاہ تعمیر کرائی اور بغداد سے لوٹے ہوئے مال کا خرید رکھنے کے
 ایک عمارت بھی بنوائی۔ اور پھر اس کی ستوری عیسائی ضدی بیوی دو قوز خاتون نے کیسی کی گھنٹیاں
 شروع کیں جن کی آواز سے ارمی عیسائی بہت خوش ہوئے۔

ایک موڑ مڑتے ہوئے مغل سپاہی نے اس کا نشانہ باندھ کر تیر چھوڑا۔
تغلا کا پیغام تھا۔

جبکہ اپنے خیال میں بھاگ رہا تھا کہ تیر اس کی پشت میں داخل ہو گیا اور جگر کا شتا بوا دل کے قریب گیا۔ جبکہ لڑکھڑایا۔ پھر سنبھلا اور کوشش کر کے ایک شکستہ دیوار کے پیچھے ہو گیا۔
مغل سپاہی گھوڑے بھگاتے اس کے قریب سے نکل گئے۔ اتنا موقع جبکہ کے لیے غنیمت تھا۔ اس کو ایک گھنی جھاڑی میں پوشیدہ کر لیا۔

مریم اور انا تک نے گھوڑے بھگنے کی آوازیں سن لی تھیں۔ وہ جبکہ کے واپس نہ آنے سے پریشان تھیں اس کی تلاش میں تہ خانے سے باہر آئے لیکن جب انھوں نے مغل گھوڑوں کو بھگتے دیکھا تو پھر تہ خانے میں چھپا۔ وہ دن میں تہ خانے سے باہر ہی نکلتے تھے کیونکہ مغل سوتے ایک ایک دو دو کر کے ادھر سے دوز گزرا کرتے رات کو وہ باہر نکل کر اپنے مزدوری کا انجام دیتے تھے۔

کئی گھنٹے تہ خانے میں رہنے کے بعد مریم اور انا تک پھر جبکہ کی تلاش میں نکلے۔ اب رات ہو چکی تھی اور پرتارے جگمگا رہے تھے۔ مغلوں کے گھوڑوں کی آوازیں معدوم ہو چکی تھیں۔ استنباط کے طور پر وہ چراغ تہ خانے میں چھوڑ گئے تھے۔

حویلی میں گراسٹا جھایا ہوا تھا۔ انا تک نے ٹوٹی دیوار سے باہر جھانک کر دیکھا ہر طرف ایک ہوا کا ماحول تھا۔
نے تہ خانہ حویلی سے باہر نکالے۔ مریم اس کے پیچھے پیچھے تھی۔
اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ انا تک نے دو قدم اٹھائے لیکن اس کا تیسرا قدم کسی چریت سے ٹکرا۔
وہ بھجک کھڑا ہو گیا۔ فوراً جھک کر ٹوٹا۔

یہ جبکہ تھا۔

جبکہ اندھ منہ زمین پر پڑا تھا اور تیر اس کی پشت میں پیوست تھا۔
مریم کی ایک سسکی نکلی۔ انا تک نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ مغل کہیں گات نہ بیٹھے ہوں۔ پھر اس نے مریم کی مدد سے جبکہ کی اپنی پیٹھ پر لا دیا اور آہستہ آہستہ حویلی میں داخل ہوا جبکہ کے تالپڑے خون میں لیت پتے تھے۔

"تیر کیسے نکالا جانے مریم؟" انا تک نے نگلیں آوازیں کہا:
"کیا تمہیں تیر نکالنا آتا ہے؟"

مریم کی آنکھیں برس پڑیں۔ وہ بیچہ مار کر باپ کے پیروں سے لپٹ گئی۔

موسلے سے کام لے کر مریم: "انا تک نے اسے باپ سے جدا کرتے ہوئے کہا:
اس طرح روتی رہو گی تو وقت گزر جائے گا اور ہم کچھ نہ کر سکیں گے۔" انا تک نے مریم کو چپ کرانے کی ذرا ہنسی کی۔

مریم سنبھل گئی۔ اس نے آنسو پونچھ ڈالے اور کھوٹے کھوٹے انداز میں بولی:
"میں کیا کروں انا تک۔ تیر میں کیا کروں۔ میرے باپ کو بچا لو انا تک۔ میں باہر بے سہارا ہو جاؤں گی۔"
میں کا کوئی سہارا نہیں ہوتا اس کا سہارا خود خدا ہو گیا کہ تیر ہے۔" انا تک نے اسے تسلی دی اور سر سے ڈال کر مریم کے آنسو پونچھنے لگا۔

مریم نے تسوانی جیا کے تحت نظریں نیچی کر لیں۔
اس کے ساتھ ہی اسے باپ کے جسم میں حرکت محسوس ہوئی۔ اس نے انا تک کو اس کی طرف متوجہ کیا اور دو دو بار جھک گئے۔

جبکہ کا سوا واقعی حرکت کر رہا تھا۔ یوں معلوم ہوا جیسے وہ کروٹ لینا چاہتا ہے۔ انا تک نے اسے سہارا دے کر روٹ دلائی۔ مریم، باپ کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی اور تیر کو پکڑ لیا تاکہ تکلیف نہ ہو۔
جبکہ نے آنکھیں کھول دیں۔ انا تک اس کے سامنے اور مریم پیسو میں بیٹھی تھی۔

جبکہ کو ہوش میں دیکھ کر انا تک نے جلدی سے پوچھا:
"بزرگ محترم! یہ تیر کیسے نکالا جائے؟"

جبکہ کی کھلی ہوئی آنکھیں ضعف سے جھپکنے لگیں۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ انا تک نے جلدی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

جبکہ نے پیسو میں بیٹھی ہوئی مریم کی طرف اپنی گردن گھائی مگر اس کی زبان سے آواز نہ نکل سکی پھر بھی نے مریم کو آنکھ سے کچھ اشارہ کیا۔ مریم شاید کچھ سمجھی تھی تاہم اس نے بھی اپنا ہاتھ جبکہ کے ہاتھ سے دیا۔

جبکہ کی آنکھیں ضعف سے پھرنے لگیں۔ اس نے پوری طاقت سے اپنے دونوں ہاتھوں کو ملانے کی کوشش کی۔
دشمنانہ انا تک اور مریم نے شاید اس کا مدعا سمجھتے ہوئے خود ہی ہاتھ ملا دیے۔

جبکہ کے دونوں ہاتھ اس طرح ملے کہ مریم کے ہاتھ پر انا تک کا ہاتھ آ گیا۔ پھر جبکہ کے جسم کو جیسے اندھنہ مارا گا اور اس کی گردن مریم اور انا تک کے ملے ہوئے ہاتھوں پر جھک گئی۔

انا تک نے مغلوں کے خون کی وجہ سے یہ رات تہ خانے کے اندر گزارنے کا فیصلہ کیا۔ مریم کو کیا اور مغل

ہو سکتا تھا اب سوائے انا تک کے اس دنیا میں اس کا کون تھا۔ وہ انا تک کی ہر بات ایک حکم سمجھ کر مانتی تھی۔
نہ خانے میں اتر گئے۔

انا تک نے اسے سوجانے کے لیے کہا اور خود اس سے کچھ فاصلے پر دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔
انا تک کے سفر کے تمام انتظامات پہلے ہی ہو چکے تھے۔ اگرچہ ایک بے وقت موت واقع نہ ہو سکتی
وہ اس وقت تک اس جہلی سے کافی دور پہنچ چکا ہوتا۔ اب اسے اپنے ساتھ مریم کی بھی فکر تھی۔ اس کا دل
پریشان تھا۔ جہلی میں اب پڑے رہنا بالکل بے کار تھا۔

ان ہی خیالوں میں وہ دیر تک الجھتا اور کڑوٹیں بدلتا رہا۔ پھر اسے بھی نیند آگئی اور وہ دنیا و مافیاء
بے خبر ہو گیا۔



صبح کو پہلے مریم کی آنکھ کھلی۔ جہلی کے تنہا کے چور روشندان سے صبح کی پہلی روشنی اور ہلکے
جھونکے اندر آرہے تھے۔

اس نے بڑی محبت سے انا تک کو دیکھا جو اس کا اب واحد سہارا تھا۔ انا تک اب تک بے خبر سو رہا تھا۔
مریم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس گئی اور اس کے پائنتی پیٹھ پر انا تک کے پیرا پیرا ہستہ ڈالنے لگی۔
انا تک کی آنکھ یکایک کھل گئی۔ اس نے مریم کو پیر دلتے دیکھا تو فوراً اپنے پیر پھینچ لیے اور ہر بڑا
اٹھ بیٹھا۔ مریم بڑے پیار سے اسے دیکھ رہی تھی۔

انا تک نے کہا:

”مریم۔ تمہارے بپ نے مجھ پر جو احسان کیے ہیں ان کے بوجھ سے میری گردن چھلک رہی ہے۔
کی اتنی خواہش مزدور پوری کروں گا۔ یہی بات مجھ سے مازانی نے مرنے سے پہلے بھی کہی تھی لیکن.....
انا تک کہتے کہتے رکا۔

مریم نے گہرا کراہے دیکھا۔ اسے اپنی امید کی کشتی بیچ بھنور میں بچکولے کھاتی محسوس ہوتی تھی۔
چہرے پر انا تک کے پہلے الفاظ سے جو وقتی شکستگی پیدا ہوئی تھی وہ یک دم مٹا ہوا ہو گیا۔ اب اس کی آنکھ
میں باس کے سائے بھرا رہے تھے۔

انا تک کو اپنے کلمے پر افسوس سا ہوا۔ اس نے مریم کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

مریم۔ تم ادا سن ہو تم جو چاہتی ہو دی ہو گا۔ میں مازانی اور جیکب کی دوجوں سے شرمندہ نہیں ہونا
چاہتا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان جب تک کسی عورت سے عقد نہ کرے اس کی طرف نظر
ہر جہی نہیں دیکھ سکتا۔ تمہارے مذہب نے اس بات کی سخت ممانعت کی ہے۔

انا تک۔ میں نے تمہاری گفتگو اور کردار دیکھ کر پہلے ہی تمہارا مذہب پسند کر لیا تھا۔ اب تم میری بات
نہ کر میرے ارادہ کو اور مستقل کر دیا ہے۔ میں دل سے دین اسلام قبول کرتی ہوں۔

انا تک مریم کے منہ سے یہ غیر متوقع بات سن کر خوشی سے جھوم اٹھا اور پرمست لہجے میں بولا:

مریم تم نے میری بہت بڑی مشکل آسان کر دی۔ اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ بھٹوں کا رخ صلیب کی طرف
ہے۔ عجم شام ہوتے ہی راستہ ٹاٹ دشمن روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں میرا ایک رشتہ ناجچا رہتا ہے۔ ہم
دشمن میں تمہیں مسلمان بھی کر لیں گے اور تم سے عقد بھی کر لیں گے تاکہ ایک جگہ اٹھنے بیٹھنے میں کوئی بات مانع نہ ہو
اور اگلے سفر کرنے میں ہمیں آسانی ہو۔

مریم بھی چاہتی تھی۔ اسے سفر کی تیاری کرنی تھی تاہم وہ دن بھر سفر کے لیے پیریز میں اٹھ کر رہی۔
نام ہوئی تو دونوں گھوڑوں کی تلاش میں نکلے۔

انا تک کے گھوڑے تو پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے لیکن بستی میں آزاد گھوڑوں کی کوئی نہ تھی۔ بستی
دالے منظر کی دہشت سے گہرا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے پھر وہ جانوروں کو کیا ساتھ لے جاتے۔ بے چارے بے زنا
بائبروں بھر اور ادرھ کر کھاس چرتے رہتے اور شام ہوتے ہی اپنے بے نام گھوڑوں کے سامنے پہنچ جاتے۔
انا تک نے دو گھوڑوں کو پسند کیا اور اگلے بڑھ کر ان کو نالو کر لیا۔ جہلی میں لایا اور سامان بار کر کے ایک پر خود
اور دوسرے پر مریم کو سوار کیا۔ پھر وہ بھگی رات میں جہلی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر عازم دمشق ہوئے۔



۱۲۵۹ء کے جاٹوں کے ہاکو خان نے قفقاز کے جنوب میں گزارے لیکن جب گرمیاں شروع ہوئیں تو ہاکو
خان قفقاز کی چڑچڑیوں پر عجیب طرح کی ٹوبہ یوں کو متحرک دیکھا۔

اس نے دیر پاہت حال کے لیے اپنے سوار دوڑائے۔ سواروں نے واپس آکر بتایا کہ قفقاز کی چوٹیوں پر
سوار مغرب برقیانی سان کی فوج مورچے سمجھا رہی ہے۔

ہاکو خان اس خبر سے بہت پریشان ہوا۔ مغربی ایشیا اور مہر کی فتح کے خواب اسے جھٹکتے نظر آئے۔

اب سے فیصلہ کرنا تھا کہ پہلے برقائی خان سے دودھ ہاتھ کرے یا مغربی ایشیا کی طرف بڑھے۔

اس نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔ دو قوز خاتون کی شہ پر عیسائیوں نے جو آدم اس علاقے پر چار کھا تھا، یہ اس کا ردِ عمل تھا۔

قفقاز کی چوٹیوں پر حرکت کرنے والی ٹوپیاں دراصل برقائی خان کے ہراول دستے تھے۔ ان کی کان ایک چمچائی ترک کے ہاتھ میں تھی۔

برقائی خان کے اردو (لشکر) میں ترکوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور اب اس کا لشکر مغلوں کے بجائے جنگجو مسلمان ترکوں، جنہیں تاتاری کہا جاتا تھا، پر مشتمل تھا جس میں مغل کم اور یہ چمچائی ترک مسلمان زیادہ تھے۔

برقائی خان کو ہلاکو کا بیٹا جو اب موصول ہو چکا تھا۔ بغداد کی تباہی اور اب اس کے علاقے کی پامالی سے برقائی خان نے لشکر کی تیاری کا حکم دیا اور اپنے ہراول دستوں کو قفقاز کی بلند یوں کی طرف روانہ کر دیا۔

برقائی خان نے یہ دستے جو انتہائی برق رفتاری سے مغلوں کے "چھٹ" والے سٹے کے، ہر تھے اس کے

روانہ کیسے تھے کہ ہلاکو کے لشکر کو قفقاز کے دروں اور وادیوں میں اس وقت تک الجھا کر رکھا جائے جب تک برقائی خود لشکر کے مقابلہ پر نہیں پہنچتا۔ برقائی خان، ہلاکو پر پوری قوت سے بھرپور وار کرنا چاہتا تھا۔

ہلاکو خان کو اپنے سرداروں سے تو کوئی خاص مشورہ نہ ملا مگر اس کی حکمت پروری و قوز خاتون نے اسے ایک ایسا مشورہ دیا جسے اس نے فوراً قبول کر لیا۔ اسے اس وقت احساس ہوا کہ قراقرم سے روانگی کے وقت

خاقان منگو خان نے اس سے کہا تھا کہ دو قوز کے مشوروں پر عمل کرنا۔

ہلاکو نے دو قوز کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے فوراً حکم نازل کیا کہ کلیساؤں میں گھنٹیاں نہ بجائی جائیں اس کے ساتھ ہی اس نے مسلمانوں کو مسجدوں میں اذان دینے کی اجازت دیدی۔

دراصل وہ اپنے عمل سے یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ متعصب نہیں ہے بلکہ مسلمان اور عیسائی اس کی نظروں میں برابر ہیں۔

اس بات کا کچھ اور اثر ہوا جو ایسا ہو اہو لیکن انتہا ضرور ہوا کہ وہ مسلمان، جن کا کھانا پینا عیسائیوں نے حرام کر رکھا تھا، اب اپنے کاموں میں سکون سے لگ گئے۔ کچھ مسجدوں سے اذانوں کی آوازیں بھی بلند ہوئیں۔ یہ اذانیں

ہلاکو کے آدمیوں نے فزردستی مسلمانوں سے دوائی تھیں تاکہ ان کی آواز قفقاز کی چوٹیوں پر پہنچ جائے۔

ہلاکو خان نے دوسرا حکم یہ کیا کہ اس نے قفقاز کی بلند یوں کی طرف اپنا ایک وفد روانہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ برقائی خان خود ان بلند یوں پر موجود ہے۔ یہ پیغام زبانی تھا۔

وفد قفقاز کی ترانی میں پہنچا تو برقائی کے ترکوں نے نیچے اتر کر اس کا راستہ روک دیا۔ وفد نے بتایا کہ

برقائی خان کو پیغام بھیجا ہے۔ اس لیے وفد کو برقائی کے سامنے پیش کیا جائے۔

برقائی نے ہراول دستوں کو ہدایت کر دی تھی کہ ہلاکو خان کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ قفقاز میں کتنی وجہ موجود ہے۔ اس لیے وہاں سخت پہرہ چوکی کا انتظام تھا۔

برقائی خان کے ترکوں نے جنہوں نے وفد کو روکا تھا، وفد کو بتایا کہ برقائی خان ایک منزل پیچھے پڑاؤ

ڈالے ہوئے ہے اور وفد کو وہاں جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، اس لیے کہ وفد کا اس کے علاقے سے گزرنا ذی نقص نظر سے نقصان دہ ہے۔

وفد نے مجبوراً ہلاکو خان کا پیغام برقائی کے ترکوں کو زبانی سنایا۔ پیغام کا مفہوم کچھ اس طرح کا تھا:

"موجودہ جنگجو خان کے پوتے ہلاکو خان فاتح ایران و بغداد کا پیغام، جنگجو خان کے پوتے شہنشاہ مغرب برقائی خان کے نام

کہ۔ ہمارا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ علاقہ تمہارا ہے۔ ہم اسے چھوڑ کر مغرب سے جنوب کی طرف جا رہے ہیں۔"

ہلاکو خان نے بڑی جاکاکی سے خود کو برقائی کے مقابلے سے بچا لیا تھا۔ اس کا یہ پیغام جس وقت قفقاز کی

میدان پر پہنچا اس وقت ہلاکو کے لشکر نے اپنے خیمے اکھاڑ کر چھوڑ دیے تھے۔ ہلاکو خان نے بڑی

بڑی سے روانگی کا حکم دیا اور تمام ہونے سے پہلے یہ میدان ایسا خالی ہو گیا جیسے اس میں کوئی بسا

نہ تھا۔ ہلاکو خان کے پیغام کے ساتھ برقائی خان کو دوسرا پیغام اپنے ہراول کے سردار سے موصول ہوا جس میں اس

کا پیغام ہلاکو خان قفقاز کی وادیاں چھوڑ کر تیزی سے جنوب کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔

برقائی خان کو اس خبر سے تہہ رے اطمینان ہوا لیکن اس نے اپنی تیاریوں میں کوئی کمی نہ کی۔ یہ تیاریاں

بڑی جلدی سے کی گئیں۔ وہ کب پلٹ کر قفقاز پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرا وفد ہلاکو خان

کو اس پر حکم نہیں کہ تا تو برقائی خان کو تو اس سے بغداد کا انتقام لینا ہی ہے۔ پھر وہ یہ بھی کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس کی اور ہلاکو خان کی سرحدیں مل جائیں اور روز جھگڑے ہو کر یں۔ اس نے جنگی تیاریوں میں کوئی

لگن نہ اور وقت کا انتظار کرنے لگا۔ ہلاکو خان اتفاقاً زے منہ چھپا کر تو آگے بڑھ گیا لیکن اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف لاداکھول رہا

سے غلوں کو صف آرا کیا۔
اس نے راسیں کھینچیں مگر گھوڑا بے قابو ہونے لگا۔ شاہد غلوں کی بھیاں مورتیں دیکھ کر وہ اپنے
سوار کو فوراً حملہ کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔
یوسف کا ناٹ گھوڑا اڑھا کر اس کے قریب آیا۔ دونوں میں کچھ گفتگو ہوئی۔ پھر یوسف نے اپنے
پانچ ہزار سواروں کو پانچ پانچ سو کی دس ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے میدان میں اس طرح پھیلا دیا کہ حد نظر
پہلے مسلمانوں کا اسلحہ ہی لشکر دیکھا دیتا تھا۔

بدو خان مسلمانوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہ لگا سکا۔ ایک تو یوسف کی خوش سلیقہ ترتیب دوسرے
پیدا ہوا اندھیرا۔ بدو بھی سمجھا کہ چالیس پچاس ہزار کا لشکر اس کے مقابلے پر آگیا ہے۔ وہ خوف کھا گیا اسے
ند کی جرات نہ ہوئی۔ اس نے فوراً ایک تیز رفتار قاصد ہاکو خان کی طرف بھیجا اور اس سے مدد طلب کی۔
پتہ نہیں بدو خان کے سوا نے ہاکو خان کو کیا خبر دی کہ وہ بجائے ملک روانہ کرنے کے خود پورے
لشکر کے ساتھ تیزی سے بدو خان کی مدد کو چل پڑا۔

اور جب صبح ہوئی تو یوسف صاحبقرانی کے سامنے میلوں تک غلوں کا پھیلا ہوا لشکر دکھائی دیا۔ یوسف
اتنے بڑے لشکر کو دیکھ کر بالکل ہراساں نہ ہوا۔ وہ ہراساں کیونکر ہو سکتا تھا۔ وہ دوسرے کھن باز نہ آیا تھا۔
اس نے اپنے دستوں کی ترتیب کی طرح برقرار رکھی پھر اپنا مشکی گھوڑا اڑاتا اور تلوار ہوا میں لہراتا اپنے لشکر
کے آگے آ کر بڑھ گیا۔

ہاکو خان نے بڑے غور سے اس جوان کو دیکھا۔ اس وقت اس نے یوسف کی آواز سنی جو چیخ کر کہہ
رہا تھا۔
بزدل غلو ہے کوئی تم میں ہمارا جو میرے مقابلے پر آئے۔

ہراول کے سردار بدو خان نے گھوڑا آگے بڑھایا۔ ہاکو خان نے مری جنش سے اس کو اجازت دی۔
گھانا بدو خان نیزہ ہوا میں لہراتا تیزی سے یوسف کی طرف چلا اور دُور ہی سے یوسف کا نشانہ لے کر نیزہ
چھینا۔

یوسف نے تیزی سے گھوڑے کو جنش دی۔ بدو خان کا دار خالی کیا اور وہ جو تک کھانا ہوا یوسف کے قریب
آ کر یوسف کے لیے پی ٹھہر گیا تھا۔ اس نے قدر سے جھک کر تلوار کا لایا تھا مگر بدو خان ڈھال بھی
مٹنے نہ سکا۔ یوسف کی تلوار اس کی پسلیں چیرتی ہوئی اس کے گرد گھومتی تھیں۔ بدو خان بھینے کی طرح ڈکراتا ہوا زمین سے
ٹپک گیا۔

رہا تھا۔ اس کے ہراول دستے طوفان اٹھاتے، آگ لگاتے اور سستیوں کو تھس تھس کرتے سب کی طرف بڑھ رہے تھے۔
اور وہ پیچھے پیچھے کچے مسلمانوں کو تہ تیغ کرتا ہوا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ ہاکو خان کی تعفانست طبع
دشمنی اور دشمنی کی قیامت خیز بیخار نے مسلمانوں کی ایشیائے کوچک میں محفوظ طاقت کا بھی خاتمہ کر دیا۔
اس نے اس قدر ظلم و بربریت کا مظاہرہ کیا کہ جس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔
مورخ ابن اثیر نے لکھا ہے:

”سمرکار و دواعلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سے لے کر

آج تک مسلمانوں پر کبھی ایسا بڑا وقت نہ آیا تھا۔“

مورخ کے اس بیان میں ہاکو خان کی بربریت اور ظلم و ستم کی صد ہا داستانیں پوشیدہ ہیں۔ ہاکو خان
اس گھناؤنے قتل عام میں انطاکیہ کے عیسائی ناٹ اور ان کے سردار ریمینٹ چارم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔
اور ارمینوں نے بھی کچھ ظلم نہ کیا۔ وہ اب تک برتائی خان کے تابع تھے مگر ہوا کارخ ہاکو خان کی طرف دیکھا
اس کے لشکر میں آگئے تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود جو شمس جہاد اور مردوشی کی داستانیں بھی جنم لے رہی تھیں۔ ہاکو خان کو تہ
پہلے مر پھر سے سابقہ پڑتا جس کی انفرادی ہر دوری پر وہ عش عش کر اٹھا لیکن ایک ملوثی شہزادہ
(یہ نام بعض یادداشت کے زور پر کھٹا گیا ہے۔ اگر غلط ہو تو براہ کرم درست فرما کر شکریہ کا موقع دیجیے) اس
دارو گیر اور محشر ستان ظلم و ستم میں جس ہمدردی اور جذبہ جہاد کا مظاہرہ کیا اسے تاریخ کبھی فراموش نہ کرے گی۔
یہ ناقابل فراموش واقعہ ایسا تھا کہ جس کا حال عیسائی مورخ بھی اپنی تاریخوں میں دینے پر مجبور ہو گئے
شہزادہ یوسف صاحبقرانی ملوثی پر دشمن کے جنوب میں انفرادی صلیبیوں سے برسرِ پیکار تھا۔ اسے جب
کی تباہی اور ہاکو خان کے دشمن کی طرف بڑھنے کی خبر ملی تو اس کی حیرت اسلامی نے جوش مارا اور شوق شہادت
پر سوار ہو گیا۔

اس نے اللہ اکبر کا نعرو بلند کیا اور صلیبیوں سے منہ موڑ کر گھوڑے کا رخ ہاکو خان کی طرف کر دیا۔
ساتھ پانچ ہزار جان باز سواروں کا دستہ تھا۔ سب ہی شوق شہادت کے نشہ میں چور تھے۔ آگے آگے یوسف
پیچھے پیچھے یوسف کے حاشا سزائیں مارتے دشمن کے اطراف میں پہنچ گئے۔
خام ہو رہی تھی کہ ہاکو خان نے سامنے گردوغبار کا طوفان اٹھتے دیکھا۔ اسے کان بڑا کہ مسلمانوں کا
آ رہا ہے۔ فوراً اپنے دستوں کو رکنے اور صف بندی کا حکم دیا۔

یوسف صاحبقرانی اپنے سواروں کے ساتھ گرد کا طوفان پیچھے چھوڑتا ہوا جواب نمودار ہوا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر بدلوخان کا دوسرا بھائی گھوڑا بڑھا کر یوسف کے مقابلے پر آیا۔ اس نے نیزے کے بھرنے
تو راستہ کی گلی میں یوسف اور اس کے گھوڑے کی پھرتی نے مغل سردار کی ایک بندھنے دی اور دونوں
اندر ہی وہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ جہنم میں پہنچ گیا۔

بدلوخان کے باپ بھائی تھے۔ ایک سے ایک ندرست، توانا اور مانا ہوا شمسوار اور شیرازہ
سب بھائیوں نے باری باری قسمت آزمائی کی اور اپنے بھائیوں کا بدلہ لینا چاہا لیکن اس کوشش میں سب
سب یکے بعد دیگرے اپنی جانیں گواہی دیتے۔

ہلوخان کو بددی کا یہ کہیں پسند نہ آیا۔ اس نے دھاک دھاک حکمران کے حکم دے دیا۔ مغل لشکر
مجاہدوں پر ٹوٹ پڑے۔ مجاہد بھی بھوکے تیروں کی طرح مغلوں پر حملہ کرنے لگے لیکن مغلوں کے شدید دباؤ
ان کی صفیں ٹوٹ گئیں۔ پانچ ہزار اور ڈیڑھ لاکھ کا کیا مقابلہ..... ایک ایک مجاہد کو پچاس پچاس مغلوں نے
گھیر لیا مگر وہ خنہ کے چھلاوے کی طرح بار بار ان کا گھیرا توڑ دیتے اور پھر نعرے لگاتے ان پر ٹوٹ پڑتے۔
ایک گھنٹہ کی خونریزی لڑائی کے بعد تمام مجاہدوں نے ایک ایک کر کے جاں شہادت نوش کیا۔ اب اس
یوسف صاحبقرانی تھا جسے دو سو مغل گھیرے ہوئے تھا اور ہلوخان کے حکم کے مطابق اسے زندہ گرفتار کرنے کا
کوشش کر رہے تھے۔ یوسف کے جسم کا کوئی حصہ اسے نہ تھا جس زخم نہ آیا ہو مگر اس کی تلوار اب بھی مغلوں کے
میں نہ رہی تھی۔ کتنے ہی مغل اس کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔

اور پھر ایک مغل نے پیچھے سے ناک کر لیا نیزہ مارا جو سیدھا یوسف کے شانے میں ٹک کر رہ گیا
کاٹا نہ ٹٹا اور ہاتھ بھول کر رہ گیا۔ یوسف نے تیزی سے تلوار دوسرے ہاتھ میں لے لی مگر اس وقت تک
نیزہ اس کے دوسرے شانے میں آویزاں ہو گیا۔ یوسف کے دونوں ہاتھ بیکار ہو گئے۔ اس نے پھر بھی گھوڑے
کو ایڑ دی اور گھوڑا اسے لے اڑا۔

یوسف نے ران کی جنبش سے گھوڑے کا رخ ہلوخان کی طرف کر دیا۔ ممکن ہے کہ یوسف ہلوخان کے
چٹھا دینا چاہتا ہو مگر مغل سوار اس کے اور ہلوخان کے درمیان حائل ہو گئے اور اسے نہیں کھڑکے گھوڑے سے
گرا دیا۔

مغل سوار، یوسف صاحبقرانی کو گھسیٹتے ہوئے ہلوخان کے سامنے لے گئے۔ یوسف زخموں سے جڑے
پڑا ہوا تھا۔

ہلوخان نے یوسف کے سینہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر حسبِ معمول وحشیانہ تعذیب لگایا اور کہا:
”تیری جان ہمارے قدموں کے نیچے ہے تو خواہش کرے تو ہم تجھے چھوڑ سکتے ہیں۔“

یوسف نے زہنی پڑے پڑے جواب دیا:
”اے شیطان! تو نے مسلمانوں کے دارالسلام کو آگ لگائی۔ یہ آگ قرآنِ ملک پہنچے گی اور تیری قوم
اس میں جہنم ہو کر رہ جائے گی۔“

ہلوخان نے ایک اور ہیبتناک فقرہ بلند کیا اور بولا:
”پلے تو اپنی فکر۔ ہم سے رحم کی بھیک مانگ..... ہم تجھے آزاد کر دیں گے۔“
”رحم کی بھیک.....“ یوسف صاحبقرانی نے وقار سے کہا:
”میں تیرے منہ پر تھوکتا ہوں۔“

اور یوسف صاحبقرانی نے واقعی زور سے تھوک دیا۔ اس کا تھوک سیدھا ہلوخان کے منہ پر جا کر
پل گیا۔
ہلوخان کو طیش آ گیا۔ اس نے پیر سے یوسف کا سینہ زور سے دبا دیا اور یوسف کی دو پسلیاں ٹوٹ کر
س کے گوشت میں گھس گئیں۔

مغلوں کے ہمدرد انگریز، بھارتی، فرانسیسی اور ایرانی مورخ سب اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ ظالم
ہلوخان نے یوسف صاحبقرانی کے جسم کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر یوسف کے منہ میں گھسیٹیں مگر یہ عیب
آخر وقت تک مسکراتا رہا۔ اور جب ایدادے دے کر اسے شہید کیا گیا تو زمین پر بستے ہوئے اس کے
فونے نے کئی رنگ بدلے۔

مرغِ خون کبھی سبز ہو جاتا تو کبھی زرد اور کبھی سفید۔
یوں معلوم ہوتا تھا کہ لکھنؤ کے ساتوں رنگ اس کا خون بن کر زمین پر بکھر گئے تھے۔
مغلوں نے اسے اپنے لیے بد شگون خیال کیا۔



مریم کی خدمت اور موعنی صورت نے اتابک کو اپنا گردیدہ کر لیا تھا۔ اتابک نے مریم کو کلمہ شریف سکھا
دیا تاکہ نازی بھی تھوڑی تعلیم دی تھی لیکن مریم ابھی باقاعدہ مسلمان نہیں ہوئی تھی۔

وہی پہنچ کر اتابک نے سب سے پہلے ہی کام کیا۔ وہ مریم کو جامع مسجد کے پیشِ امام کے پاس لے گیا
اسے مریم کے بارے میں مختصر طور پر پیشِ امام کو بتا دیا۔ پیشِ امام نے مریم کی مرضی معلوم کر کے اسے مشرق بہ

اسلام کیا۔ نام تبدیل کرنے کی ضرورت نہ تھی اس لیے کہ مریم کا نام اُس دور میں بھی مسلمانوں میں عام تھا۔
نے غامضتا میں مریم کے مسلمان ہونے کا اعلان کیا اور پھر تمام غازیوں کی موجودگی میں مریم اور جلال الدین
کا عقد کر دیا۔

شادی کی پہلی رات دونوں بیاں چوہی نے بڑے پیار اور مہنسی خوشی سے گزاری لیکن ان کی شادی
ابھی کچھ اور ٹھوکریں کھانا کھیں تھیں۔

صبح ہوتے ہی دمشق میں خبر پھیل گئی کہ ہلاکو خان کا لشکر مار مار کر تادمشقی کی طرف بڑھ چلا آ رہا ہے۔
بلکہ ریح گئی کسی کو کسی کی خبر نہ رہی۔ عجب نفسا نفسی کا عالم تھا۔

اتابک اور مریم نے ایک رات کی خوشی ہی کو غنیمت جانا اور وہ دوپہر کے وقت اپنے گھوڑوں پر
سامان لاد کر معر کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

①

ہلاکو خان نے قفقاز سے ہٹ کر جنوب کا رخ کیا تھا۔ اس کے توانوں نے حلب کا محاصرہ کر کے
کی جات مسجد کو آگ لگا دی۔

اتابک کی مہم روانگی کے تیسرے دن ہلاکو خان کا لشکر شام میں کاداکاٹ ہوا دمشق میں جا کھدو
واحد سے قتل ہلاکو خان نے دس سواروں پر مشتمل ایک وفد ترتیب دیا اور انھیں ایک فرمان لکھ کر دیا یہ
شاہِ معر کے نام تھا جس میں لکھا تھا:

”یہ اُس کا فرمان ہے جو ساری دنیا کا آقا ہے۔ اپنی فیصلیں
منہم کر دو۔ اور اطاعت قبول کر لو۔ اگر یہ بات مانو گے تو تمہیں
امن و چین سے رہنے دیا جائے گا لیکن اگر تم نے یہ بات نہ
مافی تو پھر جو پیش آئے ہیں پیش آئے گا اور ہم کیا جانیں کہ کب
پیش آئے گا۔ اس کا علم تو صرف جاودانی آسمان کو ہے۔“

یہ فرمان دے کر اس نے قاصد کو حکم دیا:
”آگ و طوفان کی طرح معر جاؤ اور باد و باران کی طرح جواب لے کر آؤ۔ رستے میں تاخیر نہ ہو۔
میں دو روز پس طے کرنا۔“

وفد کے سردار نے فرمان آکھوں سے لگا بار سر پر رکھا۔ پھر احتیاط سے کپڑے میں پلیٹ کر زین کے
تار بند میں رکھ دیا اور سلام کر کے معر کی طرف کوچ کیا۔

پھر ہلاکو خان دمشق کو تہ و بالا کرتا ہوا یر و شتم پہنچا۔ یر و شتم پر مسلمان قابض تھے۔ وہ شکست کھا کر
پچھ ہٹ گئے اور اس پر بھی ہلاکو خان کا قبضہ ہو گیا۔

اب اسے معر کے جواب کا انتظار کرنا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اگر معر پر قبضہ ہو گیا تو وہ مشرقی قریب کا مالک بن جائے گا۔ اس کے بیٹے ایل خان،
باسوں کے تباہ شدہ علاقوں کے مالک بنیں گے۔ بحرِ روم کے کنارے وہ عشرت کے تعمیر کرائیں گے۔

اس کا خواب بڑا سنا تھا مگر تمام اسہلے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا کرتے۔

دمشق، مغلوں کے گھیرے میں آچکا تھا مغل سوار اور پیادے بڑی تیزی سے چاندن طرف پھیل رہے
فہ اتابک کو اس کا علم تھا اسی لیے وہ تیزی مگر احتیاط کے ساتھ اس خطرے سے نکل جانے کی کوشش میں تھا اس

مریم کو تھوڑی بہت شش زنی کی تعلیم دے دیا تھا کہ بوقتِ ضرورت وہ کم از کم اپنی حفاظت کر سکے۔

اتابک اور مریم دوپہر سے اب تک تیر رفتاری سے سفر کرتے رہے تھے۔ شام تک دمشق سے کافی دور نکل
نے سائبک نے یہ خیال کر کے کہ اب وہ خطرے سے باہر آ گیا ہے ایک دیہانے میں گھوڑا روک لیا۔ انھوں نے

بدلیا کہ وہ رات اسی دیہانے میں گزاریں گے اور صبح دم تازہ دم ہو کر پھر سفر شروع کریں گے۔

اتابک اور مریم ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے گری نیند سو رہے تھے کہ گھوڑوں کے بھاگنے
کا دوازیں بلند ہوئیں۔ وہ دونوں گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔

ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہی مشکل بدوار سواران کے سر پر پہنچ گئے۔ اتابک کو
نہیں پہچانتے میں دیر نہ لگی۔ یہ مغل سوار تھے۔ ہلاکو خان کے سوار۔

اتابک نے فوراً تلوار کھینچی لی۔ مرم پہلے ہی خود کو مسلح کر چکی تھی۔ مغل سواران کے قریب آ کر رک گئے مگر
بے درجہ جارحانہ کے بدلے دوستانہ تقابلی کار و بار گھوڑے سے اتر کر اتابک کے پاس آئے۔ اس نے تلوار نکالی
نہیں مغل نے بھی تلوار بلند نہ کی۔

اتابک کے قریب پہنچ کر سردار نے زمی سے کہا:
”اے جوان! تلوار پیچ کرے۔ ہم تیری طرف دوستی کا ہاتھ بٹھاتے ہیں۔“
مغل اور دوستی....
اتابک کا وہیں قبول نہ کرتا تھا پھر اس نے تلوار جھکائی۔

ہمارے دوست بن جاؤ اور پہلی مدد کرو۔ ہم تمہیں اور تمہارے خاندان کو امان دیں گے، مغل اور زیادہ نری اختیار کرتے ہوئے آتا ہے تاکہ کو مخاطب کیا۔

آتا ہے کہ نظر گھا کر مریم کو دیکھا۔ جیسا کہ مریم کی مرضی معلوم کرنا چاہتا ہو۔ مریم کے ہاتھ میں تلواریں تھیں کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ مریم نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔
”ہم سے کس طرح کی مدد چاہتے ہو؟“ آتا ہے پر وفار انداز میں سوال کیا۔ مریم اس کے پس آکر کھڑی ہو گئی۔

”ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ ہمیں راستے پر ڈال دو۔“ مردار نے اپنا مطلب بیان کیا۔

آتا ہے نے مشکوک نظروں سے مغل کو دیکھا بھڑک بھڑکا:

”تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں جانا چاہتے ہو؟“

مردار پیسے کچھ بچکا یا۔ پھر بولا:

”ہمیں شاہ مہر کو ہا کو خان کا ایک اجم فراں پہنانا ہے۔ ہم ہا کو کے وفد کے سوار ہیں۔“

”تم یہاں تک کیسے پہنچے۔ کسی نے روکا نہیں۔“ آتا ہے نے تعجب سے پوچھا۔

مغل مردار نے اپنے سفید سفید دانت نکالے اور بولا:

”تمہارے لوگ تو ہمیں دیکھ کر ہی جاکھڑے ہوتے ہیں۔ تم واحد آدمی ہو جس نے ہمارے سامنے

اٹھائی ہے۔ ہم وفد کے آدمی ہیں ہم کسی سے لڑ نہیں سکتے۔“

آتا ہے کو اطمینان ہو گیا۔ اس نے کہا:

”تمہارے دوستی کی دعوت دی ہے اس لیے ہم بھی تمہارے اس وقت تک دوست ہیں جب

تمہاری طرف سے دوستی کے خلاف کوئی کاروائی کا گمان نہیں ہوتا۔“

”لیکن ہم نے تو تم سے معرکہ نہ لاراستہ پوچھا ہے۔ اس کا تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔“

بے چینی سے کہا۔

آتا ہے مسکرا کر بولا:

”اس وقت تم لوگ اطمینان سے سو جاؤ۔ تم نے ہمیں دوست کہا ہے۔ ہم تمہیں صرف راستہ

بتائیں گے بلکہ معرکہ دلاؤں گا۔ قہرہ کی دیواریں تک تمہارا ساتھ دیں گے۔“

مغل مردار خوش ہو گیا۔ تمام مغل سوار، آتا ہے اور مریم سے تھوڑے فاصلے پر جا کر کھڑے ہوئے۔

بھر کرنے کا انتظام کرنے لگے۔

بچ بچوں کی آنکھ کھلی تو انہوں نے آتا ہے کو چلنے کے لیے بالکل تیار پایا۔ مغل سوار بھی تیار ہو کر کھڑے ہوئے۔

آتا ہے نے کھڑے کو ایڑ دیتے ہوئے مردار سے کہا:

”بچے آدمیوں کے کہو کہ نیزوں پر سفید پھر رہے (جھنڈے چڑھالیں تاکہ ان پر کوئی حملہ آور نہ ہو)۔“

مردار نے جھنڈے سے جواب دیا:

”تمہارے آدمی تو ہماری صورت ہی دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے ہیں وہ ہم پر حملہ کی جرأت کیسے کر سکتے ہیں۔“

معرز مغل مردار آتا ہے سے بولا:

”تم نے مہمانوں کی غائبہ جنگی اور مخاد پرستوں کی غدار سے فائدہ اٹھا کر مشرق اور شمال کے تمام علاقوں پر

بیلہ ہے۔ اگر مسلمان متحد ہوتے تو نہ بغداد تباہ ہوتا اور نہ حلب کی مسجدیں ویران کی جاتیں سیکن یا درکھو

اس معرکہ میں پر قدم رکھنے والے ہیں جہاں موت کے قدم بھی چلنے لگتے ہیں۔ اب وہ علاقہ مٹا دیا ہونے

ہم کا محافظ رکن الدین، میر بس بند قرار ہے۔“

مردار کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے کہا:

”تمہارا اشارہ میر بس کا انداز کی طرف تو نہیں ہے۔“

”اے۔ میر بس بند قرار۔“ آتا ہے نے غصے سے کہا:

”جی کا شکہ پورے عمر میں چلتا ہے۔ میر بس مردوں کا محافظ اور معریوں کے دلوں کا مالک ہے۔“

”لیکن ہم نے تو سننا ہے کہ میر بس ایک ساتھ تین حکام ہیں۔“ مردار نے آتا ہے کے کھڑے سے گھوڑا ملاتے

کہا۔

”ایم آتا ہے کے بائیں جانب راسوں سے راسیں ملنے، بڑے بہرانہ انداز میں گھڑ سواری کر رہی تھی۔“

آتا ہے اس کی بات پر ہنسنے لگا۔ اس نے کہا:

”یہ بیان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں اور تم ایک ملک میں تین تین بادشاہوں کو مالک سمجھتے ہو یہ بھی

مغل کے دلوں کی بات ہے۔ یہ سب اُن عیسائی راہبوں اور پاروں کا غلط پروپیگنڈہ ہے جو مغل درباروں میں جا

تے ہیں۔ محض پر ملک مظہر ضیف الدین خوارزمی کا قبضہ ہے لیکن اصل طاقت رکن الدین میر بس کے ہاتھ میں

ہوئی ہے۔ دلوں کا وہی شہزادہ ہے۔“

نورالاشترادہ بالف لیلہ کا شہزادہ۔“ مردار نے تسخارہ انداز میں کہا:

”مغلوں میں تو یہی مشہور ہے کہ میر بس کا انداز کا ایک بادشاہ ہے جو الف لیلہ کا شہزادہ

کہلاتا ہے۔

”اے لیلہ! شہزادہ نہیں بلکہ جادو کا شہزادہ کہو۔“ انا بک نے غریہ لہجہ میں کہا:

”اس کے قہقہے میں مافوق الفطرت طاقتیں ہیں۔ اسے لوگوں نے صبح کو مصر میں دیکھا تو شام کو

گھونٹا ہوا پایا۔ کیا خبر کہ وہ اس وقت ہا کو خان کے خیمہ میں جھانک رہا ہو۔“

مغلوں کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ سردار نے تعجب سے پوچھا:

”کیا یہ برس واقعی پر اسرار طاقتوں کا ملک ہے۔“

”اس کا ثبوت تو تمہیں مصر پہنچ کر ہی مل سکتا ہے۔“

یہ کہہ کر انا بک نے گھوڑا تیز کر دیا۔ وہ جلد از جلد مصر پہنچ کر مغلوں کی تباہیوں اور ان کے ارادوں

حکومتِ مصر کو آگاہ کرنا چاہتا تھا۔



یہ لوگ صحرائے سینا کے مہرے پر پہنچے تو انہوں نے دہاں معری فوجوں کو مورچہ بند پایا۔ سرحد کے ما

معری فوج خیمے ڈالے بڑی تھی۔

مغل وفد کے سفید پیر برے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ سفید پیر برے امن و دوستی کی علامت ہو

اس لیے معری فوج نے ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔ اور سرحد میں داخل ہونے کی اجازت دیدی۔

یہ لوگ معری مورچوں سے گزر رہے تھے کہ ایک ہلکا ترنگا سوار ان کے قریب آیا۔ اس نے پہلے

پھر انا بک اور مریم کو نور سے دیکھا اور آہستہ آہستہ وفد کے سردار کے قریب آکر بولا:

”ہا کو خان کا فرمان ملے ہو؟“

لیجے آدی نے مغل سردار سے یہ سوال خالص قراقرم کی مغل زبان میں کیا تھا۔ مغلوں کو اس پر بڑی حیرت

وفد کے قائد نے اپنی زبان میں جواب دیا:

”ہاں۔ ہم دنیا کے خاقان کا فرمان لائے ہیں مگر تم نے یہ کیسے جانا؟“

لیجے آدی مسکرایا اور بولا:

”تم فرمان کھول کر دیکھو۔“

”کیوں؟“ وفد کے قائد نے جرح کی۔

میں قیدی بناؤں کہ فرمان میں کیا لکھا ہے؟“ لیجے آدی نے منہ کر کہا۔

”گرتے جاتے ہو تو بتاؤ کہ فرمان میں کیا لکھا ہے۔ مجھے فرمان زبانی یاد ہے۔“ وفد کا قائد کچھ جڑ کر بولا۔

لیجے آدی نے ایک لمبے ذہن پر زور دیا۔ پھر بولا:

”چھانو۔ ہا کو خان کا فرمان کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے:

”یہ اس کا فرمان ہے جو ساری دنیا کا آقا ہے۔ اپنی

فصلیں منہم کر دو اور اطاعت قبول کر لو۔ اگر یہ بات مانو گے

تو تمہیں امن و چین سے رہنے دیا جائے گا لیکن اگر تم نے یہ

بات نہ مانی تو پھر جو پیش آنا ہے، پیش آئے گا اور ہم کی

جانیں، کیا پیش آئے گا۔ اس کا علم تو صرف جادوئی آسمان

کو ہے۔“

مغل سردار حیرت سے منہ کھولے فرمان کے الفاظ سن رہے تھے جس کا ایک ایک لفظ فرمان کے مطابق تھا

انہوں نے فرمان اپنی زبان میں دہرا کر گھوڑا موڑا اور آہستہ آہستہ واپس ہوا۔

وفد کے قائد نے انا بک سے پوچھا:

”یہ کون شخص ہے۔ اس نے ہا کو خان کا پیغام کیسے پڑھ لیا؟“

انا بک نے کچھ کہنا چاہا کہ لیجے آدی گھوڑا موڑ کر پھر ان کے پاس آگیا اس نے وفد کے قائد کے

پے پر اپنا ہاتھ رکھ کر دیا اور کہا:

”حیران نہ ہو مغل پیر بھائیو! جس وقت یہ فرمان لکھا جا رہا تھا میں دشمن کے ایک مولیٰ کے لباس میں

ہاتھ کے سامنے ہاتھ باندھے گھڑا تھا۔“

لیجے آدی نے پھر گھوڑا موڑا اور اس بار وہ تیزی سے گھوڑا بھگاتا ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

”اے لیلہ! شہزادہ۔۔۔۔۔“ مغل قائد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”اے لیلہ! شہزادہ محمود کن الدین پیرس بندہ قدرا سپہ سالار افواج مہولت مصر۔“ انا بک نے جھک کر کہا۔



مذہب کی سبکیں بھری آواز نا بھری:

مذہب جاؤ مسجد میں بابا۔ میں تمہیں نہیں جلنے دوں گا۔

مذہب مجھے چھوڑ دو۔ بوڑھا کر جا۔

پتہ نہیں اس میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی۔ کہاں تو اس کی سانس اکھڑ رہی تھی اور کہاں اب اس کی آوازیں جو انویں
مبارک راہن تھا۔ مزلہ نے گھر کر اس کے پیچھے چھوڑ دیے۔

بوڑھے کو فوراً احساس ہوا کہ اس نے بڑا سخت لہجہ اختیار کیا ہے۔ اس نے فوراً مزلہ کے سر پر محبت سے ہاتھ

پھرتے ہوئے پیار سے کہا:

”بیٹی میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ مجھے بھی تم سے عید ہی جیسی محبت ہے لیکن میں مجبور ہوں کچھ

کہوں۔ آج بیت المقدس میں اذان کی آواز ضرور بلند ہوگی۔“

مزلہ نے عاجزی سے کہا:

”بابا۔ میں تمہیں اذان سے روک کر گنہگار نہیں ہونا چاہتی لیکن جس خدا نے اذان کا حکم دیا ہے اس نے خود کشتی

میں رکھ رکھا ہے۔ بغل درندہ سے بھڑک پھلے ہوئے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی بوسہ گھتے پھرتے ہیں۔ مسجد سے اذان

کا آواز بلند ہوتے ہی قیامت آجائے گی اور پھر.....“

اور پھر وہی ہو گا جو قیمت میں کھو دیا گیا ہے۔ بابا نے مزلہ کی بات کھٹ دی:

”مزلہ۔ آج ۲۷ رجب ہے۔ شبِ معراج۔ وہ دیکھو مسجد اقصیٰ کے میناروں پر روشنی نو دار ہو گئی یہی

اور بھی تمہیں اس روشنی میں عرض سے اترنے والے فرشتے دیکھ رہی ہیں۔ جانتی ہو؟ یہ تاجدارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

آپ رحمت کے استقبال کے لیے آ رہے ہیں اور وہ جنوب میں مدینہ منورہ مجھے صاف نظر آ رہے ہیں۔ ہاں ہاں۔ مسجد نبویؐ

سے ایک نور کا لہلہ بلند ہوا۔ اس لہلے میں مجھے وہ رف رف سوار بھی نظر آ رہے ہیں جو مسجد کے برابر صحرایں چٹان پر

نہل کی امانت فرمائیں گے۔ پھر میں اذان کیوں نہ دوں۔ اگر آج بیت المقدس کی تاریک فضاؤں میں اذان کی آواز

مذہب کی آواز ہو تو یہ سوار کیسے واپس نہ چلی جائے۔ بیت المقدس کی اس سے بڑی اور کیا قسم تھی کیا ہوگی کہ سرکارِ دو عالم

صلی اللہ علیہ وسلم و سلم تشریف لائیں اور یہاں سے اذان کی آواز بھی نہ ابھرے۔ بیٹی میں اذان ضرور دوں گا۔“

بوڑھا خندت جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔

پھر۔۔۔ اس کے پیروں میں حرکت ہوئی اور وہ تیزی سے صحن مسجد کو بھوک کر کے اذان کے چبوترے پر

پہنچا۔

مزلہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکی۔ اس کی نظریں جنوب میں مدینہ منورہ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ شاید سے بھی

⑥

ہلاکو کا زوال

۰

مسجد اقصیٰ سیلہ ماتی لباس پہنے مسلمانوں کی بے بسی پر آنسو بہا رہی تھی اور قبیلہ اول کی آبادی کا
مغلوں کی یلغار سے قبرستان میں تبدیل ہو چکی تھی۔ کسی کسی مکان سے دھواں اٹھ کر فضا کی تاریکی کو اور گہرا کر
ہر طرف ہو گا عالم تھا۔

ایک دیر ان لگی سے ایک بوڑھا کرتا پڑتا اور اٹھ کھڑا ہوا نکلا۔ اس کے آہستہ قدم محلے کی چھٹیوں
طرف اٹھ رہے تھے۔ شاید بوڑھے کو مسجد پہنچنے کی جلدی تھی لیکن بیری کا ضعف سیراہ تھا۔ وہ ہر قدم
اور پلٹ کر دیکھتا جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو۔

کسی نہ کسی طرح وہ مسجد کی سیڑھیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اس کی جسمانی طاقت تقریباً
گئی اور وہ پہلی سیڑھی پر تھک کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر سنسنے کے بعد وہ ہمت کہہ کے پھر اٹھا اور دوسری سیڑھی پر ہند کر کھاتہ معائنہ
ہوا جیسے کوئی اس کی ٹانگوں سے پلٹ گیا ہو۔ وہ بیٹھ گیا۔ اور اٹھ بڑھا کر پیر کی پٹنے والے کو ٹھکانا۔ انا
ایک انسانی سر۔ سے ٹکرایا۔

یہ مزلہ تھی۔

اس کے بیٹے عید کی ہونے والی ہوئی۔

بوڑھے نے لرزتی آوازیں کہا:

”چھوڑ دو مزلہ۔ مسجد مجھے پکار رہی ہے۔ مت روکو مجھے۔“

عجب عالم اور عجب عرش نشین کی پرواز کرتی سواری نظر آرہی تھی۔

"انداکبر" کی گونج بروٹھم کی چھائی ہوئی تاریکی اور سکوت کا سینہ چیرتی بلند ہوئی منزلہ نے چلنے کو نہ مہر پر کھینچا۔

بروٹھم کی خاموش گلیاں مغل سواروں سے بھر گئیں۔ منزلہ گھوڑوں کے جھانکے کی آواز سن کر ایک طرف ہل کر کھڑی ہو گئی۔ سواروں کا رخ مسجد کی طرف تھا۔

اس اذان میں ہلکا ہلکا اور رس نفا۔ مغل سوار متعلیٰ لیے مسجد کی سیڑھیوں تک پہنچ گئے۔ اذان ہونے چارکانیں بلند ہوئیں۔ تیر جوڑے گئے اور آواز کے رخ پر ایک ساتھ چھوڑے گئے۔
مؤذن کی "ضرب لا الہ" ہونٹوں میں دب کر رہ گئی اور وہ لڑکھڑاکر گر پڑا۔

"باب" ! انتہائی ضبط کے باوجود منزلہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا اور تمام مغل سوار شعیب لہانہ آواز کی محنت گھوم پڑے۔

اسی وقت مسجد کی پشت کی طرف سے ایک سایہ لہرایا۔ سایہ ایک اونچی جگہ چڑھ گیا اور جھانک کر دیکھا۔ میڑھوں سے کچھ دور منزلہ کی تھمرا شاید آخری بار تھکی۔ پھر بند رہے۔ میں گندی ایک ساتھ اس پر گریں اور وہ گندوں الجھ کر رہ گئی۔ اب وہ مغلوں کے قبضے میں تھی۔

یہ سب کچھ چمکے میں ہو گیا۔ سایہ کچھ بھی نہ کر سکا لیکن جب مغل منزلہ کو گھسیٹے ہوئے لے چلے تو بے چینی ہو گیا۔ اس نے میان پر ہلکا ہلکا ڈال کر تھمرا نکالی اور چاہا کہ "انداکبر" کا نعرہ لگا کر مغلوں پر ٹوٹ پڑے۔

کے دل نے آواز دی:
"کیا کرتا ہے عبید۔ تیرے باپ نے تو راہ حق پر جان دی ہے اور تو منزلہ پر قربان ہو رہا ہے۔ تجھے تو نے ظلم کا بدلہ لیا ہے۔ تجھے منزلہ کو پھانسا ہے۔ ہوش سے کام لے۔"

یہ سوچ کر اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔



۱۷۵۹ء کی گرمیوں میں ہلاکو خان نے قفقاز سے ہٹ کر جنوب کا رخ کیا۔ بدھ جھڑے ہلاکو خان کے دستہ گزرتے مسجدوں کو آگ لگا دی باقی اور دھوئیں کے بادل بلند ہوتے لیکن کلیساؤں کو کوئی ہتھ نہ لگا۔ بدھوں کی سابقہ سوتیلی ماں اور موجودہ بیوی دو قوز خاتون جو ستوری عیسائی مذہب اختیار کر چکی تھیں، مذکر کے کلیسا

میں بچاؤ جس کی آواز سے ارمی لوگ بہت خوش ہوتے۔ ادنیٰ و اعلیٰ عیسائی بھڑکدہ کپڑے پہن کر گھومتے۔ بدھاتے بڑوں پر نکل آتے اور ہلاکو کے فوجی دستوں پر چھوٹوں کی بارش کرتے۔ مسلمانوں کو نہ تو مذہبی آزادی تھی اور نہ آواز اٹھانے کا حق تھا۔ ان کی بستیاں برباد کر کے آگ لگا دی جاتی تھیں۔

مسلمانوں کے مقابلے میں مغلوں کو اپنا بھلا وادی اور بیسی مدد سمجھ کر ہلاکو کے گرد عیسائی ارمی جیکو ہاٹ کے علاوہ صلیبی ٹاٹ بھی جمع ہو گئے تھے۔

ہلاکو خان انہیں دیکھ کر پُر مسرت انداز میں فتنہ لگاتا اور کہتا:

"تیرے لیے دیکھا کہ میرے نصیب کھل جائیں؟"

اور اس کے نصیب واقعی کھل گئے۔

سمرقند کی حسین وادی اور بے حد عہد کے کنارے دارالعلوم بغداد کے باغات اور عروس ابلاد و مشرق پر اس کا قبضہ ہو چکا تھا اور اب اس کے نیچے ذریں بروٹھم میں نصیب تھے۔ اس نے اپنے ایل خانی خاندان کے لیے میند ڈال دی تھی۔ ریگستان کے ایک ڈرا سے ٹکڑے کو پار کرنے کے بعد میند منزلوں کے فلسفے پر دریائے نیل کے کنارے قاہرہ کا شہر تھا۔ اس نے سوچا اگر قاہرہ پر قبضہ ہو جائے تو وہ مشرق قریب کا مالک بن جائے گا۔ اس کے بیٹے ایل خان عیسائیوں کے نیست و نابود علاقوں کے مالک بنیں گے۔ بحیرہ روم کے نیلے پانی کے کنارے وہ شہر تھے کہ بنوائیں گے لیکن اس کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا کیونکہ چنگیزی دستور ایسا میں قدرت کی سخت گرفت کا کہیں تذکرہ نہیں۔

منزلہ کو گرفتار کرنے کے بعد مغلوں نے اسے گھوڑا پیش کیا مگر اس نے انکار کر دیا۔ کش کش کے دوران منزلہ نے سر کا رد مال کھل گیا اور اس کے بال کھر گئے۔ اس کا چہرہ پیسے ہی بے نقاب تھا اور مشعلوں کی روشنی میں پانڈکی طرح دھک رہا تھا۔

پچاس سواروں کے مغل دستے کا سردار ایک انتہائی کربیمہ المنظر مغل تھا۔ اس نے منزلہ کو جوانا حسین پایا تو اس کا دل چل گیا۔ پہلے تو اس کا خیال تھا کہ اس خود سر لڑکی کو وہ ہلاکو خان کے سامنے پیش کرے گا کیونکہ ہلاکو خان کا یہ حکم تھا کہ ہر جوان اور حسین لڑکی کو اس کی امانت سمجھ کر حفاظت اس کے پاس پہنچایا جائے۔

سردار کی نیت خواب ہوئی تو اس نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ اس کے ساتھی اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے اور عبید یہ ہوا کہ اس لڑکی کو بھانے ہلاکو خان کے حوالے کرنے کے اس سردار کے لیے مخصوص اور محفوظ کر دیا جائے۔

اس فیصلے کا یہ نتیجہ یہ ہوا کہ منزلہ کو ہلاکو خان کے سامنے پیش کرنے کے بجائے بڑے پوشیدہ طریقے سے

مردار کے خیمے کی طرف لے جایا گیا۔

وہ منزلہ کو لے کر خیموں کے درمیان سے نہیں گزرے بلکہ خیموں کی تختیوں سے ڈرا ہٹ کر پہلے بہرہ دار کے خیمے پر پہنچے۔ ایک پہرے دار پہلے ہی موجود تھا۔ منزلہ کو خیمے میں دھکیل کر دو اور پہرے داروں کے پاس لے گئے۔ دستے کا مردار بدستور خیمے میں گشت کرتا رہا۔ نصف شب کے بعد اسے اپنے خیمے پر واپس آنا تھا۔ اس نے اپنی اوجھڑات تک ہوتی تھی۔

منزلہ کو خیمے کے اندر دھکا دے کر پھینکا گیا تھا اس لیے وہ منزلہ کے بل گری۔ اگر فرش نرم نہ ہوتا تو اسے منزلہ چوٹ لگتی۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف رسیوں سے مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے زور لگا کر باؤ کھولنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہاتھوں اور گردن کے گرد رسیوں کے اتنے بل پڑے تھے کہ وہ ہاتھ کھولنا تو درکنار انہیں ہل بھی نہ سکتی تھی۔

خیمے میں بالکل تاریکی تھی۔ وہاں صرف اس وقت ڈراما روشنی ہو جاتی جب ہوا کا کوئی تیز جھونکا شے پرہہ ہلا دیتا۔ اس نے پردے کی درز سے جھانک کر دیکھا۔ ایک پہرے دار اناؤڈ کے پاس بیٹھا تھا اور اس کی نظریں خیمے کے پردے کی طرف لگی تھیں۔ اسے دو مردار پہرے دار نظر نہ آیا۔

وہ خیمے کے کپڑے کے ساتھ ساتھ اندر ہی اندر خیمے کے دوسری طرف گئی۔ اس طرف اسے محسوس ہوا جیسے کوئی آدمی پچھلے قدموں سے ٹھل۔ ہا ہے جیسے وہ دس بارہ قدم جاتا ہے پھر خیمے کے پاس واپس آ جاتا ہے۔

منزلہ کو کھڑے ہونے میں تکلیف ہو رہی تھی اس لیے وہ بیٹھ گئی لیکن بیٹھنے میں بھی اسے آرام نہ ملا۔ وہ بچ کھڑے ہو کر نکلنے لگی۔ اب اس نے پیروں سے خیمے کا جائزہ لینا شروع کیا۔

بیچ خیمے میں ایک چھوٹا سا قبا میں بیٹھا تھا۔ اس نے پیروں سے ٹوٹا تو اسے معلوم ہوا کہ خیمے کے پردے کو ایک ایک بالشت کے نالے پر باہر کی طرف کسی چیز سے اس طرح دبایا گیا ہے کہ کپڑے تازہ مین کے ساتھ جک کر رہ گیا ہے اور اس میں سے پیر بھی باہر نہیں نکالا جاسکتا۔ اس پر بڑی مایوسی طاری ہوئی۔ باہر نکلنے کی کوئی صورت نظر آتی تھی اور اب مردار کے واپس آنے کا وقت ہو رہا تھا۔

لیکن جب قدرت کو کسی کی حفاظت منظور ہوتی ہے تو وہ اس کے سامان پیدا کر دیتی ہے۔ عبید نے منزلہ کو گرفتار ہوتے دیکھ کر پہلے مغل سپاہیوں پر حملہ آور ہونے کا قصد کیا تھا لیکن پھر اس کی عقل نے اس حماقت سے باز رکھا۔ اگر وہ عقلی سے مغلوں پر حملہ کر دیتا تو سوائے جان گوانے کے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ جب مغل سوار منزلہ کو لے کر لشکر کی طرف چلے تو وہ ان کے پیچھے ہو گیا۔

چاند کی آخری تدبیریں تھیں اور آسمان ابرا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے علاوہ عبید، یروشلم کے گلی کوچوں اور مرکز سے بخون واقف تھا۔ اس لیے اسے تعاقب کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آئی۔ رات کی تاریکی اس کا پوری طرح ساتھ دے رہی تھی۔

آبادی کو پار کر کے جب سوار میدان میں پہنچے تو بھی اس نے تعاقب جاری رکھا اور انہیں نظروں میں رکھے دو دور چلتا رہا۔ یہاں تک کہ منزلہ کو مردار کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔

مردار کا یہ خیمہ دوسری قطار میں تھا۔ خیمے کے سامنے ایک پہرے دار موجود تھا اور دوسرا پہرے دار پشت کی طرف گشت کر رہا تھا۔

عبید دو رکھڑ بڑی دیر تک منصوبے اور ٹیکس بناتا رہا مگر جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی گھبراہٹ بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ مردار کی واپسی کا وقت ہو رہا تھا اور اس کے واپس آنے کے بعد مردار کی رہائی ناممکن ہو جاتی تھی۔ آخر عبید نے ایک بڑا عجیب اور دلیرانہ فیصلہ کیا۔ وہ زمین پر لیٹ گیا۔ اندھیرا اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تھا۔ ایک بار جب پشت کا پہرے دار گشت کرتا ہوا خیمے سے دور جانے لگا تو اس نے بسم اللہ کہہ کر پٹیل کھانی شروع کر دیں۔ اس طرح وہ زمین پر لٹھکتا ہوا خیمے کے قریب پہنچ گیا کسی پہرے دار کی اس پر نظر نہ پڑ سکا۔

عبید نے جلدی سے خیمہ نکالا اور خیمے کے کپڑے کو دائیں سے بائیں اس طرح کاٹ دیا کہ وہ کافی سے اس میں داخل ہو سکتا تھا۔ کپڑا بڑا مضبوط تھا لیکن وہ خیمے کی تیزی کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اگر خیمہ کھل کا بھی ہوتا تو وہ کٹ جاتا۔

کپڑے کے کٹنے کی ہلکی سی آواز پیدا ہوئی جس سے منزلہ چونکنا ہو گئی۔ وہ زمین پر چپٹ پڑی تھی۔ اس آواز پر وہ کوٹ کے بل ہو کر آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ پھر اسے محسوس ہوا جیسے کوئی کالی سی شے اندر آ رہی ہے۔ منزلہ کما جیٹھی جس چھڑکی اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ شاید نہیں ہے۔ اسی وقت اس کے کان میں ہلکی سی آواز آئی:

”منزلہ.... منزلہ“

منزلہ جلدی سے وہاں پہنچ گئی۔

عبید خیمے کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ منزلہ کا دل خوشی سے ملیں اچھل رہا تھا۔ عبید نے خیمے سے اس کی رسیاں کاٹیں اور منزلہ کو باہر نکلنے کو کہا۔

منزلہ تیزی سے سوراخ کی طرف بڑھی لیکن وہ ابھی سوراخ میں داخل بھی نہ ہو پائی تھی کہ خیمے کا پہرے دار تیزی سے اندر داخل ہوا۔ عبید کے ہاتھ میں کھلا ہوا خیمہ تھا۔ اس نے ایک ٹکڑے بھی ضائع کیے بغیر خیمہ پہرے دار کے سینے

میں اتار دیا۔ پہرے دار بہت قوی ہیکل تھا۔ اس نے زخم کھانے کے باوجود عبید کو دبوچنے کی کوشش کی اور اسے پٹ لیا۔ عبید نے موقع کی نزاکت کے تحت اس پر دوسرا وار کر دیا۔ اس دار سے پہرے دار کے ہاتھ پر ٹھیسے ہونے لگے مگر اس کی ایک بیچھی نکل گئی۔

عبید خود کو اس کی گرفت سے آزاد کر کے اٹھ کھڑا ملا لیکن اس وقت تک بیچھی من کر دوسرا پہرے دار خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر آ گیا تھا۔

عبید نے پٹ کر سوراخ کی طرف دیکھا مزلہ پسے ہی باہر نکل چکی تھی۔ عبید نے بجلتے پہرے دار سے الجھنے کے سوراخ میں سر ڈالا اور گھسٹ کر باہر نکل گیا۔

پہرے دار نے بھی اس سوراخ سے باہر آنے کی کوشش کی مگر اس کا بھدی بھر کم جسم اس میں الجھ گیا۔ پھر وہ خیمے کے دروازے کی طرف آیا اور چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اس وقت تک عبید خیموں کی قطاریں دائیں بائیں پھاڑتا کافی دور نکل چکا تھا۔

عبید خیموں سے کافی دور پہنچ چکا تھا

جب اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ خطرے سے باہر ہے تو وہ ایک جگہ ٹھہر گیا۔ اب اسے مزلہ کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ مزلہ خیموں سے بھٹا غلت، باہر آچکا ہے لیکن اب وہ کہاں ہے؟ یہ سوچ سوچ کر اس کی پریشانی بڑھنے لگی۔

اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس اندھیری اور پرہیزگارت میں وہ اسے کہاں تلاش کرے۔ قدم قدم پر خطہ ہر لحظہ کپڑے جلانے کا درد کلازہ جاتے رفتن نہ پائے ماندن۔ وہ عجیب کش مکش میں مبتلا تھا۔ کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ مزلہ اس کے بالکل قریب کھڑی ہے لیکن وہ اسے پرکار کر بلا بھی تو نہ سکتا تھا۔

وہ انھی الجھنوں میں گرفتار تھا کہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز بلند ہوئی۔

وہ بھال کر ایک گھنے پیڑ کے پیچھے چھپ گیا۔

گھوڑا دوڑانے والا سوار تیزی سے اس کے پاس سے نکل کر خیموں کی طرف چلا گیا۔ عبید، اندھیرے میں اس کی شکل تو نہ دیکھ سکا لیکن اس نے اس کے قدم و قامت سے اندازہ لگا لیا کہ یہ وہی منی مردار ہے جس کے خیمے سے اس نے مزلہ کو آزاد کرایا تھا۔

اس جگہ کھڑے ہو کر مزلہ کا انتظار کرنے لگا۔ اس لیے اس نے اُس مسجد کا رخ کیا جہاں اس کا والد شہید ہوا تھا۔

وہ ایک مہوہم امید سینے سے لگائے مسجد میں داخل ہوا لیکن مسجد خالی تھی اور بوڑھے موزن کی لاش اب تک

ادان کے چوتھے پر پڑی تھی۔

خون کی شدت جھج جائے تو انسان میں بے خوفی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حال عبید کا تھا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں بیت المقدس اور وہاں کے بایسوں پر جو کچھ گزری تھی اس نے عبید کو حیات و موت کے بہت سے فلسفوں سے آشنا کر دیا تھا۔ خود اس پر ایک قیامت پھر کئی قیامتیں گزر گئی تھیں۔

مزلہ کا حقیقی شہر کے ایک اوسط درجے کے گھرانے سے تھا۔ اس کے دو چھوٹے بھائی، دو بہنیں اور ماں باپ۔۔۔۔۔ سب کے سب اس کے حملے شہید کیے گئے۔ مزلہ بھاگ دوڑ کے دوران میں گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس پر دونوں بھائیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ممکن ہے کہ اس کے بھائیوں نے اسے پاتے پاتے اپنی جانیں بچھا کر دی ہوں۔

مزلہ لاشوں کے درمیان سے نکلی۔ ماں باپ اور دونوں بہنوں کی لاشیں بھی گھر ہی میں پڑی تھیں۔ وہ بیماری ان کی شہادت پر دو آنسو بھی نہ بہا سکی۔ منی گھر سوار گھیموں میں اب تک گھوڑے دوڑاتے پھر رہے تھے۔

شام ہوتے ہوتے شہر میں موت جیسا سا ٹہا بھا گیا۔ سناٹا تو ہو ہی جاتا تھا۔ شہر میں نہ ہی کون کیا تھا؟ تمام مسلمان شہید ہو چکے تھے اور ان کے مکان میں گر کر لاکھ بن چکے تھے۔ غیر مسلموں کے گھر یہاں سے دور واقع تھے۔ وہاں کوئی زندہ ہونو ہو لیکن مسلم علقوں پر گورستان کا گمان ہوتا تھا۔

اندھیرا پھیلتے ہی مزلہ نے تلوار سنبھالی اور پہنچتی پہنچتی عبید کے گھر کی طرف چلی۔ عبید اس کا خالہ زاد اور بچپن کا معلم تھا۔ عبید کے والد نے محلے کی مسجد میں ایک سکول کھول رکھا تھا جہاں وہ قرآن و حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ عبید اُن کی اکیلی اولاد تھا۔ عبید کی والدہ کا بچپن ہی میں انتقال ہو چکا تھا۔ عبید کو درس و تدریس سے زیادہ پیرگری سے دلچسپی تھی اور اس وقت تک وہ صرف ایک ادنیٰ سپاہی تھا۔ مزلہ کو عبید ہی نے تھوڑی بہت شمشیر زنی کی مشق کرائی تھی۔

مزلہ جب ہزار دقت عبید کے گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ عبید اس کی تلاش میں شام ہوتے ہی نکل گیا تھا۔ عبید اور اس کے باپ کی جان بچ جانا بھی ایک بڑے بھانے تھا۔ جس وقت یروشلم میں ہلاک و نشانے قیامت پر ایک تو دونوں بپ بڑا اتفاقاً اس وقت گھر میں موجود تھے۔ عبید کے مکان کا اٹکا حصہ جس میں گھر میں داخل ہونے کا دروازہ بھی شامل تھا وہ غلٹ ہو کر گر چکا تھا۔ عبید کے والد ایک صوفی قلندر قسم کے بزرگ تھے۔ انھوں نے اس کے دوبارہ تعمیر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ وہ دن کا بیشتر حصہ مسجد میں گزارتے اور رات کو اس کو ٹھڑی میں آکے بٹے رہتے جو اُسے سے محفوظ رہی تھی۔ اس کو ٹھڑی میں موجود ہونے کی وجہ سے ان کی جان بچ گئی تھی کیونکہ کسی کو گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ اس گھر سے ہوئے مکان کے اندر کوئی رہ بھی سکتا ہے۔

مزلہ نے عبید کے والد کو اپنے گھر کی بربادی کی خبر سنائی۔ انھوں نے مزلہ کو صبر کی تلقین کی مگر خود مہربان
سکے اور مزلہ کی منت سماجت کے باوجود اس غوغا کو ٹھہری سے نکل کر مسجد پہنچ کر وہاں شہادت نوش کیا۔
عبید نے مسجد میں پہنچ کر باپ کی لاش کو مسجد کے حجرے میں رکھ دیا۔ ان حالات میں گور و کفن کا
تصور بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ پھر عبید بقیہ تمام رات پر وشم کے دوران گلی کوچوں میں مزلہ کو ڈھونڈنا رہا۔ وہ دن
بیس خود کو اسی کو ٹھہری میں پوشیدہ رکھتا اور رات بھر مزلہ کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔
اس طرح تین راتیں اور گزریں اور مزلہ کا کچھ پتہ نہ چلا۔

جب وہ ہر طرف سے یابوس ہو گیا اور یقین ہو گیا کہ مزلہ بیت المقدس میں موجود نہیں تو پھر وہاں ٹھہرا
بریکار خیال کرتے ہوئے وہ خود بھی تنہا بقیہ رات نکل کھڑا ہوا۔ اب اس کی منزل مصر کا شہر تھا۔
اس وقت قاہرہ ہی وہ واحد شہر تھا جو فتنہ ہلکے کے لٹے پٹے مہاجرین کو بڑی وسیع اقلی سے اپنے
دامن میں بٹھا دے رہا تھا۔



الف سیلی کا شہزادہ، اپنے دور کی وہ عظیم مستی ہے جسے تمام مورخین اسلام 'صلاح الدین ثانی' کے نام سے
یاد کرتے ہیں۔

الف سیلی کے شہزادے کا خطاب اس قدر اوسپہ سالار اسلام کو مغرب کے مؤرخوں نے تزیل تعلیق اور
مذاق اڑانے کے لیے دیا ہے۔ اس شہزادے کا اصل نام ارکن الدین محمود تھا۔ فتنہ چنگیزی کے دوران یہ بڑھاپا
کے ہاتھ لگ گیا اور ملک شام میں ہجرت کر دوسرے امیروں کے ساتھ ایک شخص علی بن ورقہ نے بس و بند مرچے
عوض اسے خرید لیا۔ اس کے باپ کا نام شاہ جتی منوالی خوارزم بیان کیا جاتا ہے جسے قسمت نے تخت حکومت سے
اتار کر پابہ زنجیر کر دیا۔

علی بن ورقہ نے محمود کو ایک مسلمان سیٹھ کے حوالے کر دیا کیونکہ وہ سیٹھ کا خرد تھا۔ سیٹھ نے خود
کو اپنا لڑکا کھلنے پر مامور کیا۔ سیٹھ کی بیوی بڑی ظالم عورت تھی۔ ایک دن اس نے ایک معوی غلطی پر محمود کا بے
مارتے آؤ کر دیا۔ اتفاق سے سیٹھ کی بہن فاطمہ خاتون اپنی ماں کے ساتھ آئی ہوئی تھی یہ واقعہ اس کے سامنے
ہی پیش آیا۔ اسے محمود کی حالت زار پر بڑا رحم آیا۔ اس نے سیٹھانی سے کہا:

”بہن! اسے اتنا کیوں مارتی ہو۔ یہ تمہاری مرضی کا کام نہیں کرتا تو اسے مجھے دیدیو۔“

سیٹھانی پسے ہی محمود سے عاجز تھا اس نے خوشی محمود کو فاطمہ خاتون کے سپرد کر دیا۔ دراصل یہ سب کچھ خدا
نے ہی کیا کیونکہ فاطمہ کے گھر پہنچ کر محمود کی زندگی میں زبردست انقلاب آیا۔
فاطمہ خاتون خوشی خوشی محمود کو اپنے گھر لے گئی۔ فاطمہ کے ایک ارکا تھا جس کا کچھ ہی دن بائیسٹر انتقال ہوا تھا
اس کے کانام میسر تھا۔ محمود کی شکل و صورت اس مرنے والے بچے سے بہت ملتی جلتی تھی اس لیے فاطمہ اس کو
میسر کے نام سے پکارنے لگی اور شکل اپنی اولاد کے پرورش کی۔

فاطمہ خاتون کا دوسرا بھائی نجم الدین مصر میں وزیر اعظم کے عہدے پر فائز تھا۔ ایک بار وہ اپنی بہن سے ملنے دمشق
آیا۔ اس نے میسر کو دیکھا، میسرے کی قدر جہیری خوب جانتا ہے۔ اس نے میسر کے حالات معلوم کیے۔ فاطمہ نے
معارف کی۔ اسے محمود میسر میں نہ جانے کوں سے جوہر نظر آئے کہ اپنے ساتھ معرفت لیا۔

مصر پہنچ کر میسر کے جوہر کھلے اور اس نے ترقی کے زینے بڑی تیزی سے طے کرنا شروع کیے۔ وہ بہت
ہنگاموں میں شریک ہوا اور بڑی جوانمردی اور بہادری کے مظاہرے کیے۔ ابو الخذا، ناصر المیاض، مسلمان کاظم مملکت
اور خطہ مغربی کے مندرجات اور تمام دیگر تاریخ داں کہتے ہیں کہ میسر، شجاعت میں موسیٰ فیض، مخلوت میں
جوز اور نظم و نسق مملکت میں منصور سے کسی طرح کم نہ تھا۔ دنیا نے اسلام کا یہ دوسرا صلاح الدین ابوبی، بڑا بہادر،
بیزار اور سیاست مکی اور غیر مکی سے پوری طرح باخبر تھا۔

آگے چل کر یہ میسر بندقدار کے نام سے مشہور ہوا۔

میسر بندقدار علماء کا بڑا قدر دان تھا۔ وہ کشیدہ قامت، خوش رو، خوش وضع تھا۔ اس کے چہرے سے
جل جلال تھا لیکن اس میسر بندقدار کے منتقلی مغرب کا ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ:

”وہ ایک آنکھ سے لانا تھا۔ اس کے چہرے پر سفید داغ تھے۔ وہ بائیں ہاتھ سے تمکوار چلاتا تھا۔“

اسے بیش قیمت بڑے پہننے کا شوق تھا۔ وہ سوائے اپنے اور کسی پر اعتبار نہ کرتا۔ وہ جیسے مل

کر گشت کرتا۔ حماوں پر دھاوا بولنا اور جو بصورت عورتوں کو اڑالے جاتا۔ ان کے زیور بیچ کر

شعاع نے تعمیر کرنا۔ آج قاہرہ میں تو اگلے روز فلسطین میں نمودار ہوتا۔ پھر چاروں بعد دشت عرب

میں نظر آتا۔ اس میں خانہ بدوش مغلوں جیسی تیز رفتاری اور دور رس کی حذا و احدا حیت موجود تھی۔

اس کے معرکوں کی وجہ سے قاہرہ کے عوام اس کی پرستش کرتے اور اس سے خائف بھی رہتے کیونکہ

معلوم نہیں کہ اس وقت میسر کہاں ہو۔ کہیں وہ درازند ملک جو صلاح الدین کی تفصیل کے برج سے

ان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ میسر تو نہیں۔ کہیں وہ ملہا سوار جو چینوں کو ساتھ لیے ہیرٹوں کی چراگا ہوں

کے اس بار بارہ ٹنگوں کا شکار کھیل رہا ہے۔ میسر نہ ہو۔ یا فاضی کے زانو سے زانو ملے جو

سمرقندی حاجی بیٹا ہوا و قلعہ پڑھ رہا ہے کہیں مری میسر نہ ہو۔
وہ واقعی الف بلی کا شہزادہ تھا۔

اور پھر جب ہاکو خان کے بیٹے ہوئے سفارت کاروں سے میسر ملتا تو اس نے منسل سپاہیوں سے،
”تم ہاکو خان کا فرمان کھول کر پڑھو۔ اس میں کچھ اس طرح لکھا ہے :

”یہ اس کا فرمان ہے جو ساری دنیا کا آقا ہے۔ اپنی تفصیلیں
مندم کرد و اور اعلیٰ قبول کرو۔ اگر یہ بات مانو گے تو تمہیں
امن و چین سے رہنے دیا جائے گا لیکن اگر تم نے یہ بات نہ مانی تو
پھر جو پیش آنا ہے، پیش آئے گا اور ہم کیا جانیں کہ کیا پیش
آئے گا۔ اس کاظم تو صرف بادشاہی آسمان کو ہے۔“

منسل سواروں نے اس لائے آدمی کی زبان سے جب ہاکو خان کا فرمان سنا تو وہ حیران رہ گئے۔ اس نے فوراً
فرمان کو اس طرح دہرایا جیسے وہ فرمان پڑھ رہا ہو۔ انھوں نے جلال الدین آتابک سے اس شخص کے بارے میں پوچھا
لیکن وہ کیا بتاتا۔ وہ خود بھی تباہ رہ چکا تھا۔ ہاں اسے یہ خیال تھا کہ ہو سکتا ہے یہی میسر بند قدار ہو جس کا
بھاری اور غولندی کے چرچے مصر سے شام تک پھیلے ہوئے ہیں۔



ہاکو خان کے سفیروں کو عزت و احترام کے ساتھ شاہی صمان خانے میں بٹھرایا گیا۔ پھر اسی شام کو ایک ہزار
فوری اجلاس بلا گیا۔ اس اجلاس میں مصری سرداروں کے علاوہ ان امیروں، شہزادوں اور سرداروں کو خاص طور
پر مدعو کیا گیا جو مغلوں کی بغاوت سے خائف ہو کر میان کے ہاتھوں شکست کھاکر ایک مضبوط جاسے پناہ کی تلاش میں مصر
پہنچ گئے تھے۔ ان کے جذبات بہت شدید تھے۔

دربار میں بغداد سے آنے والا جلال الدین آتابک بھی موجود تھا جس نے میسر کو زوال بغداد کا کھنڈ
حال بنا دیا تھا۔

ملک میسر اور اس کے وہ سردار جنہوں نے بغداد اور عباسی خلیفہ مستعصم کا ورد و ناک اپنی آستانہ ہوا
سے انتقام لینے کی قسم کھا چکے تھے۔

سلطان مصر ملک مظفر سیف الدین محمود قطوزی بن مودود کے دربار میں آئے ہی اجلاس شروع ہو گیا۔

سلطان مصر کو بغداد کے حالات اور ہاکو خان کے خطرناک ارادوں سے آگاہ کر دیا تھا اب تو اس فیصلہ یہ کرنا تھا کہ....
جنگ اور ذلت ناک صلح میں سے کونسا راستہ اختیار کیا جائے۔

سلطان مصر نے شاہی نشست منبھا لے ہی ارشاد فرمایا :

”ملک میسر بند قدار سپہ سالار عساکر اسلام مصر۔“

تنام دربار کی نظر میں ایک ساتھ چھ فٹ دراز میسر کی طرف اٹھ گئیں۔ میسر نے اپنی بار جیسی تیز اور
رشن آنکھوں سے درباریوں کو دیکھا۔ پھر اپنی جگہ سے ایک قدم اُگے بڑھ کر سر کو ذرا اٹھایا۔ گویا وہ سلطان کے
کلمہ کا منتظر ہے۔

سلطان نے ٹھہرے ہوئے بلے میں کہا،

”سپہ سالار عساکر اسلام۔ اس غیر معمولی اجلاس کے مقصد سے حاضرین دربار کو آگاہ کریں۔“

میسر نے ایک بار پھر حاضرین پر نظر ڈالی۔ گمراہ اس کی آنکھیں چند گاریاں اور شعلے بکھیرتی معلوم ہوتی تھیں۔
وہ شہر کی طرح گر جا :

”کافر اور سفاک ہاکو خان نے دارالاسلام بغداد کو جلا کر خاک کر دیا۔ اسلامی مرکزیت کے چراغ کو
گلی کر دیا۔ عباسی خلیفہ مستعصم کو لگا گھوٹ کر مار ڈالا۔ اس کے ناپاک قدم ارض مقدس اور
قبلاً اولیٰ کی دیواروں تک پہنچ گئے اور اب وہ یروشلم میں بیٹھا مصر کو ملکا رہا ہے۔ مصر نیل
کی مرز میں، ہزاروں سالہ قدیم تہذیب کا وارث، اسلام اور پرستار ان اسلام کا آخری قلعہ۔
اس نیل کی وادی، اس قدیم تہذیبی مرکز اور اسلام کے آخری قلعہ کو بچانے کی صرف دو صورتیں
ہیں۔ ایک صورت تو وہ ہے جو ہاکو خان نے تجویز کی ہے یعنی اپنی تفصیل کو کو منہم کرد و اور اعلیٰ
قبول کرو۔۔۔۔ اور دوسری صورت وہ ہے جس کا فیصلہ اس دربار کو کرنا ہے۔ تم کو کرنا ہے
مصر کے عوام کو کرنا ہے۔ فیصلہ کرو کہ تمہیں غلامی قبول ہے یا۔۔۔۔۔“

دربار کا سنا سنا سرگوشیوں سے ٹوٹ گیا۔

ایک پُر جوش جوان جو کھیچوٹی می ریاست کا مالک تھا اور ہاکو خان کی دہشت اور بربریت سے گھبرا کر مصر
آگیا تھا اس سے رابطہ کیا گیا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے ہی صبح کر جلا :

”فیصلہ ہو چکا ہے۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔“

میسر نے اسے اشارے سے آگے آگے کو کہا۔ وہ قریب آیا تو پوچھا :

”کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟“

پرجوش فوجوں نے جلدی سے نیا کسے تلوار نکال اور اسے ہوا میں بلند کرتے ہوئے بولا:

"ہمارا فیصلہ نکلا ہے۔"

لیکن تمہارا فیصلہ کیسے قبول کیا جاسکتا ہے۔" میسر نے متانت سے کہا:

"تم ممان ہو۔ ممان کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ پھر اس مرزین کو ملکوں نے اپنے خون سے پہنچا ہے۔ ان کا حق اس پر زیادہ ہے۔"

میسر کے اس اعلان پر مصر کے مالک جوش جذبے سے بھر گئے۔ ان میں سے ایک بولا:

"سپہ سالار نے جو کہا، سچ کہا ہے۔ ملکوں نے مصر کے لیے پہلے ہی خون دیا ہے اور اب اس کی حفاظت میں ایک بلکہ خون کی ہولی کھیل گئے۔"

غلی افریقہ کی قدیم بربر قوم جو اسلام لا چکی تھی، ان کے سردار بھی موجود تھے۔ ان سے برداشت نہ ہو سکا۔ ایک بربر سردار نے احتجاج کرتے ہوئے کہا:

"لیکن یہاں کے قدیم باشندے تو بربر ہیں۔ اس میراث پر پہلا حق ہمارا ہے۔ اس لیے اس کی حفاظت کے لیے سب سے پہلے ہم اپنا خون پیش کرتے ہیں۔"

میسر بڑی دلچسپی اور غور سے سرداروں کی باتیں سن رہا تھا۔ بربر سردار کی بات ختم ہوتی تو پرجوش لشکر پھر بولا:

"معزز سردار۔ یہ سچ ہے کہ مرزین مصر پر ملکوں اور بربروں کا ہم سے زیادہ حق ہے اور یہ بھی درست ہے کہ ہمارا مصر پر کوئی حق نہیں ہے لیکن مصر کا تو ہم پر حق ہے۔ مہری عمان نوازوں کا تو ہم پر حق ہے۔ وادی نیل سے اپنا حق مانگ رہی ہے۔ عمان نوازی ہم سے حق نمک طلب کر رہی ہے اور ہماری پناہ گاہوں سے ٹکرانے والی نیل کی لہریں، ہمیں آواز دے رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ اسے خانان بر باد لوگو! کیا ہم نے تمہیں اس لیے پناہ دی تھی کہ جب دشمن ہمارے دروازے پر دستک دے تو تم پیٹھ دکھا جاؤ۔ خدا کی قسم۔ ہم اس پناہ کو لاج رکھیں گے اور ہمارے مقابلے میں عاجزین کے دستے سب سے آگے ہوں گے۔ ہم مسلمانوں کی آغوش پناہ گاہ کو تباہ نہ ہونے دیں گے، اسلام کو نہ مٹنے دیں گے۔"

"بس بس خاموش ہو جاؤ جوانو۔ میسر بے قابو ہو کر بولا،

"اسلام کو کون ٹاسکتا ہے۔ سات سو سال سے جتنے والے اس چراغ کو کون بجھا سکتا ہے۔ کس کی طاقت ہے کہ اسی دینِ مبین کو مٹائے جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا ہے۔ جس کی کلامی کا احاطہ قرآن نے کیا ہے۔ جس کو پھانسنے کے لیے ایک کلی وہابین سو تیرہ سرفروشنوں کو لے کر میدانِ بدر میں لشکرِ کفار کے سامنے پیش کیا۔"

ہو تھا۔"

میسر کی بات ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ پورا دربار "اللہ اکبر" کے نلک شگاف غروں سے گونج اٹھا۔

سلطان مصر نہایت خاموشی سے یہ تماکار دانی دیکھ رہا تھا۔ اس نے ان باتوں میں بالکل دخل نہ دیا کیونکہ اسے تو ایسے ہی جذبے کی ضرورت تھی۔ اسی جذبے کو ابھارنے کے لیے اس نے آج کا دربار لگا ہوا تھا۔ وہ دلی بی دل میں مذاکرات کا ادا کر رہا تھا کہ وہ جس منصوبے کا اجرا ہوا تھا اس کی منظوری تو مختلف سرداروں کی مختصر تقریروں نے دے دی تھی۔ یوں بھی سلطان مصر کی میسر بند قدار کے سامنے ثانوی حیثیت تھی۔ بظاہر سیف الدین قنزی سلطان تھا لیکن اصل طاقت سپہ سالار میسر بند قدار کے ہاتھ میں تھی۔ رعایا اور فوج دونوں اس پر جان دیتے تھے۔

سیفروں کے آنے سے ممکن خاموشی جاری ہو گئی تھی۔ سلطان مصر نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے میسر سے کہا:

"بند قدار۔ مغل سیفروں کو ہمارے فیصلے سے آگاہ کیا جائے۔"

"تم میں مردار کون ہے؟" میسر نے مغلوں کو خاص قراقرم والی زبان میں مخاطب کیا۔ میسر بند قدار زبان کے معاملے میں میدانِ جنگ اور بردہ فروشن کے بازار کا قلعہ تھا۔ تقبیل تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ زبانوں کی بندش اور روک سے آزاد تھا۔ وہ یونانیوں سے یونانی میں، عربوں سے عربی میں اور دیانے نیل کے منبع کے جیشوں سے ان کی اپنی بولی میں باتیں کرتا تھا۔ اس نے ان مغلوں کو خود ان کی زبان میں مخاطب کیا تو مغلوں کو محسوس ہوا جیسے کوئی ان کا جانی بندان سے گفتگو کر رہا ہے۔

مغلوں میں سے ایک مغل نے ذرا آگے آ کر اپنی زبان میں کہا:

"میں مردار ہوں۔ خانِ ہاکو خان شمشاد ایران و عراق کا فرمان میرے پاس ہے۔ یہ کہہ کر اس نے ایک ہٹا ہوا مومی کاغذ میسر کی طرف بڑھایا۔ اس سردار کی منڈھی ہوئی ٹوپی میں ایک پر لگا ہوا تھا۔

میسر نے کاغذ مردار سے لے لیا اور بولا:

"اس کے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ جو بیٹا ہاکو خان نے ہے، میں بھیجا ہے۔ ہم تمہیں زبانی سنا چکے ہیں۔ اب ہم تمہیں اس کا جواب دینا چاہتے ہیں۔"

مغل نے قدرے خستے اور بے دلی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"پہلے تم فرمان پڑھ لو پھر جواب لکھ دینا۔"

"نہ ہم سے پڑھیں گے اور نہ کچھ جواب دیں گے۔" میسر بند قدار نے کہا اور اس کے ساتھ ہی

ہا کو خان کے فرمان کو بھلا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پھر کہا:

”یہ ہے ہمارا پسندیدہ جواب۔ پسند تو آیا ہو گا تمہیں۔ تم مسلمانوں کے اختلاف کے دھارے پر بہتے ہو۔ بیت المقدس تک آگے ہو مگر اب تمہارے قدم آگے بڑھ سکیں گے۔“

”تو کیا یہ تمہارا جواب ہے۔“ مردار نے بگڑ کر کہا:

”تم ہا کو خان کے غضب کو بھلا کر رہے ہو۔ وہ قاہرہ کی اینٹ سے اینٹ بھلا دے گا اور تم اس کے خون سے دریائے نیل میں چھلانگیں لگا کر ڈوب مرو گے۔“

میرس بہادر ہونے کے ساتھ بڑے ٹھنڈے مزاج کا تھا مگر مردار کے تلخ جملوں پر اسے بھی غصہ آ گیا۔ اس نے گرج کر کہا:

”تم تمہارے ہلاک کے فرمان کے جواب میں تمہارے ساتھیوں کے سر اسے بھیجیں گے تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ قاہرہ میں فرمانوں کا نہیں مروں گا سودا ہوا کر تب ہے۔“

مردار گھبرا گیا۔ اس نے پوچھا:

”تو کیا تمہارے ساتھیوں کو قتل کر دو گے؟ تم ایسا کرنے کی غلطی ہرگز نہ کرنا۔ کیا تمہیں وہ بات یاد نہیں کہ علاؤ الدین خوارزم شاہ نے ہمارے خان اعظم کو توجین چنگیز خان کے آرمیوں کو قتل کر دیا تھا۔ پھر اس کا نام کیا ہوا۔ مغلوں نے خوارزم کو روند کر رکھ دیا۔ آج اس کا کوئی نام لیوا ابھی باقی نہیں۔“

”اے مغرور مغل اس کی خبر بھی زندہ ہے اور دیکھ کہ والی خوارزم جلال الدین شاہ کا بھانجا سیف الدین محمود قطوزی تیرے سامنے تختِ معر پر بیٹھا ہے۔ یہ پُر رعب آواز سلطانِ مصر کی تھی۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ ملکِ ظفر سیف الدین خوارزمی جلال الدین شاہ خوارزم کا بھانجا تھا۔“

مردار یہ سن کر بہت گھبرا یا اور سلطانِ مصر کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اسی وقت میرس نے اپنے آرمیوں کا اشارہ کیا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر مغل مردار کے علاوہ باقی تمام مغلوں کے سر قلم کر دیے۔ یہ منظر دیکھ کر مغل مردار خوف سے کانپنے لگا۔ اسے اپنے سامنے موت کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

میرس بذوقِ دل نے بڑے پُر سکون لہجے میں کہا:

”مغل مردار! تو مت گھبرا۔ ہم تجھے قتل نہ کریں گے، تو ہی تو ہمارا جواب ہا کو خان کو پہنچائے گا۔ مغل مردار کو کوئی جواب نہ سوجھ رہا تھا وہ گھبرا کر ایک ایک کامنہ دیکھ رہا تھا۔“

میرس نے اسے تشکی دیتے ہوئے کہا:

”اب ہمارا آخری جواب سنا اور قاہرہ سے نکل جا۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے سپاہی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھیں۔“

تو جا اور ہا کو خان سے کہہ دے کہ اسے مصر آنے کی ضرورت نہیں۔ مصر خود ہی بیت المقدس کی زیارت کو آ رہا ہے۔ یہ کم قسم کھا کر آئیں گے کہ جب تک ہم القدس کو ہا کو کے ناپاک وجود سے خالی نہیں کر لیتے زمین کے بھگتے ٹھوڑے کی زمین پر رہیں گے۔“

اس وقت قاہرہ کی گلیاں پناہ گزینوں سے بھری ہوئی تھیں۔ یہ لوگ شمال اور شمال مشرق سے ہجرت کر کے آئے تھے اور مغلوں کی دہشت اور بربریت کے افسانے دہرائے رہتے تھے۔ میرس بذوقِ دل اس خوف و دہشت اور انہماک کا پوری طرح مددِ باب کرنا چاہتا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ جو شورشِ مزاج اور مغلوں سے خائف انہماک اس کی قیادت میں لڑنے والا ہے اس کے دل سے مغلوں کا ڈر اور خوف نکل جائے اور وہ جان توڑ کر لڑے۔ اس لیے اس نے ایک منٹ کے علاوہ باقی تمام مغلوں کو قتل کر دیا۔ ان کے قتل کے بعد میرس نے ان کی لاشیں شہر میں جگہ جگہ آویزاں کر دیں تاکہ قاہرہ والوں کے دلوں میں مغلوں کی بیٹھی ہوئی دہشت زائلی ہو جائے اور مغلوں کی بہادری کے افسانوں کو وہ محض قصے اور کہانیاں ہی سمجھنے لگیں۔

مغل لاشوں کی تشہیر سے قاہرہ کے عوام پر خاصا اچھا اثر ہوا اور بعض کمزور دل مجاہدوں نے ہا کو خان کی ہلاکت خیر کی کی داستانیں سنا کر جو خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا اس میں کمی ہو گئی۔

میرس کو یقین تھا کہ قاہرہ والوں کے پاس اب دو ہی راستے ہیں۔ یا تو وہ جان توڑ کر لڑیں یا پھر تباہ و برباد ہو جائیں۔ آخر عوام اور فوج نے پہلے راستے یعنی جنگ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس سلسلے میں علمائے کرام نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے بیت المقدس سے ہا کو خان کو نکلنے اور اسلام کے آخری نفع قاہرہ کو پہنچانے کے لیے جہاد کا اعلان کر دیا۔

C

قطفا زیا کوہِ قاف کی پریوں اور پرستان کی کوئی حقیقت ہو یا نہ ہو لیکن یہ حقیقت ضرور تھی کہ قفقت زکی مورتوں کی جو صورتی ضرب المثل بن گئی تھی اور مشرق و مغرب کا امپاطری ادب (داستانیں) اس ذکر سے بھری پڑی ہیں۔

ہا کو خان نے جب قفقا ز کے جنوبی و شمالی پر خیمے گاڑے تو یہ علاقہ اسے اتنا قریب لگا کہ اس نے وہاں ٹھہرنے کا ایک وسیع پروگرام بنایا۔

اس کی پستہ بیگی کی اصل وجہ وہاں کی عورتوں کا حسن تھا اور خوبصورت عورتیں ہا کو خان کی سب سے بڑی

کمروری تھی۔ قاف کی شہزادی قمر و کاس وہ دیکھ چکا تھا لیکن جب وہ ان ڈھلانوں پر ٹھہرا تو اسے ہر قدم پر ایک بڑھ کر ایک قمر اور دوسودان (ملکہ قاف) دکھائی دیں پھر بھلا وہ واو عیش کیوں نہ دیتا۔

ہلاکو خان کی بیوی دوقوز خاتون کو اس کی عیاشی پر کوئی اعتراض نہ تھا کہونکسہ تو مغلوں کی گھٹی میں پرستی تھی اور ہر رات ایک نہیں چار چار عورتیں اس کی ہوس کا نشانہ بنتی لیکن دوقوز کو یہ پسند نہ تھا کہ کوئی اور ہلاکو خان کے خیمے میں ایک رات سے زیادہ گزارے۔ اس سلسلے میں اس نے جاسوس عورتیں بھیج کر دیکھیں جو ہلاکو کے خیمے پر نظر رکھتیں۔ ہلاکو خان کو ان جاسوس عورتوں کا علم نہ تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ دوقوز اس کے خیمے میں کسی لڑکی کا ایک رات سے زیادہ قیام برداشت نہیں کر سکتی اس لیے وہ خود بھی اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ وہاں قیام کے دوران ہلاکو خان کو جلیشیا کچھ ایسی پسند آئی کہ اس نے دوقوز کی پروا نہ کرتے ہوئے کئی راتوں تک مسلسل جلیشیا پر اپنی نوازشوں کی بارش کی۔

دوقوز خاتون نے اس پر طوفان برپا کیا۔ اسے اپنے قبیلے کے سپاہیوں کے علاوہ عیساٹیوں کی بھی حمایت تھی کیونکہ اس نے سنسوری مذہب اختیار کیا تھا۔ اس کے علاوہ ہلاکو خان کا سپہ سالار قطب وین عیساٹی تھا۔

جب تیسری مسلسل رات کو دوقوز خاتون کو ہلاکو خان کے خیمے میں اس کی موجودگی کا علم ہوا تو دوقوز خاتون ہلاکو خان کے خیمے کے سامنے پہنچ کر اپنے بال بھول لیے اور پیچ پیچ کر اس طرح میں کرنا شروع کر دیں جیسے اس کا کوئی قریبی عزیز مر گیا ہو۔

یہ رات کا وقت تھا اور کام لشکر جو خواب تھا۔ دوقوز کے بین سن کر اس کے قبیلے کے سردار اور ہلاکو خان لشکر میں شامل ہونے والے عیساٹی دستوں کے سردار وہاں جمع ہو گئے۔

ہلاکو خان کا عیش مکدر ہو گیا اور وہ گرجتا رہتا خیمے سے باہر نکلا لیکن سرداروں کو وہاں دیکھ کر اس نے مصیبت سے گامیا اور دوقوز خاتون کو سمجھا کہ اس وعدے کے ساتھ واپس بھیج دیا کہ جلیشیا کی اس کے خیمے میں آخری رات ہوگی۔ اس کے بعد وہ جلیشیا سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو چلا گیا۔

دوقوز خاتون اور جلیشیا کے ٹھکڑے کا یہ شاخسانہ تھا جس نے آگے بڑھ کر ایک خطرناک صورت اختیار کی۔ ہلاکو خان نے بظاہر جلیشیا سے کٹ کر لکھی کر لی لیکن جلیشیا کا حسن و جمال اور مہجی صورت ایسی نہ تھی کہ ہلاکو خان بھول جاتا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ قفقاز کے شمال ڈھلان تک شہنشاہ مغرب برقانی خان (جو اب سامان ہو چکا تھا) کا قبضہ تھا اور وہ جنوب کی ڈھلانوں کو بھی اپنی میراث سمجھتا تھا۔ برقانی خان کو بغداد کی تباہی پر افسوس

اس لیے اس نے ہلاکو خان کو ایک سخت تاکید خط لکھا جس میں اپنے غم و غصے کا اظہار کیا کہ ہلاکو خان اس وقت برقانی خان کا جانی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے سپہ سالار اور بیوی دوقوز خاتون نے بھی اسے مشورہ دیا کہ برقانی سے الجھنے کے بجائے قفقاز چھوڑ کر جنوب کی طرف قدم بڑھائے جائیں اور اسلام کے آخری قلعے قاہرہ پر ضرب کاری لگائی جائے اور دوقوز خاتون نے ہلاکو کو مشورہ دیا اس میں اس کے خالص کو کم ہی دخل تھا۔ دوقوز کو کہ جلاز جلاز قاف سے نکال دیا جائی تھا۔ اسے خط لکھا کہ اگر قاف کے علاقے میں ہلاکو خان کچھ دن اور پڑا رہا تو جلیشیا ایسی ہی لڑائی لڑائیں اس کا کون برباد کرے گی۔ ہلاکو خان کی حکومت کی زینت بن جائیں گی لیکن اسے یہ پتہ ہی نہ تھا کہ قاف کی زمین لڑائی جلیشیا تک ہلاکو خان کے قبضے میں ہے جسے اس نے دوقوز کے خیمے سے کافی دور پوشیدہ طور پر اور چھوڑا تھا تاکہ حالات سازگار ہوتے ہی وہ جلیشیا کو بھر سامنے لے آئے۔

جلیشیا کے صحن سے وہ بہت زیادہ متاثر تھا۔ جلیشیا میں بڑی سا گلی تھی لیکن اس کی ساگ ہی اسے دوسری قفقاز کی گلیوں سے ممتاز کرتی تھی۔ چنانچہ جب ہلاکو خان نے قفقاز سے خیمے ڈیرے اٹھا کر بیت المقدس کا رخ کیا تو جلیشیا بھی اس کے لشکر کے ساتھ سفر کرتی رہی۔ یہاں تک کہ مغلوں کا لشکر دریائے یرون تک پہنچا اور یرون و شلم تک پہنچ گیا۔

اگرچہ یہ علاقہ ریگستانی تھا مگر دریا کے کنارے در در و درمک پھیلی ہوئی چاندنی عجب بہار دکھا رہی تھی۔ اس نے وہ رات دریا کے کنارے گزار دی۔ ہلاکو اپنا خیمہ دوقوز خاتون کے خیمے سے دور لگواتھا۔ یہ کوئی ایسی بات تھی جو دوقوز کو ناگوار لگتی رہتی تھی۔

ہلاکو رات کا بیشتر حصہ اپنے خیمے میں عیش و طرب میں گزارتا اور رات کے پچھلے پہر جھجکتا تھا دوقوز کے خیمے میں جلا جاتا وہ شراب کے نشے میں بہہ رہتا اور دوقوز کے پاس جا کر اونٹ سے منہ پڑ جاتا۔ پھر اسے دن چڑھے اٹھ کر بڑھتا۔ یہ اس کا معمول اور تیرہ بن گیا تھا۔

وہ رات بڑی پر کیف اور پُر سرور تھی۔

جتنی جلد چاندنی نے اسے کچھ ایسا مسرت کیا کہ جلتے جلیشیا کے خیمے میں جانے کے اس نے جلیشیا کو اپنے خیمے میں بلایا اور تمام رات عیش و طرب کیا۔ اسے پھر رات دوقوز کے پاس جلا یا تو یہ دن نہ پایا پھر اس نے عشرت کی اس رات کو غفر نہ کرنا چاہا۔

ادھر دوقوز کی جاسوس عورتوں نے ایک نقاب پوش عورت کو ہلاکو کے خیمے میں جلتے دیکھا تو ان کے کان بھڑکے۔ انھوں نے ادھر ادھر سے سُن گئی مگر کچھ پتہ نہ چل سکا۔ ہلاکو کے تمام غلام اور نیزیں کھلے کھلے غصے تھے۔ کسی نے کچھ قبول نہ کیا اور کہہ دیا کہ کوئی مسلمان عورت ہوگی۔ کیونکہ مسلمان عورتیں اس وقت بھی چہرے

پر رومال باندھتی تھیں۔

لیکن صبح کے دھندلے میں اس راز کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ جب جلیشیا رخصت ہونے لگی تو ہاکو خان اسے بڑے خیمے کے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ جلیشیا کے چہرے پر اس وقت رومال نہ تھا۔ رومال اس نے باہر کمر پہنچا پھر اب اسے کوئی خاص ڈر بھی نہ تھا۔ وہ ایک ایسے مغل کی محبوبہ تھی جس کے دبے بے اور عجب سے مشرقی وسطے اور مغرب تک لرز رہا تھا۔ ہاکو خان اسے اس قدر پسند کرنے لگا تھا کہ اس نے جلیشیا کے اصرار پر یہ وعدہ کر لیا تھا کہ جلد ہی اسے اپنی ملکہ بنائے گا۔ جلیشیا فوراً پہچان لی گئی۔

اس کی صورت پوشیدہ بھی کیسے رہ سکتی تھی۔ رات کو وہ ماہتاب اور دن کو آفتاب تھی۔ پورے لشکر میں اس کی ہم شکل کوئی لڑکی نہ تھی۔ وہ تو راشی ہوئی مورت تھی جسے دیکھ کر مرد و عورتیں ایک ہی ہوت ہو جاتی تھیں۔ جلیشیا کو ہاکو خان کے خاص نوکروں نے اس کے خیمے میں پہنچا دیا اور جلیشیا کی لشکر میں موجودگی کی اطلاع جاسوسوں پروردہ کے ذریعے صبح ہی صبح دو قوز خاتون تک پہنچ گئی۔

اس رات ہاکو خان کے نڈے سے وہ پیسے ہی پریشان تھی۔ اس خبر کو سن کر اس کے ہوش ہی ٹوٹ گئے۔ دو قوز خاتون کو ہاکو خان اور جلیشیا کے تعلقات کی شدت کا علم ہوا تو وہ سخت پریشان ہوئی۔ اسے قراقرم اس قدر وور ہونے کی وجہ سے اپنی تمنا کی کارٹا احساس ہوا۔ قراقرم میں خاقان منگو خان اس کا کتا لٹاؤ کر پھر وہ قراقرم میں خاقان سے ہلاکو کی شکایت بھی کر سکتی تھی لیکن اس ریگستان میں اس کا کون تھا جو اس کی نہ ہاکو خان تو لشکر کا آقا اور جنوب مغرب کا شہنشاہ بن چکا تھا۔

اس نے کوئی اودھم مچانے کے بجائے ٹنڈے دل سے اس مسئلے پر غور کیا۔ عیسائیوں کی تعداد بھی منڈ میں ایک تہائی کے برابر ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ عیسائیوں پر اعتماد کر سکتی ہے کیونکہ وہ خود عیسائی ہے۔ وہ قذو غا پر بھی بھروسہ کر سکتی تھی۔ وہ بھی عیسائی تھا مگر وہ ہلاکو سے بہت دور تھا۔

بڑی سوچ بچار کے بعد دو قوز خاتون نے ریمنڈ چارم کو اپنے خیمے میں طلب کیا اور خیمے کے باہر قبیلے کے مغلوں کا پہرہ لگا دیا کہ کسی کو ادھر نہ آنے دیا جائے اور اگر ہاکو خان کا ادھر آنے کا قصد ہو تو فوراً اطلاع کیا جائے۔

ریمنڈ نے دو قوز خاتون کے خیمے پر پیسچ کر اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔ دو قوز خاتون نے اسے اندر لیا۔ ریمنڈ کا رنگ فنی ہو گیا۔ وہ عبادتی جیلیں میں تو گھنٹوں دو قوز خاتون سے پتہ نہیں کیا کیا باتیں کیا کرتا تھا۔ اس نے آج تک دو قوز خاتون کے خیمے میں جانے کا تصور بھی نہ کیا تھا۔ دو قوز اس جابر اور قہر ہاکو خان کا

فوج سے ہر ایک اس قدر خوفزدہ رہتا تھا کہ اس کے قریب جانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ وہ ایک کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کی قوت فیصلہ جواب دے گئی۔ نہ تو خیمے کے اندر جانے کی ہمت پڑتی تو نہ بغیر ملاقات کیسے واپس جاسکتا تھا۔

اسے اندر جانے میں دیر ہوئی تو دو قوز خاتون نے ایک کینز کے ذریعے اسے دوسرا پیغام بھیجا: بے خوف و خطر اندر آ جاؤ۔ دو قوز خاتون بھی اتنی ہی خطرناک ہے جتنا ہاکو خان ہے۔

اس پیغام سے اس کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ کینز نے اسے آتا پریشان دیکھا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔

ریمنڈ چارم جو انٹھاکیم کے بہادر نائٹوں کا سردار تھا کینز کے ساتھ اس طرح خیمے میں گیا جس طرح کوئی چوٹا بچہ اپنے بزرگ کی انگلی پکڑ کر چلتا ہے۔

دو قوز کے خیمے میں داخل ہوتے ہی اس کا پورا جسم خوف سے کانپ اٹھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہاکو خان اس کے سامنے کھڑا کہہ رہا ہے:

”کیا تو مجھے بھول گیا۔ تو بد و مات اور غدار ہے۔“

ریمنڈ چارم کی آنکھیں دہشت سے بند ہونے لگیں۔ پھر ریمنڈ کا ہاتھ کینز کے ہاتھ سے منتقل ہوا تو دو قوز کے ہاتھ میں پیسچ گیا۔ دو قوز نے کینز کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور ریمنڈ کو لیے ہوئے ایرانی قالین کی ایک مسند پر بٹھا دیا۔

ریمنڈ نے گہرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خطرناک خواب دیکھ رہا تھا۔ دو قوز اس کے سامنے موجود تھی۔

دو قوز خاتون نے اس کی گھبراہٹ دور کرنے کے لیے مسکرا کر کہا:

”ریمنڈ! گھبراؤ نہیں۔ تم ملکہ ایران کے خیمے میں ہو اور جب تک دو قوز زندہ ہے کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔“

لیکن ریمنڈ کو تو پتہ لگے ہوئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ہاکو خان کے سامنے جتنا وہ خود کمزور ہے اتنی ہی دو قوز کمزور ہے۔ اگر وہ اس وقت اس خیمے میں آجائے تو ریمنڈ کے ساتھ ساتھ دو قوز خاتون کی گردن بھی فرش پر لڑتی غارتگی۔

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھری پھر بڑی مشکل سے ایک ایک کر کہا:

”ملکہ ایران کو مجھے یہاں نہ بلوانا چاہیے تھا اس سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔“

دوقوز خاتون بھرٹک اٹھی۔ اس نے سخت بلے میں کہا:

غلط فہمی۔ ہلاکو خان اپنے جیسے کو عشرت کدہ بنا دے تو اسے کوئی نہیں کہتا۔ اگر میں نے تمہیں اپنے
میں بلوایا تو اسے کیوں ناگوار ہوگا۔ اگر ناگوار ہوگا تو میں اس کی پروا نہیں کرتی۔ اب پانی سر سے گرا دیا ہے۔
جلیشا میرے سینے پر ہوگئی دلی رہی ہے۔ یہ میں کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی۔

جلیشا کے ناپیر رہنڈ چوڑکا۔ اس کا رخ اور پری پیکہ کا اس نے لوگوں سے تذکرہ سنا تھا۔ ایک بار
دور سے ہلاکو خان کے ساتھ دیکھا بھی تھا۔ پھر وہ ایسی غائب ہوئی کہ جیسے گدھے کے سر سے بیگ۔ اب
ایک حصے کے بعد دوقوز کے منہ سے اس کا نام سن کر رہنڈ کا متعجب ہونا لازمی تھا۔

”کیا جلیشا شکریں موجود ہے؟“

رہنڈ کا تجسس بڑھ گیا:

”وہ بہت خوبصورت لڑکی ہے اسے تو کسی ملک کی..... اسے اک دم کچھ خیال آیا اور اس نے اپنا
ناکل چھوڑ دیا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ تم پر بھی اس کا جادو چل گیا ہے۔“ دوقوز نے جل کر کہا:

”وہ یہاں موجود ہے اور اسے بھر ہلاکو خان کے خیمے میں مقیم لگاتی رہی ہے۔ رہنڈ میں نے تمہیں اس
اسی سلسلے میں بلایا ہے۔“

رہنڈ کا ذہن کچھ صاف ہوا۔ پھر اسے اطمینان ہوا تو بولا:

”فرمانیے مکڑ ایران.....“

دوقوز نے اس کی بات کاٹ دی اور بولی:

”رہنڈ۔ تم مجھے مکڑ ایران لکھا کرو۔ دوقوز لکھا کرو۔ میں نے تمہیں کئی بار لکھا ہے کہ جب تم مجھے لکھا کرو
کہتے ہو تو میں تم کو اپنے سے بہت دور محسوس کرتی ہوں۔“

”میں آپ کا شکریہ ادا ہوں دوقوز خاتون۔“ رہنڈ نے بحث کو طویل دینے کے بجائے سیدھا
اختیار کرتے ہوئے کہا:

”فرمائیے۔ میں اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہلاکو خان بادشاہ ہے اور ہم سب اس کی رعیت۔ وہ جو
کو یہ ہم انھیں روک تو نہیں سکتے۔“

”لیکن رہنڈ۔ تم یہ تو سوچو کہ وہ میری موجودگی میں جلیشا سے کس طرح محبت کر سکتا ہے۔“ دوقوز خاتون
لہجے ہوئے کہا۔

رہنڈ اب پوری طرح اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا:

”محبت اور وحشت میں ہر بات جلتی ہے۔ اگر آپ کو کسی سے محبت ہو جائے تو مجھے شک ہی نہیں یقین
ہو کہ آپ بھی کچھ کریں گی بشرطیکہ آپ کے ہاتھ میں طاقت ہو۔ بادشاہ اپنا سر قدم اپنی طاقت کے زور پر
تھامے۔“

دوقوز رہنڈ کے جواب پر بڑی جبر نہ ہوئی۔ آخر اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا:

”لیکن میرے دل کو بھی تو صبر آنا چاہیے۔ اس کی کوئی ترکیب بناؤ۔“

”ترکیب؟“

رہنڈ سوچنے لگا۔ ذرا ٹھہر کر بولا:

”اس معاملے میں مجھ سے زیادہ شاہ حیثیت کو متوجہ رہے۔ اگر اس سے متوجہ کیا جائے تو وہ کوئی نہ کوئی ترکیب
پیش کرے گا۔ آپ اسے فوراً بلو الیں۔“

”لیکن وہ تو گرجستانیوں کا ہمدرد ہے۔ مجھ سے زیادہ وہ جلیشا کی حمایت کرے گا۔“ دوقوز خاتون نے
بالا غافلت کی کیونکہ جلیشا بھی گرجستانی قوم کی لڑکی تھی۔

رہنڈ سوچتے ہوئے بولا:

”گرجستانیوں سے اس کا تعلق ضرور ہے لیکن وہ عیسائی ہے اور عیسائیوں کو ہلاکو خان سے زیادہ آپ سے
ستہ ہے۔ وہ آپ کے لیے بڑے سے بڑا قدم اٹھانے پر تیار ہو جائیں گے۔ آپ ہی کی وجہ سے گرجوں میں
لڑتے ہیں اور عیسائی قوم سراٹھا کر چلتی ہے ورنہ ہلاکو خان تو مسجدوں کے ساتھ ہمارے گرجوں کو بھی پوند خاک
دیتے۔“

رہنڈ نے اپنی باتوں سے دوقوز کو رام کر لیا اور وہ شاہ حیثیت کو بلانے پر آمادہ ہو گئی۔ رہنڈ کو معلوم تھا
شاہ حیثیت دوقوز کی کوفتہ دوز کہ سکے گا اور اگر کوئی تدبیر اس کے ذہن میں ہوگی بھی تو وہ اس کے اظہار
سے روک کرے گا۔ وجہ۔ ہلاکو خان کا خوف۔ اس خوفناک انسان سے ٹکرانے کا کوئی تصور بھی کرنا مشکل تھا۔

”اگر ختم نہ ہو تو شاہ حیثیت بھی اس عقل میں شریک ہو جائے گا کہ اس پر دوقوز کے
فائدے کا الزام نہ لگایا جاسکے۔“

اپنی کئی مائیں کی حسین و جمیل بیٹی تھیں۔ اسی دو قوز خاتون کی وجہ سے موت سے بھٹکا ہو گئی تھی۔ وہ مغلوں کے لیے نفرت کرتا تھا لیکن اس کا علاقہ بھی دونوں بادشاہوں کے درمیان واقع تھا اس لیے کھل کر کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔

حیثون مغادر پرست بھی بہت تھا۔ پہلے اس کا رجحان برتانی خان کی طرف تھا لیکن جب سے ہاکو خان نے وہاں کارخانہ کیا تھا حیثون اس کے ساتھ ہو گیا تھا۔

دو قوز خاتون کو شاہ حیثون کی باتوں سے مایوسی ہوئی تو اس نے رینڈ سے پوچھا:

”رینڈ تم کو شاہ حیثون کو بڑا کتنے تھے لیکن ان کا مشورہ قبول کرنے کا مطلب تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی خود ہی کر دوں اور چاہے میرے گھر میں آگ ہی کیوں نہ لگ جائے میں خاموش کھڑی تماشہ دیکھتی ہوں۔“

رینڈ نے ایک اور شوشرہ چھوڑا۔ اس نے کہا:

”مکہ محترم۔ یہ مندر بڑا ام ہے۔ جو آپ چاہتی ہیں وہ آپ لاتی ہے اور جو کچھ شاہ حیثون نے کہا وہ آپ کو ملے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے لشکر میں بہت سے ایسے سردار موجود ہیں جو اس مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں۔ اگر ہمیں یہاں بولالیں تو ایک طرف مسئلہ کے حل کا کوئی پہلو نکل آئے گا۔ دوسری طرف آپ کو ان کام از کم اخلاقی فوائد حاصل ہو جائے گا۔“

دو قوز خاتون خود کو بڑی دانا اور عقلمند سمجھتی تھی مگر اس نے رینڈ کے مشورے سے اتفاق کیا۔ حالانکہ رینڈ نے ہاکو خان کے قہر سے بچانے کے لیے یہ چال چلی تھی۔ دو قوز اس کی چال میں آگئی اور اس نے دس ہزار سے زائد مرداروں کو بھرا بھیجا جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اس کے ہمدرد ہیں۔

دو قوز خاتون کا حکم بھی ان کے لیے ہاکو کے فرمان سے کم نہ تھا۔ وہ سنتے ہی دو قوز کے خیمے میں آگئے۔

”اے ہاکو! (درویشی کے) دس بارہ بڑے بڑے سرداروں کا دو قوز خاتون کے خیمے میں اکٹھا ہونا عجیب نہ تھی جو بھی رہ سکتی۔ ہاکو خان کے خاص آدمی بھی جاسوسی کرتے تھے اور ایک ایک سردار کی جگہ سے جھنجھٹے تھے۔ یہ بات بھی ہاکو کے کانوں تک پہنچ گئی اور اس نے فوراً ہی ایک فیصلہ کر لیا۔“



دو قوز خاتون کے خیمے میں محفل جمی تھی اور گرامر بحث ہو رہی تھی۔ سب کو اس بات کا اعتراف تھا کہ دو قوز

شاہ حیثون کو جب یہ معلوم ہوا کہ جلیشیا کو ہاکو خان اس قدر پسند کرتا ہے کہ اسے دو قوز خاتون بھی پر اور عقل مند شیر کار کی بھی پروا نہیں تو وہ دل میں بہت غصہ ہوا۔ اس کی خوشی کی وجہ صاف ظاہر تھی۔ بہر گرجت فی تھی۔ اگر جلیشیا کہیں ہاکو خان کی بیوی بن گئی تو گرجستانوں کا آفتاب بچنے کا اور ان کا کیہ نہ بڑا کا زور ٹوٹ جائے گا۔ اس وقت تو ان کا کیہ کے عیسائی ٹائٹ ہاکو خان پر حاوی ہیں۔ وہ ابھی سے صلح پر کرتا ہے۔ ارمنی عیسائیوں کو کم ہی منہ لگاتا ہے۔

دو قوز خاتون نے بڑی امید سے پوچھا:

”شاہ حیثون۔ تمہاری عقلمندی کا بڑا چرچا ہے۔ رینڈ کا خیال ہے کہ تم جلیشیا اور ہاکو خان کو الگ کا کوئی ایسا راستہ ضرور نکال لو گے کہ جانب بھی مرجلے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“

شاہ حیثون بڑا جماندہ اور کار تھا۔ اس نے انتہائی معصومیت سے کہا:

”مکہ ایران۔ اس کا ایک راستہ ہے۔“

”کیا ہے۔ کون سا راستہ ہے؟“ دو قوز اتنی خوش ہوئی کہ اس نے شاہ حیثون کو ہاتھ بھی ختم نہ ہوا۔

بات کاٹ دی۔

”اس کا حرف ایک ہی راستہ ہے۔“ شاہ حیثون نے اسی معصومیت سے کہا شروع کیا:

”وہ راستہ یہ ہے کہ مکہ ایران، خود شاہ ایران ہاکو خان کے راستے سے بٹ جائیں۔ مرد مور تیں رکھنے لگتی ہیں۔ وہ تو بادشاہ ہیں۔ وہ حسب مرضی جتنی عورتیں چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ ان کے ہیں آنا موت کو دعوت دینا ہے۔ ان کے خیمے میں آج جلیشیا ہے تو کل گلیشیا ہوگی۔ اس سے مکہ ایران کیا فرق پڑتا ہے؟“

دو قوز خاتون کو اسے ہمارا افسوس ہی ہوا۔ وہ تیز لہجے میں بولی:

”اس کا مطلب ہے کہ مرد جتنی چاہے عورتیں کر لے اور عورت پالتو جانور کی طرح ایک مرد کی زندگی بھر بندھی رہے۔“

”مکہ ایران، اقرا قمر میں مدد چکی ہیں۔ انھیں تو اس بات کا علم ہے کہ بعض خاتون کے لیے تو واشیاؤں کا ایک عقلمند نام کیا گیا تھا پھر مکہ ایران کو کیوں اعتراض پیدا ہوا۔ جہاں تک عورت کا ایک ساتھ زندگی گزارنے کا تعلق ہے تو یہ بات عورت کی مرضی پر منحصر ہے۔ ہم عیسائی تو ایک سے زیادہ نہیں کرتے۔“

شاہ حیثون مغلوں سے جلا ہوا تھا۔ تان کی مکہ روسودان نے شہنشاہ مغرب باتو خان سے

نہ تھا۔

ہا کو خان کو پھر بھی یہ محسوس ہوا جیسے جلیشیا اس پر طنز کر رہی ہے۔ اس نے دو قوز خاتون کو مخاطب

رتے ہوئے کہا:

دو قوز خاتون! تم مکہ ایران و عراق ہو۔ تمہیں زیب وینا کہ اپنی ایک ادنیٰ رعایا کے سلام کو قبول
کردیا یہ تمہارا اعتراف شکست ہے؟

دو قوز خاتون بلبلا گئی اور پلٹ کر بولی:

میکینز اس قابل نہیں کہ ایک مکہ اس سے بات کرے۔

مکینز: "جلیشیا چیخ کر بولی:

"میں کینز نہیں مکہ ہوں۔ اگر دو قوز خاتون ایران و عراق کی مکہ ہے تو جلیشیا ہا کو خان کے دل کی مکہ
ہے۔ اس لیے ایک مکہ کو دوسری مکہ کی بات کا جواب دینا ہوگا۔ اس وقت ہم درجے اور مرتبے میں ایک دوسرے
پر برابر ہیں۔"

دو قوز کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے جل کر کہا:

"پیر کی جوتی پیر ہی میں بھی لگتی ہے۔ وہ سر پر نہیں چڑھا کرتی۔ دودن، خان کی خلوت میں کب
دلہ لہ پر لگ گئے۔۔۔۔۔ جا بیٹھ۔ جتنے دن عیش کر سکتی ہے کر لے۔ دیکھتی ہوں تو کیسے مکہ بنتی ہے؟"
دو قوز خاتون۔ یہ ایران و عراق آپ ہی کو مبارک ہوں۔ میں کسی کے علاقے پر ڈاکا نہیں ڈالوں گی۔
پھر بغداد اور دمشق کے جلے جھلے ایوانوں اور ان دیوان بستوں اب رکھا کیا ہے میں تو مکہ بننا چاہتی
ہوں۔ سرسبز و شاداب وادیوں کی۔ دریا بے نیل کے پھیلے پانی کی۔"

ہا کو خان نے چونک کر جلیشیا کو دیکھا۔ پھر خوشی سے ہنسنے ہوئے کہا:

"جلیشیا۔ تو نے میں خوش کر دیا۔ جا، مصر میں تھے، بخش دیا، ہم تجھے غزنویوں کے ملک کی مکہ ضرور
بنائیں گے۔ باقی تمام ملکوں کی مکہ دو قوز خاتون رہے گی۔"

یہ کہتے ہوئے ہا کو نے جلیشیا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ کھینچتے ہوئے خیمے کے دروازے
کے پاس پہنچا اور پلٹ کر بولا:

"دو قوز خاتون۔ یاد رکھو کہ یہ سردار غلام ہیں، اپنے بادشاہ ہا کو خان کے۔ اور ہمارے لشکر میں شامل
مہمان ہیں ہمارے لشکر اور بعد میں عیسائی ہیں اور یہ بھی یاد رکھو کہ تم قراقرم میں نہیں، اس وقت یرغلم
میں ہو۔"

کے حق پر جلیشیا نے ڈاکہ ڈالا یہ ہا کو ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن بات یہاں آگے نکلتی تھی
کے گلے میں گھٹی کون باندھ گا۔ ہا کو خان کا سامان کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ بات گھوم پھر کر پھل
جفتی تھی۔

وہ ابھی کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے کہ شاہ ایران و عراق ہا کو خان، دو قوز کے
ایک دم داخل ہوا۔

ہا کو خان کو دیکھ کر سب کو مکہ سا ہو گیا۔ سب کے چہرے فقی۔ ان کی نضیں ڈوبنے لگیں۔ ابھی
چھائی جیسے سب کو ایک ساتھ سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ ایسے گھبرائے کہ ہا کو خان کی تعظیم کو بھی نہ اٹھ سکے۔
ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو وہ سب بیٹھے ہی بیٹھے ہا کو کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

ہا کو خان خیمے میں داخل ہو کر دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے حاضرین پر ایک سرری ٹھا
پھر دو قوز پر اس کی نظریں رک گئیں۔

دو قوز کو ڈیرا گھبراٹ نہ تھی لیکن اس کے تبدیل میں ایک آگ سی لگ گئی تھی جلیشیا، ہا کو خان
برابر کھڑی مسکرا رہی تھی اور ہا کو کا دایاں ہاتھ جلیشیا کے شانے پر تھا۔

ہا کو خان نے ایسے لمحے میں جس میں غصے سے زیادہ تسخیر تھا کہا:

"جلیشیا۔ مکہ ایران دو قوز خاتون کی تعظیم بجا لاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا مخصوص تہمتہ بلند کیا۔

جلیشیا نے بڑے انداز سے ہا کو خان کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹایا۔ دو قدم آگے بڑھی اور کہا:

ہوئے بولی:

"جلیشیا مکہ ایران کو آداب پیش کرتی ہے۔"

جلیشیا نے یہ جملہ فقار کی علاقائی زبان میں کہا تھا۔ اس زبان میں ترکی، عربی اور قدیم فارسی کے
شامل تھے۔ دو قوز پورا مطلب تو نہ سمجھ سکی لیکن جس موقع اور جیسے انداز میں یہ کہا گیا تھا اس نے خود
مفہوم سمجھا دیا۔

یوں بھی زبان تو مفہوم کے اظہار کا ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ عقل اور مضبوط علاقے کے لوگ کسی ایسی
میں ضرور گفتگو کرتے ہوں گے جس سے وہ ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھا سکیں۔

دو قوز خاتون نے جواب دینے کے بجائے نفرت سے منہ پھیر لیا۔
جلیشیا کا جھکا ہوا سر اٹھ چکا تھا۔ اس نے ہا کو خان کی طرف دیکھا لیکن اس کی نظروں میں غم یا نفرت

پھر کیا ہوا؟

ہا کو خان دوبارہ بٹسنے لگا۔ اس کی مٹھیاں اب تک بند اور کسی ہوتی تھیں۔
اس نے سوچتے ہوئے کہا:

”پھر میں نے کہا کہ تم نے شہنشاہ ایران، فارس اور عراق کے غضب کو لگا رہا ہے۔ ہمارا خان، تمہارے معر
بٹ سے اینٹ بجا دے گا۔۔۔۔۔ اس ذیل نے کہا کہ ہم تمہارے خان کے جواب میں تمہارے ہی آدمیوں
پر بھی گئے تاکہ اسے یعنی آپ کو معلوم ہو جائے کہ معر میں خزانوں کا نہیں، سروں کا سودا ہوتا ہے۔ اس کے
اوقامیں نے ہمارے سب ساتھیوں کے سر قلم کر دیے۔“

”کس نے۔۔۔۔۔ کون تھا وہ جس نے ہماری شان میں ایسے الفاظ کہنے کی جرأت کی؟“

”میرس کماندار نے، خان محترم۔“

ہا کو چڑھا گیا۔ اس نے سونے کی چھوٹی چوکی پر کبھی بالٹی کی طرف اشارہ کیا لیکن قیل اس کے کہ ساتھی گینز
ٹھاکر اسے دیتی وہ خود ہی چوکی کی طرف اس طرح بھٹتا جیسے بازو، بوتل پر گرتا ہے۔ اس نے گھوڑی کے دودھ
بری بالٹی اٹھائی اور ایک سی سالن میں پوری بالٹی غٹ غٹ کر کے پی لیا۔

پھر اس نے سردار سے کہا:

”اس نے ہماری توہین کی؟“

سردار نے اور زیادہ مہم کر جواب دیا:

”اے خان محترم۔ اس نے آپ کی شان میں بڑی گستاخی کی۔“

”خیر سے سامنے۔“

”اے خان، میرے سامنے۔۔۔۔۔ میں دوبار میں اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔“

”پھر تو نے اس کی زبان کیوں نہ کھینچی؟ ہا کو خان بگڑتے ہوئے بولا:

”تو بزدل ہے ہماری توہین ہوتی رہی اور تو کھڑا نہ دیکھتا رہا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ خان میں۔۔۔۔۔“ سردار گھکھکانے لگا۔

”بزدل۔۔۔۔۔ بلکہ حرام۔۔۔۔۔ یہ کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بالٹی ہا کو خان نے اس سردار کے سر پر
سجائی۔

بالٹی سونے کی تھی اور کافی وزنی تھی۔ سردار کا سر پھٹ گیا اور خون کا فوارہ ابل پڑا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ہا کو خان
سردار کے پیٹ پر ایک لات جادی۔ پھر اس نے منہ بند کرتے ہوئے کہا: ”بزدل اور کمزور کو

ہا کو خان نیچے سے چلا گیا تو دو قوز خاتون رو پڑی۔

ہا کو خان کی بات شیروں کے دھارے کو وہ روک تو نہ سکتی تھی۔ اس نے تو صرف بند باندھنے کی کوشش
کی تھی لیکن وہ ٹوٹ پھوٹ کر اس دھارے کے ساتھ بہ گیا۔

خیچے میں بیٹھے تمام سرداروں اور زمیندار کو ہوش آ گیا تھا۔ جب تک ہا کو موجود رہا سب پر موت
سناٹا چھایا رہا۔ ہر ایک اپنی چیز مندار لٹھا اس کے جانے کے بعد وہ باری باری دو قوز خاتون کو تہ
دینے لگے۔



قاہرہ سے واپس آنے والا واحد سفارت کار ہا کو خان کو دربار مصر کے واقعات سنارہا تھا۔ ہا کو
آ نکھیں لال انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے وسیع دھریں خیچے میں پیر پخت ہو اتیر تیر ٹہل رہا تھا۔
اور عیسائی سردار سر جھکائے دم بخود کھڑے تھے۔

سفارت کار سنارہا تھا:

”پھر میں نے خان کا فرمان اسے دیا۔“

”کس کو دیا؟“ ہا کو ٹھکر کر رہا۔

”میرس کماندار کو۔۔۔۔۔“ مغل سفارت کار سہم کر بولا۔

”ہمارا فرمان پڑھ کر ان پر لرزہ طاری ہوا ہو گا۔“ ہا کو خان نے پوچھا۔

مغل سردار نے جواب دیا:

”خان محترم۔ اس نے آپ کا فرمان پڑھا، بغیر ہی پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔“

ہا کو خان کے غصے کی آگ پر جیسے کسی نے تیل چھڑک دیا۔ تڑپ کر بولا:

”یہ جرأت، یہ حرکت کر کے کس نے اپنی موت کو دعوت دی؟“

”میرس کماندار نے۔“ سردار نے ٹریل آواز میں جواب دیا۔

ہا کو خان کی مٹھیاں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔ پھر اس نے انھیں اتانکا جیسے اس کی سنجیدگی کر
کوئی چیز آگئی ہو اور وہ اسے دبا کر باک کر رہا ہے۔

اس کے منہ سے ایک زوردار ”ہونہ“ نکلے۔

دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں :

ہا کو خان غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے حکم دیا :
”ہم ابھی معرودانہ ہوں گے۔ ہمارا گھوڑا لایا جائے۔“

اس حکم سے دربار میں سنا سنا مچا گیا۔ ابھی کا مطلب تھا اسی وقت۔

ہا کو خان کا گھوڑا خیمے کے باہر آ گیا۔ لوگ اب ہمک ہمک کھڑے تھے۔ ان کی نگاہیں نہ اتنا تھکا کر رہی تھیں۔ اسی وقت خیمے کا پردہ اٹھا اور غزال چشم، غزال کمر اور غزال چال جلیشا اندر داخل ہوئی۔ غضب تو یہ تھا کہ وہ اس گلی سے گھٹنوں تک غزال کی کھال میں لپیٹی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت سرتاپا ہارنی بنی ہوئی تھی۔

آہو چشم جلیشا نے چار سبک قدم اٹھائے۔ سب کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ہا کو اس وقت پشت کیے ہوئے تھا۔ وہ خیمے کے دوسرے کنارے پر پہنچ رہا تھا۔ اس نے جلیشا کو خیمے کے اندر آ کر نہ دیکھا تھا۔

جلیشا نے قدم روک کر بایاں ہاتھ کمر پر رکھا اور ترنم ریز لہجے میں بولی :

”خان....“

ہا کو خان ”سرے پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے گلن میں بانسری کی آواز گونجی یا شنائی مٹی ہی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور ٹھٹک کر گھوڑا ہو گیا جیسے تیز دھوپ میں چلتا ہوا مسافر ایک دم گھیرنے میں آجائے یا ہوا کے زہریلے کا تیز جھوڑا، مگر جسم سے گزر جائے۔

ہا کو خان کا غصے سے تھمتا ہوا چہرہ پہلے سپاٹ ہوا پھر مسکرا دیا۔ اس کا دل تو چاہا ہو گا کہ حضور نذرِ عقیدت پیش کرے اور جمال و شباب کی دیوی پر تمناؤں کے پھول پھانسیں کرے لیکن شاید اسے اپنی شہنائی اور بادشاہی کا خیال آ گیا.... پھر بھی ضبط کرتے کرتے اس کے منہ سے نکل گیا :

”جلیشا، تو واقعی حسن کی دیوی ہے۔ تو سراپا حسن ہے۔ تو تنہا کی پری نہیں بلکہ پریوں کی ملکہ ہے۔ کی ملکہ رومودان یا اس کی بیٹی تھوڑا آج زندہ ہو تیں تو تیرے حسن کو دیکھ کر رشک کرتیں۔“

جلیشا مسکرائی اور اندازِ دلربائی سے سر جھکا کر بولی :

”شاہِ فارس و عراق کے خان، ہا کو خان کو جلیشا سلام پیش کرتی ہے۔“

ہا کو خان اس کی اس لڑا پڑ مٹا اور بولی :

”جلیشا تو خود حسن کی ملکہ ہے۔ تو ہمارے سامنے سر جھکا تا ہے تو ہمیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کائنات ہمیں سجدہ کر رہی ہے۔ رہتا کہ شباب کی اس قزاق گاہ پر ہم کیا پیر پھندا کریں۔“

جلیشا نے اپنا دایا ہوا ہاتھ ہا کو خان کی طرف بڑھایا۔ ہا کو نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اسی وقت اسے دو قوز خاتون کی موجودگی کا خیال آیا۔ اس نے نظر لٹکا کر دو قوز کو دیکھا لیکن دو قوز خاتون کی آنکھوں میں نفرت اور غصے کے بجائے ایک عجیب طرح کلبے سی تھی۔

جلیشا کی نظر بھی ہا کو خان کی نظروں کے تعاقب میں دو قوز پر پڑی۔ اس نے بھی دو قوز خاتون کے چہرے کو بالکل پرسکون پایا۔ جلیشا نے کیوں دو قوز خاتون اس وقت جذبات سے بالکل خالی اور عاری نظر آ رہی تھی۔ جلیشا نے مسکراہٹ کے خیمے بھلتے ہوئے کہا :

”خان، کیا اس جگہ کے موسم میں اس تنگ خیمے میں آپ کو الجھن نہیں ہوتی؟ عمر کے بہترین لمحے دی ہی ہیں جو مرگ کی آغوش میں گزریں۔“

”کیوں نہیں.... کیوں نہیں.... جلیشا تم بہت عقل مند ہو اور زندگی گزارنے کے تمہیں کڑے آتے ہیں۔“ ہا کو خان کا ہاتھ جلیشا کے شانے پر آ کر رک گیا۔

اسی وقت ایک مرد اسے اجاب دیا :

”خان معظّم۔ آپ کا گھوڑا خیمے کے باہر موجود ہے۔ لشکریوں نے بھی اپنے خیمے اکھاڑنے شروع کر دیے ہیں۔“

گھوڑا واپس کیا جائے۔ ہا کو خان کے ہاتھ جلیشا بولی :

”اور خیمے بھی نہ اکھاڑے جائیں۔“

”لیکن خان معظّم نے ہی خیمے اکھاڑنے کا حکم دیا ہے اور سواری کے لیے گھوڑا منگا لیا ہے۔“ مرد اسے برکت کی :

”خان معظّم کا حکم کون ٹال سکتا ہے۔“

”تم بڑے گستاخ ہو۔“ جلیشا ذرا سختی سے بولی :

”کیا تمہیں یہ علم نہیں کہ بادشاہ کے حکم کو ملکہ واپس بھی لے سکتی ہے۔“

پھر وہ ہا کو سے مخاطب ہوئی :

”کیوں خان۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

”ٹھیک کہہ رہی ہو جلیشا۔ تم نے کہا اور ہم نے اپنا حکم واپس لے لیا۔“ ہا کو نے بات کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

جلیشا نے جب اپنا سفید سر میں ہاتھ ہا کو خان کے سیاہ بالوں سے بھرے ہوئے ہاتھ میں دیا تو یوں معلوم

ہوا جیسے دن رات سے گلے مل رہا ہو۔

ہلاکو خان کے تاجم اور پشانی ملک پر کالے کالے الجے بال تھے جس سے اس کا خوف ناک چہرہ اور زیادہ پُر وحشت و دہشت بن گیا تھا۔

جلیشا، ہلاکو کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے خیمے کے پردے کے پاس پہنچی۔ اس نے پردہ اٹھانے سے پہلے پٹ کر دو قوز خاتون پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی۔ دو قوز خاتون کا سرخ و زرد رنگ، سیاہی مائل ہونیکا تھا۔ اس کے چہرے پر اس قدسے چارک اور حسرت تھی کہ اس کی سب سے بڑی دشمن جلیشا بھی سوام کی طرح گلچل گئی۔ وہ اس خیال سے آئی تھی کہ دو قوز کو جلد کے لیے وہ ہلاکو خان کو ساتھ لے کر دریا اور باغات کی سیر کرے گا۔ مگر بیت المقدس کے تباہ اور جلے ہوئے مکانوں کو دیکھنے کی نیکین دو قوز کا ضرورہ چہرہ دیکھ کر اسے اپنا ارادہ بدلا پڑا۔

ایک خادم آئیے گا پردہ اٹھائے ان دونوں کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہا تھا لیکن جلیشا نے قدم واپس لے لیا۔ ہلاکو خان کو چھپے کی طرف کھینچا۔ ہلاکو خان 'کچے دھالے میں پتے میں گئے سرکار بندھے کے مصداق اس کے ساتھ پیچھے کھینچا گیا۔

ہلاکو خان کو واپس آتے دیکھ کر دو قوز اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اس نے ہلاکو خان سے مسند پر بیٹھنے کی درخواست کی۔ ہلاکو خان، جلیشا کے ساتھ میر کے لیے جانے کا ارادہ کر چکا تھا اس لیے اس نے انکار کر دیا۔ شاید وہ جلیشا کو ناراض نہ کرنا چاہتا تھا۔

اس انکار سے دو قوز خاتون کا چہرہ اتر گیا اور چہرے کی سیاہی میں زیادہ گہرائی پیدا ہو گئی۔ جلیشا نے زور لگایا: 'کیا دو قوز خاتون ہمیں اپنا ٹھکانا پسند کریں گی؟' جلیشا کو دو قوز سے خواہ مخواہ کی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔

دو قوز نے بڑی حیرانی سے جلیشا کو دیکھا۔

اسے جلیشا کی پچھلی ملاقات کی تلخ گفتگو بھی یاد آئی لیکن اس وقت جلیشا نے خلوص سے اس کاظم دُور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی وجہ سے دو قوز انکار نہ کر سکی۔

دو قوز نے کہا:

"مزدور مزدور.... مجھے خان اور جلیشا کی عمارت نوازی سے بہت خوشی حاصل ہوگی"

"لیکن ہم تو سیر کرنے جا رہے تھے۔" ہلاکو خان نے اٹھ سے بچھ میں کہا:

"اس خیمے کے گھٹے گھٹے، مول سے باہر کا موسم یقیناً بہتر ہوگا۔"

جلیشا مسکراتی ہوئی بولی:

"خانِ معظم، خوشی اور راحت کا تعلق انسانی ذہن سے ہے۔ اگر ہمارا ذہن کسی چیز کو قبول کر لے تو ہمیں اس سے فرحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے ورنہ خوبصورت سے خوبصورت نظارہ بھی ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ آپ تشریف رکھیے۔ یہاں کا موسم باہر سے بھی اچھا محسوس ہوگا۔ کیا دو قوز خاتون جیسی حسین اور بادشاہیوی لہ ہاتھ سے شراب پیتے ہوئے آپ کو خوشی حاصل نہ ہوگی؟"

ہلاکو خان کے لیے یہ باتیں، بھینس کے آگے میں بھانسنے سے زیادہ نہ تھیں۔ وہ کسی ایسی بات پر قہر نہ دیتا تھا جس کے سمجھنے میں اسے ذہن پر زرا بھی زور دینا پڑے۔

"ہاں! کہہ کر ہلاکو خان مسند پر اس طرح دم سے بیٹھ گیا جیسے کوئی چاڑی چٹان پھسل کر زمین پر آ رہے۔"

دو قوز کے حکم پر چوکیوں پر شراب اور سفید گھوڑی کے دو دوہکی بائیاں رکھ دی گئیں اور ساتی لڑکیاں بڑے بڑے جگ اور لگاں لے کر ایک قطار میں آکر کھڑی ہو گئیں۔ ان ساتی لڑکیوں میں ملک ملک کے خوبصورت چہرے تھے۔ یہ سب ہلاکو خان کے خیمے میں ساتی لڑکی کرتی تھیں۔ دو قوز نے ان لڑکیوں کو اس وقت ہلاکو خان کے خیمے سے بلایا تھا۔

شراب کباب کا انتظام ہو گیا تو دو قوز نے لڑکیوں کو اشارہ کیا تاکہ ناؤ نوش کی عقل کرم ہو۔ ہلاکو خان آں نما کرے میں مسند سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ جلیشا نے دو قوز کا اشارہ دیکھ لیا اور ساتی لڑکیوں کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

دو قوز خاتون نے استغما میرہ نظروں سے جلیشا کو دیکھا۔

جلیشا نے ہنس کر کہا:

"خلوت کی محض میں کسی عذر کو نہیں برداشت کیا جاسکتا۔"

یہ کہہ کر اس نے لڑکیوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ لڑکیاں جلیشا کو حیران حیران نظروں سے دیکھتی باہر چلا گئیں۔... شراب و کباب کی عقلوں میں رقص و موسیقی کا اہتمام کیا جاتا تھا مگر جب محض میں خلوت اور تنہائی ضرور ہوتی تو موسیقی کا انتظام خیمے کے باہر اس طرح کیا جاتا کہ ساز و آواز کی گونج اندر تک پہنچ سکے۔ چونکہ یہ بھی غلط خلوت تھی اس لیے ساز و آواز کا اہتمام خیمے کے باہر کیا گیا تھا۔

خیمے کے اندر صرف جلیشا، دو قوز خاتون اور ہلاکو خان رہ گئے تھے۔

جلیشا نے ذرا اور قریب آکر دو قوز خاتون کے مکان میں مہر گونجی کی: "آج ہلاکو خان کی ساتی تم ہوگی!"

دودھ کو اس بات سے خوشی تو ہوئی لیکن وہ کچھ جھینپ سی گئی اور سر جھکایا۔

جلیشا نے اسے ٹوکا اور آہستہ سے کہا:

"عمل مند، وقت سے خائفہ اٹھایا کرتے ہیں کیونکہ وقت کسی کا دوست نہیں ہوتا اور جب آگے بڑھ جاتا ہے تو لاکھ آوازیں دینے پر بھی پلٹ کر نہیں دیکھتا۔"

دودھ کو زخاؤں بجاتی ہوئی اٹھی۔ وہ چوکی کے پاس گئی اور دودھ سے بھری ایک بالٹی اٹھا لی۔ اس کی کچھ میں نہ آتا تھا کہ دودھ کی بالٹی ہلا کو خان کو کس طرح پیش کرے۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ ہلا کو خان بیٹھے بیٹھے سو نہ گیا ہو اور جگہ سے کہیں ناراض نہ ہو جائے۔

جلیشا نے اس کی یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ اس نے آہستہ سے ہلا کو خان کو آواز دی:

خان، شاہ فارس!

ہلا کو سو تو نہ رہا تھا مگر چونک پڑا۔

جلیشا نے ناز سے کہا:

"شغل فرمائیے۔ آج صاف گری کے فرائض دودھ کو زخاؤں انجام دیں گی۔"

دودھ کو زخاؤں نے موقع غنیمت جان کر دودھ کی بھری بالٹی نوچا ہلا کو کی طرف بڑھادی۔ ہلا کو خان نے بالٹی ہاتھ میں لی اور ایک ہی سانس میں چڑھا لیا۔

دوسری بالٹی نے اس کے سر میں اٹھانہ کیا۔

پھر تیسری بالٹی پیسے پیسے ہلا کو خان کے اندر کا دیو جاگ اٹھا۔ اس کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ دودھ کو زخاؤں چونتی بالٹی لیے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

جلیشا قصداً ہلا کو خان سے اتنا دور جا بیٹھی تھی کہ اگر وہ عالم مستی میں اس کی طرف ہاتھ بڑھائے تو وہ اس کی گرفت میں نہ آئے سے محفوظ رہے۔ وہ تو اس وقت خود ہی دودھ کو زخاؤں کو اس ڈراسے کی پروردہ بنانا چاہتی تھی۔

جلیشا اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر جانے کو تیار ہوئی۔

"بیٹھ جاؤ جلیشا، کہاں جا رہی ہو؟" دودھ کو نے یہ جملہ یقیناً محض رسوا کہا ہوگا۔

ہلا کو خان نے اپنی غور آنکھیں کھولنے کی بہت کوشش کی مگر نشہ اس قدر تیز ہو چکا تھا کہ اس کی آنکھیں کھل سکیں۔

دودھ کو اس کی مضبوط گرفت میں تھی۔

جلیشا ہنسی ہوئی خیمے کے پردے کے پاس پہنچی اور پلٹ کر بولی:

یہ وقت تمہارا ہے۔ چہریوں بھی ماں بیٹے کی خلوت میں کسی دوسرے کو عمل کرنے کا کیا حق ہے۔ اور ہنسی بادل اٹھ گئی۔

یہ نہیں دودھ کو اس گھر سے طنز کو سمجھی یا نہیں۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ ساز و آواز کا ہنگامہ برپا ہو رہا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

جلیشا اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ایک طرف چل پڑی۔



شیخ ابجل کے قریب تمام چھوٹے قلعے ہلا کو خان کی لیٹار کا نشانہ بن گئے تھے مگر ابھی دودھ کو اسے قلعے باقی اپنے محل وقوع کی وجہ سے ہلا کو کے لشکر کو نظر نہ آ سکے یا ان کی مخبری نہ ہو سکی۔

در اصل یہ تمام قلعے گئے جنگلوں اور دشوار گزار پہاڑیوں میں واقع تھے۔ اس لیے ان تک بغیر کسی رہبر کے ابراہام دشوار تھا۔ ہلا کو خان کی تلک دتاڑ سے بچے ہوئے ایسے ہی ایک قلعے میں جلیشا رہتی تھی۔

جلیشا کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور سوائے ایک بھائی کے اور کوئی عزیز نہ تھا۔ جلیشا کا بھائی اچھوٹے عقیدے کا بڑا پابند تھا۔ شیخ ابجل کے قتل کے بعد اس گروہ میں ہلا کو خان کے خلاف بڑی نفرت ہوئی تھی لیکن ان میں اتنی طاقت باقی نہ رہ گئی تھی کہ ہلا کو خان کے مقابلے پر آتے اور شیخ ابجل کے خون کا ایسے اس وقت وہ زیر زمین کام کر رہے تھے لیکن ہلا کو سے انتقام لینے کا خیال ان کے دلوں میں لاوے بڑھ رہا تھا۔

اس گروہ کا سرغنہ جلیشا کا بھائی تھا۔ تھا اگر وہ اس کو شہنشاہ شیخ ابجل کے ماننا اور اس کے حکم پر بے چون و چرا ماننا ان کے دماغ میں یہ بات۔ بیٹھ گئی تھی کہ ہلا کو خان کی موجودگی میں ان کا پینڈا ممکن نہیں۔ اس لیے اب ان کی دشمنی تھی کہ با تو ہلا کو خان کو ختم کر دیا جائے با پھر اس کی طاقت اس قدر کمزور کر دی جائے کہ وہ ایران اور تبارک پھر کر داپس چلا جائے۔

ہلا کو خان کے دار اسما بغداد پر حملے کے وقت بھی ان لوگوں نے بڑا غماں کا کیا تھا۔ بغداد پر حملے سے انہیں ایسے یو یو تھی کہ ہلا کو خان لاکھ طاقت ور سی لیکن اگر اس کے قدم بغداد کی طرف بڑھے تو پورا عالم اسما کا زلزلہ کھلنے کے لیے دوڑ پڑے گا اور ایک بڑا عظیم معرکہ ہوگا اور اس جنگ کا نتیجہ بہر صورت ان کے خاندان

میں ہو گا۔

اگر ہلاک خان کو شکست ہوئی تو ممکن ہے کہ وہ مزارقہ لوٹ جائے اور اگر مسلمان شکست کھائے
حلفانہً بمسبب کا خاتمہ ہو جائے گا اور ان کا ایک دشمن ختم ہو جائے گا۔

لیکن جنگ بغداد میں چند وطن فروش اور غدا پرستوں کی وجہ سے ویسی عظیم جنگ نہ ہو سکی جس پر
امید رکھتے بیٹھتے تھے۔

اور اب ایک دوسرا بغداد سامنے تھا۔ مسلمانوں کا آخری قلعہ مصر۔۔۔۔۔ لہذا اس گروہ کی پوری کوشش ہو
ہلاک خان مصر پر ضرور حملہ کرے اور وہاں ایسی جنگ ہو کہ دونوں لشکر ٹٹے ٹٹے تباہ ہو جائیں۔

ہلاک خان نے اگرچہ بغداد کو تسخیر کر لیا تھا لیکن بغداد کے پاس دن کے محاصرے کے دوران ہم
نے جس شجاعت اور بہادری کا مظاہرہ کیا تھا اس کے پیش نظر ہلاک خان میں قدرے گھبراہٹ پیدا ہو گئی
پھر سلجوقی شہزادے یوسف نے جس بہادری سے ہلاک خان کا راستہ روک کر جاگ شہادت نوش کیا تھا۔
ہلاک خان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ مصر کوئی قلعہ تر نہیں جیسے آسانی سے ہضم کر لیا جاتے گا۔

جیشیہ شباب و شہاب کی ایسی بیٹی تھی جس کی تیغ سے ہوا چھل سکتا تھا چنانچہ اس خبر و دوشہ
اس کے بھائی نے اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ ہلاک خان تک رسائی حاصل کرے۔ خواہ اس کوشش میں اسے
سب کچھ ہی یوں نہ لانا پڑے۔ پھر ہلاک خان کے منزل زل فذموں کو روکے اور اسے مصر پر حملہ کرنے کی ترغیب
دے۔

ہلاک خان کی حکومت تک پہنچنے میں جیشیہ کو زیادہ ہاتھ نہیں بیٹھنے پڑے اور اب وہ ہلاک کے دل لکھ
اور موقع بے موقع، مکمل مصر ہونے کا نعرہ لگا کر ہلاک خان کو مصر پر حملہ کی ترغیب دیتی تھی۔

جیشیہ تین دن سے اپنے آدمیوں سے نہ مل سکی تھی۔ اس کے آدمی اجڑی ہوئی جیسی میں پھسے ہوئے۔ انہوں
کے ذریعے جیشیہ کا اپنے بھائی سے رابطہ قائم تھا۔ یہ اپنی کاروائی انہیں سنا کر اور بھائی کے احکامات اللہ
حاصل کرتی۔

جیشیہ اور اس کے آدمیوں میں دن ہی میں ملاقات ہوئی تھی کیونکہ رات بھر تو وہ ہلاک خان کی دست دراز
کا شکار رہتی تھی۔ اس لیے وہ دن میں موقع نکال کر اپنے آدمیوں سے ملنے جاتی۔

ہلاک خان نشے میں دھت ہو گیا تھا اور رات سے پیسے اپنے جیبے میں آنے کی امید کم تھی۔ اسی خیال سے
جیشیہ اس وقت ویران اور صفا لکیوں میں آہستہ آہستہ گھوڑا دوڑا رہی تھی۔ تمام محلے اور لکیاں ہلاک خان
کی طرف سے پہلے مسلمانوں کے تھے اور اس وقت بے بسی اور بے بسی کا بیتا جاگتا غویہ سنے ہوئے تھے۔

جیشیہ ایک جگہ ہونے مکان کے پاس آ کر رگ گئی۔ پھر اس نے جھک کر اپنے گھوڑے کی گردن کو تھپتھپایا
اور جھک جھک لگاموں کو یوں اٹھنے پٹنے لگی جیسے اس میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو۔

جس مکان کے پاس جیشیہ نے گھوڑا روکا تھا۔ اس کی چھتیں بھی زمین بوس ہو گئی تھیں اور چار دیواری کی
تین دیواریں گر گئی تھیں صرف ایک دیوار سلامت تھی جس کے پاس جیشیہ نے اپنا گھوڑا روکا تھا۔

چند ہی لمحے گزرے تھے کہ دیوار کی دوسری جانب ایک مرا بھرا۔ جیشیہ نے اسی طرح اس سرے باتیں
کرنا شروع کر دیں لیکن دوبارہ سر اٹھا کر ادھر ادھر نظر بھی ڈالتی جاتی تھی۔ یہاں دور دور تک کوئی نظر نہ آ رہا تھا اور
اگر کوئی اسے دیکھ بھی لیتا تو یہی سمجھتا کہ وہ گھوڑے کی لگام تھک کر رہی ہے۔

جیشیہ کو دیوار کے اس طرف کھڑے ہونے آدمی سے گفتگو کرتے ہوئے چار پانچ ہی منٹ ہوئے تھے کہ
اسے کچھ کھٹکا معلوم ہوا۔ جیشیہ نے گھبرا کر اس طرف دیکھا دھڑکھٹا ہوا تھا اسے یوں ہی محسوس ہوا جیسے سامنے کے
ایک مکان میں کوئی جھگڑا چل رہا ہو۔ وہ جلد سے گھوڑے پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ دیوار کے اس طرف اٹھا
ہوا سر بیچا ہو کر غائب ہو گیا۔

جیشیہ گھوڑا اڑھا کر اس مکان کے پاس پہنچ گئی جس میں کوئی داخل ہوا تھا۔ یہ مکان بھی بڑی خستہ حالت
میں تھا اس نے اندر جھانک کر دیکھا۔ کوئی نظر نہ آیا۔ آگن میں جلے گاڑھیر لگا ہوا تھا۔ جیشیہ گھوڑے سے
اتری اور اندر چلی گئی۔

مکان میں تین کمرے تھے۔ دو تو بالکل گر گئے تھے۔ تیسرے کی چھت سلامت تھی۔ ایک کمرے میں ایک
ٹوٹا سا دروازہ لگا تھا۔ جیشیہ نے اس کمرے کا رخ کیا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی خود کو ٹٹے ہوئے دروازے
کی آڑ میں چھپا رہا ہے۔

جیشیہ اسے پاؤں باہر آئی۔۔۔۔۔

اس نے گھوڑے کی زین میں لگی ہوئی تلوار نکالی اور بے نیاز کرتی ہوئی دروازے کے پاس واپس آ گئی۔
اس نے ایک لمحہ انتظار کیا پھر بڑی خاموشی سے کہا:

”اگر تم میرے دشمن نہیں اور مرد ہو تو میرے بھائی۔۔۔۔۔ اگر موت ہو تو میری بہن جو سامنے آ جاؤ۔۔۔۔۔
میرے نہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ بلکہ میں تمہاری مدد بھی کروں گی۔“

جیشیہ کو جواب کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

جواب آنے کی بجائے خود جواب دینے والا باہر آ گیا۔

یہ مزل تھی۔۔۔۔۔ عبید کی منگیتر مزلہ۔

وہ سیاہ چونا سا پسینہ ہوئے تھی۔

جب وہ سر جھٹکے کرے سے نکلی تو جیسے چاند نکلی آیا۔ پھر جب وہ جلیشیا کے قریب پہنچی تو دو چاند نکلتے ہوئے مرد کی نظر میں جھکی ہوئی تھیں اور جلیشیا بڑی حیرانی سے حسن کے اس عجبے کو دیکھ رہی تھی۔ جلیشیا نے دیکھا کہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی لڑکی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ٹپک کر زمین میں جذب ہو گئے ہیں۔ وہ بے چین سی ہو گئی اور بولی:

"میں نے تمہیں بہن کہا ہے۔ مجھ سے اپنا غم بیان کر دو۔"
مزلہ نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی آنسو لڑ رہے تھے۔

جلیشیا نے پھر کہا:

"بہن۔ خود کو سنبھالو۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھتی کہ تم کون ہو۔ میں جانتی ہوں کہ یہ مسلمانوں کا محلہ ہے اور اس میں پھپھنے والی لڑکی مسلمان ہی ہو سکتی ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو؟"
"میں..... میں..... مزلہ کی آواز بھرا گئی اور وہ آگے کھینچ نہ سکی۔

گھر آؤ نہیں بہن۔" جلیشیا نے کہا:

"اطمینان رکھو۔ اب تم میری پناہ میں ہو۔ تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہا کو خان بھی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ ہا کو خان کا پورا لشکر میری صف میں ہے۔"

مزلہ کو کچھ تسلی ہوئی تو اس نے کہا:

"کیا میں آپ پر اعتبار کر سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں....." جلیشیا بولی:

"اگر ایک بہن دوسری پر اعتبار نہ کرے گی تو پھر کس پر کرے گی۔"

مزلہ نے جلیشیا کے لفظوں میں غلوں محسوس کیا۔ پہلے تو اس کا دل بھرا آیا اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ پھر جی ٹھرا تو بابا کے تیر کا کہ گرنے سے اب تک جو کچھ اس پر گزری تھی اب بے کم و کاست بیان کر دی۔ جلیشیا اس کی باتوں سے بڑی متاثر ہوئی۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر پوچھا:

"تمہارا کیا خیال ہے۔ تمہارا منگیترا اس وقت کہاں ہوگا؟"

"مصر میں....." مزلہ نے فوراً کہا:

"کیونکہ مصری مسلمانوں کی آخری پناہ گاہ ہے۔ ہم دونوں کا یہی خیال تھا کہ ہم بھی چھپتے چھپاتے مصر

چھپائیں گے۔"

جلیشیا نے کہا:

مزلہ! میرے اور تمہارے عقیدے میں فرق ہے لیکن مقصد دونوں کا ایک ہی ہے۔ جس طرح تم مغلوں کے اعداؤں سے تباہ ہوئی ہو۔ اسی طرح ان ظالم مغلوں نے ہمارے قلعوں اور اماں کو بے دردی سے ختم کیلئے ہے۔ اہل دشمن تو مشترک ہے۔ میں ہا کو خان یا اس کے لشکر کو تو ختم نہیں کر سکتی لیکن تمہیں مصر ضرور پہنچا دوں گی۔ مرد کی انکس بار آنکھوں میں بھی اس بات سے مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس سے رونا نہ لیا اور بولی:

"آپ کتنی عظیم ہیں بہن۔ لیکن....."

"میں لیکن کو نہیں جانتی۔" جلیشیا نے کہا:

"رات کو تیرا رہنما ایک تیز رفتار گھوڑا لے کر پہنچ جائے گا۔ میرے آدمی تمہیں خطرے سے لاکر مصر پر پہنچا دیں گے۔"

"میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں بہن؟ مزلہ شکر گزاری کے جذبات سے متور ہو کر بولی۔

جلیشیا مسکراتی ہوئی مکان سے باہر آئی۔ گھوڑے پر بیٹھی اور چلی گئی۔

مزلہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔ اتنے دنوں سے وہ اس کمرے میں چھپی کسی نیک گھڑی غار کر رہی تھی..... عبید کی طرف سے بھی وہ ناامید ہو چکی تھی۔ مغلوں کے جیسے سے نکل کر وہ بے تحاش لڑ رہی تھی۔ اسے علم نہ تھا کہ وہ کس طرف جا رہی تھی اور پھر کئی دن ادھر ادھر پھینکے کے بعد وہ اس مکان میں لڑ رہی۔

عبید اس کو تلاش کر کے پہلے ہی مصر کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ اگر مزلہ زندہ پنج انڈیا کے مصر کے اور کہیں نہ جائے گی۔



مصر دھڑ جلیشیا نے رات کو مزلہ کے لیے گھوڑا بھیج دیا۔ اس کے ساتھ تین ہزار قسم کے آدمی بھی تھے۔ وہ پہنچے پہنچے ہوئے تھے۔ سر پر کنوٹپ ٹاٹو پیاں ڈھکی ہوئی تھیں جن سے صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ مزلہ اس وقت سے جب سے جلیشیا سے چھوڑ کر گئی تھی اب تک مسجد میں گری، شکرانے کے لڑائی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ خدا نے جلیشیا کو اس کی مدد کے لیے بھیجا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو

جلیشا، جو کہ اس کے استفادہ کے مطابق شیخ، بھل کی بیرونگاہ ہے، کس طرح اس کی مدد کو آجاتا وہ تو اسے اپنے کرا کے قتل کر سکتی تھی۔

گھوڑے دوڑنے کی آواز سن کر منزلہ نے سجدے سے سر اٹھایا۔ اس کے پاس تھا ہی کیا جو وہ ملتا تھا۔ باقی۔ چادر کو اچھی طرح چہرے کے گرد لپیٹ کر وہ دیوار کے پاس آگئی۔

گھوڑا مانے والے تینوں پر اسرار آدمی گھوڑے کے دائیں بائیں اور تیلے لگے کھڑا تھا۔ منزلہ کو اپنے کے لیے کچھ خون غموس ہوا کہ نہ جلنے والے اسے کہاں لے جائیں؟ لیکن پھر اس نے اس شیطانی دوسرے دل سے نکال پھینکا اور بسم اللہ کہہ کر کاب میں پیر رکھا۔

وہ تینوں اب بھی خاموش تھے۔

منزلہ گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ لگام اس کے ہاتھ میں تھی لیکن کاٹھی کا وہ حصہ جو گھوڑے کے منہ میں اسے آگے اگلے چلنے والا پر اسرار آدمی پکڑے ہوئے تھا۔ اس طرح لگام اس کے ہی ہاتھ میں تھی۔ یہ خاموش سفر محلوں میں آہستہ آہستہ جاری رہا۔

راہ دکھانے والا ان گلیوں اور محلوں سے پوری طرح معلوم ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ منزلہ خود بھی بعض گاہ سے واقف نہ تھی جن سے اسے گزرا گیا تھا۔

مسلمانوں کے دیران محلے سے نکل کر یہ لوگ مڑی پر آ گئے۔ مڑی کے کچھ دور اور غیر مسلموں کی محلی جہاں چراغ و شمعیں روشن تھیں۔۔۔۔۔ چل پھل تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے غیر مسلموں کے محلے میں بارات آئی ہوئی ہے۔

روشن محلوں سے دور دور رہتے ہوئے منزلہ پر اسرار آدمیوں کے ساتھ کافی دور نکل آئی مگر جن راستوں سے گزرا جا رہا تھا وہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھے، کیونکہ منزلہ نے انھی جگہوں پر اپنا بچپن گزارا تھا۔ یہ مختصر قافلہ ایک جگہ رک گیا۔

رہبر نے گھوڑے کی کاٹھی چھوڑ دی اور ہاتھ کے اشارے سے منزلہ کو ایک طرف جانے کا اشارہ کیا۔ سمجھ گئی کہ ان لوگوں نے اپنا فرض ادا کر دیا اور اسے خطرے سے نکال لائے ہیں۔

اس نے گھوڑے کو ایڑ دینے سے پہلے چاہا کہ ان کے اس احسان کا شکریہ ادا کرے لیکن تینوں بہتیاں اسے تنہا چھوڑ کر روشن محلے کی طرف خراماں خراماں روانہ ہو گئیں۔

منزلہ نے مضبوطی سے باگیں سنبھالیں اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑے نے جنوب کی طرف نکل کر رخ کیا اور ہولے بائیں کمرے لگا۔

آخری شکست

○

یروشلم سے ہزاروں میل دور مغلوں کے مرکز قراقرم میں ایک اور ہی قسم کا انقلاب رونما ہو رہا تھا اور ان نے تیزی سے پکڑا کھا یا تھا۔

مغلوں کا خاندان منگو خان قراقرم میں بیٹھا اپنے دونوں بھائیوں قبلانی خان اور ہاکو خان کی فتوحات کو نفاذ کرتا تھا اور شکوک کے طے جیسے جنہوں کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے درباری اس بات پر ناخوش تھے کہ ہاکو خان، چین میں پہنچ کر چینی تمدن اختیار کر لے۔ انہوں نے منگو خان کے کان بھرنا شروع کیے منگو خان فوراً ایک پریلیغ کے ذریعے قبلانی خان کو اپنے دربار میں طلب کر لیا لیکن جب دونوں بھائی ملے تو ان کے اعلان ہو گئے۔

اسی دوران منگو خان کو ہاکو خان کی مسلسل کامیابیوں کی اطلاع ملی۔ اسے معلوم ہوا کہ فتح پر فتح حاصل کرنا ان کے لیے بڑا مشکل طرف بڑھ رہا ہے۔

وہ دروازے گوشوں میں فتوحات کی خبر سے منگو خان میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ اسے بڑی شرم آئی کہ وہ ہاکو خان پر شکست کھاتے قراقرم میں آرام کر رہا ہے۔

اس نے اعلان کیا:

ہمارے آباؤ اجداد جو شہنشاہی کرتے تھے وہ بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیتے تھے۔ ان میں سے ایک نے ایک ملک فتح کیا اور چار دہائیوں میں اس کا پھیلا دیا۔ اب میں بغیر نفس و عیدان جنگ میں ہاکو خان پر مغربی چین کا رخ کروں گا۔

○

منگو خان کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ وہ چین کے سنگ خاندان کے شہنشاہ کے خلاف اپنے بھائی تبتلانی کی مدد کرے۔ قبلائی خان نے اس خاندان کے خاتمے کا قصد کیا تھا۔ شاہی خاندان کے مغلی شہزادوں کو جب معلوم ہوا کہ خان منگو خان خود جنگ پر جانے کا ارادہ کر رہے ہیں انہوں نے زبردست رد عمل کا اظہار کیا اور احتجاج کرتے ہوئے کہا: "خاندان منگو خان کے لیے جو ماری دنیا کا مالک ہے اور جس کے سات بھائی زندہ ہیں، یہ ضروری نہیں خود دشمنوں سے لڑنے چاہئے۔"

منگو خان نے اپنا ارادہ منہ ہلا۔ وہ خاندانی حیر گاہ کے قہر اور عیش و آرام سے اکتا گیا تھا۔ اس نے چھوٹے بھائی اربتی بونا کو جیل کی بنی ہوئی شاہی ہر مٹھالی اور اسے گھر کی چراگاہوں کی حفاظت پر مامور کیا۔ توہنی کی طرح اربتی کو خاندانی الاؤ کا محاذ بننا تھا۔ مغلوں میں یہی دستور تھا کہ سب سے چھوٹے بھائی کو خاندانی الاؤ کا محافظ بنایا جاتا تھا۔ منگو خان، تکتے بھانے والوں سے زور زور سے دھمکیاں دیتے ہوئے کہتا ہوا کہ وہ ان کی طرف گیا جہاں برا قالدون (شاہی مقبرہ) تھا۔ وہ چنگیز خان کی قبر پر چڑھ چلا گیا تھا۔

اس نے اپنے رخصت ہونے کی دعوت بھی دی اور بوڑھے مغلوں نے خوب ہی بھرے شراب چڑھائی۔ ان کے نزدیک یہ فعلی طور طریق اور ثقافت کے اعتبار سے بالکل درست تھا۔ ان کا خیال بلکہ عقیدہ تھا کہ اگر منگو برفس نفیس میدان جنگ میں مغل اردو (لشکر) کی قیادت کرے گا تو چنگیز خان کی روح، یا کئی نو دھون کا پرچم کے ساتھ ساتھ چلے گا۔

منگو خان اور قبلائی خان بڑے لاشکر اور خیر و تر گاہ کے ساتھ قراقرم سے دریائے ہانگ کی جانب ہوئے جو ان کے راستے میں حائل تھا لیکن منگو خان کو یہ سفر راس نہ آیا اور جب ۱۲۹۰ء کی گرمیوں کے شدید زور اس نے ہو چھو کا ماحمہ کیا تو ماحمہ سے کے دوران اسے پیچش کا مرض لاحق ہوا اور وہ اسی مرض میں ۵۸ سال میں مر گیا۔

منگو خان کو برخان قالدون میں چنگیز خان کے پسو میں دفن کیا گیا۔ یہاں کی ڈھلوانوں پر چیل اور منور درخت بکثرت اگتے تھے۔ مغلوں کو منور کے درختوں سے اسی لیے محبت تھی۔

بوڑھے مغلوں نے بنانے کی گاڑی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مارا مکڑیاں جلا دیں۔ جیل کے نیلے درخت دھواں پھن رہا تھا اور بوڑھے شلمان سوچ رہے تھے کہ معلوم نہیں منگو خان کی روح کہاں بیکر کرے۔

منگو خان اور قبیلے کا ایک ہی نام تھا یعنی چاندی یا جادوئی! چاروں بھائیوں میں سے صرف اربتی وہ جو سب سے چھوٹا تھا اس بنانے میں شرکت کی۔ قبلائی خان چین میں اور ہلاکو خان ایشیا کے کچھ (مشرق وسطیٰ)

فوجات حاصل کرنے میں مصروف تھا۔

اوجہ ۲۹۰ء کے اوائل میں ہلاکو خان کا لشکر گیلی کے میدان کی طرف کوچ کی تیاری میں مصروف تھا تو قراقرم کا قاعد ایل خان (ہلاکس کے لیے پیغام لے کر آیا؛

منگو خان مر گیا۔ نیا خاقان منتخب ہونا ہے۔ قودلتانی (جلسہ شہوت) منعقد ہوگی۔ قراقرم واپس آؤ۔ اس اطلاع نے ہلاکو خان کو بڑی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ ہلاکو خان چپکچا یا اور، چپکچا بٹ کی بات بھی تھی مغلوں کی رویت کے مطابق صحرانے گوبی (قراقرم) واپسی اور غریبوں کی قودلتانی میں شرکت ضروری تھی وہ کتنی ہی دور رہی۔ قودلتانی میں شریک نہ ہونا جادوئی آسمان کو نادم کرنے کے برابر تھا۔ آخر اس سے پہلے بھی خاقان مرے تھے ان کی قودلتانی ہوئی تھی۔ پھر یہ قودلتانی منعقد ہو رہی ہے تو اس کی شرکت بھی لازمی ہے۔ قاعد نے بتایا کہ قبلائی خان کو اطلاع بھجوا دی گئی ہے۔ وہ قراقرم روانہ ہو چکا ہوگا۔

ہلاکو سوچنے لگا۔ خاقان عالم کون ہوگا؟

چھوٹا بھائی اربتی بونا، خاندانی الاؤ کا محافظ ہے۔ چھوٹے کا حق پہلے ہوتا ہے لیکن یہ ضروری تو نہیں۔ بڑا بھائی بھی خاقان ہو سکتا ہے۔ منگو خان بھی تو بڑا بھائی تھا۔ پھر اربتی بونا نے مغلوں کے لیے کیا کیا؟ قراقرم میں بیٹھا آرام کرتا رہا۔ کوئی ملک فتح نہیں کیا۔ وہ خاقان عالم بننے کے قابل نہیں۔

وہاں قبلائی خان، خاندان عالم بننے کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن ایک بار قبلائی خان نے کہا تھا کہ اسے منگو بیک کے وقت کی زندگی پسند نہیں۔ وہ چین کو پسند کرتا ہے۔ اس کی بیوی دو قوز خان بھی ہلاکو کی مخالفت نہیں کرے گی کیونکہ ہلاکو خان کے بیٹے باقر خان کی شادی اسی خاندان کنکرات میں ہوئی تھی جس سے جاقوئی خاقان کا تعلق تھا۔

یوں بھی ہلاکو اور قبلائی خان کے گھر سے تعلقات تھے۔ ہلاکو کے سر پر خاقان عالم بننے کا بھوت سوار ہو گیا۔ دنیا کا خاقان۔ شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک اس کے ناکا ڈنکا بجے گا۔ اسے کسی کا حکم نہ مانا پڑے گا۔ سب اس کا حکم مانیں گے۔ فارس سے بحر روم تک کا علاقہ تو اس نے فتح کر لیا ہے۔ اس پر اس کی اولاد کا قانونی حق ہے۔ خاقان عالم کا کردہ نئی فتوحات کا حکم دے گا۔ جنوبی ایشیا کی فتح۔ یورپ کی فتح۔ وہ برتانی خان کا زور توٹے گا اور مغرب قبضہ کے بعد تمام عالم اسلام اس کے تابع ہو جائے گا۔

یہ مسئلہ اتنا اہم تھا کہ ہر شخص اپنی جگہ سوچ رہا تھا۔ ہر ایک کو اپنے مفاد کی فکر تھی۔ ہلاکو خان کی بیوی دو قوز خان بھی سوچتی تھی اور وہ عیسائیت کے رنگ میں اس حد تک رنگ چکی تھی کہ وہ قراقرم واپس جانا چاہتی تھی کیونکہ بالآخر تمام قدم پر گرے تھے جن کی گھنٹیاں بجا کر وہ خوش ہوتی تھی۔

چینیا کو اپنی فکر چٹ گئی تھی۔ اس کا ہلاکو خان پر بڑا اثر تھا اور اس کی بات کی اہمیت تھی لیکن وہ اس لیے خود کوئی

اس کے دائیں طرف ملیشیا اور بائیں جانب دو قوز خاتون کی نشست تھی۔ میز پر بھنے ہوئے گوشت، خشک میوے، تازہ پھل، شراب اور گھوڑی کے دودھ کی گالیٹیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

ہاگو خان کے آتے ہی دعوت شروع ہو گئی۔ اس کے چہرے پر آج پہلی بار فخر کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ غازی خونی، مسخیدگی میں تبدیل ہو گئی تھی اور بات بات پر خوفناک اور بھیاں کھمچے لگا کر اپنے پیسے پیسے دانتوں کی آواز کرنے والے ہاگو خان اس وقت بت بنا بیٹھا تھا۔ اس نے صرف دو دو کی تین بائیسوں پر گنت کیا۔ بھئی ہوئی دوڑے زیادہ گشت بھی نہ کھاسکا۔ تمام دعوتیوں کا یہی حال تھا۔ خیالات کے جزم نے ان کی بھوک اور شراب کی نذر غائبش کو دبا دیا تھا۔

دوست ختم ہوئی تو ہلکا کو نے سب کو مخاطب کیا:
 نب کو معلوم ہے کہ قراقرم سے قاصد آ رہے۔ خاقان منگو خان مرچکا ہے۔ قرولتائی میں نے سفاحان عالم کا
 تلب پڑتا ہے۔

اس نے خاقانِ عالم کے لفظ پر خاص طور پر زور دیا۔ یہی اس کی خواہش کی ترجمانی تھی۔ سب لوگ خاموش بیٹھے۔

ہاں نے ریشمی اجدوستی ہوئی آستین سے منہ پونچھا اور بولا:

”دوتوز خاتون!“

دو تونز پر تک بیڑی۔ نہ جانے وہ اس وقت کیا سوچ رہی تھی۔

ہلکوخان کہہ رہا تھا:

مذاہبی ہمت عقلمند ہے۔ بتا، اس معاملے میں تو کیا کہتی ہے؟

دو قورحاتوں نے اپنے حواس مجتمع کیے۔ تھوک نکلا اور بولی:

نصف شاہِ فارس و ایران و فلسطین۔ یہ ہے خیال میں قراقرم واپس جانا بیکار ہے۔ خان کو یہیں رہنا چاہیے۔ کون ہے،
نائبِ حکم سے برتانی کہ سکے اور کس میں بہت ہے کہ آپ کو قراقرم جانے پر مجبور کر سکے۔ قراقرم جیلے کا تو تین
ہزاروں میں ایک آپ بھی ہوں گے اور جو کچھ ہانڈا کٹے گا وہ محض اس یورش کی یاد ہوگی۔ آپ کا بھائی تو مر چکا ہے۔
لیکن عورت تو آپ نہیں دیکھو سکتے۔ کیا آپ نے سختی سے اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ آپ کو جو انعام ملنا تھا وہ مل چکا ہے
نندکیا میں ولادیاں، بغداد کے باغات، دمشق اور یروشلم پر آپ کا قبضہ ہو چکا ہے۔ آپ اپنی نسل کے لیے ایک

فیصلہ نہ کر سکتی کہ اس نے اپنے بھائی بالیش کو اطلاع بھجوا دی تھی۔ اب اسے احکامات کا انتظار تھا۔ وہ بے چینی سے انتظار کر رہی تھی کیونکہ ہمارا کوخان کو ہم صورت قرار دے جانے یا نہ جانے کا فیصلہ تو کن ہی تھا۔ قصاص قرار دے جواب لے جانے کے لیے ٹھہرا ہوا تھا۔

آخر ہلاکو خان نے چنڈ برٹے سرداروں کو اپنے خیمے میں دعوت کی اطلاع بھجوائی۔

یہ دعوت نہ تھی بلکہ ایک اہم مجلس مشاورت تھی جس میں مغلوں، مسلمانوں اور عیسائیوں کی قسمت کا فیصلہ ہوتا۔

دعوت رات کو پہناتھی اور مغل سرداروں اور عسائی ٹائٹوں اور شاہوں کے درمیان ابھی سے صلاح مشورے ہو گئے تھے۔

ہاکو خان کی واپسی عیسائیوں کی موت کے مترادف تھی۔ وہ مسلمانوں سے ہر جگہ مارا کھا رہے تھے۔ اخلاک کے انڈ اور ریٹھنے ہاکو خان کو قراقرم واپس جانے سے روکنے کے لیے تمام پہلوؤں پر غور کیا۔ اس نے ہاکو کی بیوی دودھو خاتون کو اسٹاپ کیا۔

دودھ تو زار، مینڈکی حسین رفاقت نہ چھوڑنا چاہتی تھی۔ پھر یہاں کے کلیساؤں میں جب اس کے حکم سے گھنٹیاں بجتیں تو اسے عجب طرح کی فرحت حاصل ہوتی۔ گوبی کے خشک اور ریگستانی علاقے سے اب اسے کوئی ڈر ہی نہ رہا تھا۔

ہا کو خان نے دعوت کے لیے ایک الگ خیمہ نصب کر دیا تھا خیمے میں سب سے پہلے جلیشیا داخل ہوئی۔ اس کے پر امرار جاسو مو نے جلیش کے احکامات اس تک پہنچا دیے تھے۔ اسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس معاملے میں بغیر جلیب دار سے ملے لیکن یہ کوشش جاری رکھے کہ ہا کو خان قزاقزم واپس جائے یا نہ جائے مسلمانوں اور عیسائیوں میں جنگ ضرور ہو۔ جلیشیا نے ہا کو خان سے پہلے گفتگو کر کے یہ اندازہ لگایا تھا کہ یہ جڑیں مغل، خاقانِ عالم بننے کے خواب دیکھ رہے۔

خیچے میں داخل ہونے والی دوسری ہستی دو قوز خاتون کو تھی۔ وہ بڑی ندھال نظر آ رہی تھی۔ دو قوز، جیسا کہ
 کہ چوہمک بڑی مگر جیٹھیا نے اس کا بڑی خوش دلی سے استقبال کیا اور دو قوز خاتون کو یقین دلایا کہ اگر اسے
 مشورہ لیا گیا تو وہ دو قوز کا ساتھ دے گی۔

دوقوز کو اس سے بڑا سکون ملے اور اپنی کامیابی کی کچھ اور امید بندھی۔

پورے ضلع میں میزیں بچھی تھیں۔ کنارے کنارے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ ہا کو خان کی سونے کی چوکی ایک اونچے جگہ بنا کر رکھی گئی تھی۔

نئی سلطنت کی بنیاد تو رکھ ہی چکے ہیں:

ہلاکو خان نے زور سے "ہوں" کیا جس سے اس کی دلی بے چینی ظاہر ہوتی تھی۔ پھر اس نے بڑے بڑے انداز میں کہا:

"لیکن تو نے اس پسو پر کیوں غور نہیں کیا کہ قروانی میں شرکت ہماری خاندانی روایت ہے۔ کیا تو میرا ہو کر اپنی روایت کو بھول گئی؟"

دوقوز خاتون گھبرا گئی لیکن فوراً سنبھل کر بولی:

"مجھے معلوم ہے خان! لیکن یہ روایت پہلے ہی توڑی جا چکی ہے۔ جب روس میں خاندان زری کے شہزادہ نے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا تھا تو سوہوڑائی نے واپس جانے سے انکار کر دیا تھا اور یورپ میں پیش قدمی شروع کی تھی۔ آپ کو خان! عظیم جنگیز خان کا یہ قول بھی یاد ہو گا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ۔۔۔ دشمن پر یورش کی جلتے پھردم نہ لیا جائے۔"

ہلاکو خان لاجواب ہو گیا۔ اس نے مردہ آواز میں کہا:

"لیکن دوقوز! تم نے یہ بھی سوچا کہ قروانی میں نے خاندان عالم کا انتخاب ہونے سے؟"

دوقوز خاتون کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ ہلاکو خان کی حرص اس کے لبوں پر لگ گئی تھی۔ دوقوز خاتون خاموش دیکھ کر ہلاکو کو ذرا خوشی ہوئی۔ اس نے دائیں ہاتھ میٹھی جلیشیا سے پوچھا:

"جلیشیا! تو بھی عقل مند ہے اور ہماری صحبت نے تیری فراست کو اور نکھار دیا ہے۔ تو بتا کہ میں اس وقت کیا کرنا چاہیے؟"

جلیشیا جواب پہلے ہی سوچ چکی تھی۔ اس نے فوراً کہا:

"خان! میرے خیال میں دوقوز خاتون کا خیال درست ہے۔ ریگستان کے ایک ذرا سے ٹکڑے کو پار کر کے بعد صرف چند منزلوں کے خالصے پر دریائے نیل کے کنارے قاہرہ کا شہر ہے۔ اس پر قبضہ ہو جائے تو خان قریب کے شہنشاہ بن جائیں گے اور آپ کے بیٹے روم کے بیٹے پانی کے کنارے عشرت کدے بنائیں گے۔ آپ فتح و ظفر کے متعلق کے شبہ ہو سکتے ہیں۔"

ہلاکو خان کو اس کی بات بھی پسند نہ آئی کیونکہ یہ باتیں اس کے کیے ہوئے فیصلے کے خلاف تھیں۔ اس نے:

"نہیں جلیشیا! تو فرما قرم میں ہونے والی قروانی کی اہمیت سے ناواقف ہے۔ یہ ہماری مذہبی اور خاندانی روایت ہے۔ ہم اسے کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ تو ملکہ مصر بننا چاہتی ہے اس لیے ایسا کہہ رہی ہے۔"

جلیشیا نے فوراً جواب دیا: "خان! یہ خیال بھی حقیقت پر مبنی ہے۔ ملکہ مصر بننے کی خواہش میرے ذہن

کسی نہ کسی گہشتے میں غرور موجود ہے لیکن میں نے جو ملکہ ہے وہ صرف مغلوں کی عظمت کے خیال سے ملکہ ہے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ مسکولوں کی اس آخری پناہ گاہ پر ایسی ہی کاری ضرب لگائی جائے کہ یہ جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے، ورنہ مصر میں ملگتی ہوئی جنگاری شعلہ بھی بن سکتی ہے اور یہ زخم نامور کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔"

جلیشیا کی پیش گوئی پر ہلاکو خان کا فیصلہ متزلزل ہونے لگا مگر فوراً ہی خاقان عالم کے تصور نے اسے سارا دیا۔ وہ پلٹ کر قطبوغا سے مخاطب ہوا:

"قطبوغا! کیا تو اتنا بزدل ہے کہ میرے بغیر مسلمانوں کا سر نہیں کھل سکتا۔ کیا مغل عورتوں اور گھوڑیوں نے بچے جتنا چوڑے دیے ہیں یا تو کلیساؤں میں بیٹھ کر حرف گھنٹیاں بھانجا ہوتا ہے؟"

جیسا کہ سرداروں کو ہلاکو خان کے اس جھلنے سے بڑی تکلیف پہنچی خصوصاً شاہ جیٹوں اور رینڈ کو۔ مگر وہ کیا کہہ سکتے تھے۔ قطبوغا اس تمام گفتگو کے دوران خاموش کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ وہ دل سے جانتا تھا کہ ہلاکو خان فراتر م جلا جلتے اور مصر کی فتح کا سر اس کے سر بندھے۔ ہلاکو خان تو اپنے اور اپنی اولاد کے لیے ایک وسیع علاقہ فتح کر چکا تھا۔ وہ لا فتوحات نہ بھی کرے تو اتنا کچھ ہی اس کی سات پشتوں کے لیے کافی تھا مگر قطبوغا کو سپہ سالار ہونے کی حیثیت سے کچھ بھی نہ ملتا تھا۔

قطبوغا کی اولاد جوان تھی۔ اس کے دماغ میں یہ بات نہ جانے کہاں سے سما گئی تھی کہ مصر پر اس کا حق ہے۔ اگر اس نے ہلاکو خان کی مدد موجودگی میں مصر پر قبضہ کر لیا تو پھر وہ مصر کا بادشاہ بن جائے گا۔ ایک آزاد اور خود مختار بادشاہ۔ برقانی خان بھی تو آزاد تھا۔ قبلائی خان بھی چین میں اپنی مافی کر رہا تھا اور ہلاکو خان۔ اسے تو بادشاہ کا خطاب خود خاقان نے دیا تھا۔

ہلاکو نے جو اسے اس طرح مخاطب کیا تو اسے بولنے کا موقع مل گیا۔ جوابات وہ خود نہیں کہہ سکتی تھا اس کا موقع ہلاکو خان نے فراہم کر دیا تھا۔

قطبوغا نے ایک بھر بھری سیالی اور اکر کر کہا:

"خان! مغل بزدل نہیں ہوا کرتا۔ مغل اگر بزدل ہوتا تو فراتر م سے پر دشمن نہ پہنچ پاتا۔ خان خوشی سے فراتر م جا کر خاندانی روایت کو برقرار رکھیں۔ ایک مصر کیا، اگر مجھے اجازت مل جائے تو میں پورے افریقہ کو فتح کر کے خان کے قریبوں میں لاؤں۔ اگر قسمت نے خان کو خاقان بنا دیا تو میں یورپ کو بھی زیر کر کے بحر روم کے آخری سرے تک پہنچوں گا۔"

یہ پہل آواز تھی جس نے ہلاکو خان کے جذبات کی ترجمانی کی۔ اسے قطبوغا سے وہ بدحوکا کرنا تھا، اس وقت اس کا عقل مند لگا۔ اس نے سہن کر کہا: "ارے قطبوغا! تو اتنا عقل مند کب سے ہو گیا؟"

جب سے خان کی عیالی میں آیا ہوں: قطبوغا نے فوراً جواب دیا۔

ہا کو خان اور خوش ہو گیا۔ اس نے ہنس کر پوچھا:

”کیوں قطبوغا! کیا تجھے یقین ہے کہ میں خانان عالم منتخب ہو جاؤں گا؟“

اس میں شک ہی کیلئے خان: ”قطبوغا کو شرفی تو وہ چمک کر بولا:

”آپ کے بھائی ارین بوغانا میں خلع عالم بننے کی اہلیت ہی نہیں اور وہ جو قبلی خان ہے اسے تو چین پسند

آگاہ ہے۔ وہ تو شاید قزوینی میں آنے کی کوشش ہی نہ کرے۔ بھلا اتنے بڑے چین کی شہنشاہیت چھوڑ کر صحرائے

گربی کون جائے؟ بس میدان میں آپ کے سوا اور کون ہو گا۔“

ہا کو خان کچھ سوچنے لگا۔ پھر اک دم بولا:

”قطبوغا نکلیں تو میں قراقرم اس لیے تو نہیں بھیجا پاتا ہوں کہ مصر کی فتح کا سہرا آپ کے تیرے سر بندھے۔“

”نہیں نہیں خان!“

قطبوغا گھبرا گیا۔ اس نے فوراً بلبٹ پلٹ دی:

”میں تو کتنا ہوں کہ آگے بڑھے اور بڑھتے ہی چلے آؤں منزل تک پہنچنے کے ٹوٹ جانے سے کیا فائدہ؟ اگر

خان نے قراقرم جانے کا ارادہ کیا تو اس دور دراز کے سفر میں کئی سال لگ جائیں گے اور یہ مفتوحہ علاقہ روس کے برقی

خان کی زد میں رہے گا۔ برقی خان اب آپ کا سمت مخالف ہو چکا ہے۔ مسلمان ہو جانے کی وجہ سے وہ آپ کا شدید

دشمن ہو گیا ہے۔ اس نے ایک بڑا فوج قفقاز میں جمع کر دی ہے۔“

شام کا ایک اسماعیل بار میر (عیسائی پادری) جو ہا کو خان کے لشکر کے ساتھ تھا اس نے قطبوغا کی

اں میں مل ملاتے ہوئے کہا:

”مغل سپہ سالار قطبوغا کا مشورہ نہایت صائب ہے۔ سب سے پہلے مسلمانوں کا فائدہ ضروری ہے۔“

ہا کو خان اسماعیل کی بلبٹ پر چڑ گیا۔ وہ فوراً بولا:

”یہ صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم مسلمانوں سے ڈرتے ہو اور تمہیں خطرہ ہے کہ اگر ہم واپس چلے گئے تو مسلمان

تمہیں خوب مرہ چکھائیں گے۔“

اور حقیقت بھی یہی تھی۔ عیسائی تو مغلوں کے زور پر لڑ رہے تھے ورنہ وہ تو مسلمانوں سے گزشتہ پچاس سال

سے برابر پیٹتے چلے آ رہے تھے۔ ہا کو خان نے اس وقت ان کی دھمکی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ تملکا کر رفتے تملکا

سچی تھی۔ اسماعیل نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

عیسائیوں نے دیکھا کہ اب تو معاملہ گھڑا جا رہا ہے اور ہا کو خان کسی طرح مصر کی طرف قدم اٹھانے کے لیے

تیار نہیں تو انھوں نے شاہ حیثون کی طرف دیکھا کہ وہی کچھ کہے اور اسے روکنے کی تدبیر نکالے۔

شاہ حیثون کے دل میں پہلے ہی پکھے لگے ہوئے تھے آخر وہ بہت غور کرنے کے بعد بولا:

”خان واقعی نفع شناس میں آپ ہمارے نجات دہندہ ہیں۔ آپ کے جانے کے بعد ہماری طاقت ختم

ہو جائے گی لیکن آپ کا قراقرم جانا ہی ضروری ہے۔ اس لیے میں درخواست کروں گا کہ آپ بدوشم ہماری تحویل میں دے

دیجیے۔ اس کا اثر یہ ہو گا کہ عامل کے مسلح صلیبی لشکر عیسائی عہد اور ہسپٹلر ٹاٹ بھی آپ کی رہایا ہو جائے گے

اور ہماری طاقت بڑھ جائے گی۔“

ہا کو خان کسی خیال میں غرق تھا اس نے شاہ حیثون کی زبان سے یہ بات سنی تو بھر دم اٹھا اور چیخ کر بولا:

”نہیں حیثون۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ کیا کہ ہے کہ ہم تمہارے محافظ بن گئے ہیں مگر یہ کیس طرح ممکن ہے

کہ ہم جو علاقہ فتح کریں وہ تمہارے سپرد کر دیں۔“

شاہ حیثون کچھ کہنے والا تھا کہ جلیش اول پڑی:

”شاہ حیثون! آپ اور قطبوغا دونوں یہ چاہتے ہیں کہ خان قراقرم نہ جائیں۔ دو قوز خانوں اور میں بھی یہی چاہتی ہوں

کہ خان قراقرم کا طویل سفر اختیار کرنے کے بجائے مصر کو فتح کریں لیکن ایسا کتنے بھٹے کیا ہم خود غرض نہیں ہو جاتے؟

خان کے نہ جانے سے ہم سب کے الگ الگ مفاد وابستہ ہیں لیکن ہم اپنی اس خود غرضی اور مفاد پرستی میں خان کا مفاد قطعی طور

پر نظر انداز کر جاتے ہیں خان ہا کو خان اس وقت شاہ ایران و عراق میں لیکن قراقرم جانے پر ان کے سر پر خانانوس علم کا

تماچہ رکھا جاتا ہے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں خود خان سے قراقرم واپس جانے کی درخواست کرنا چاہیے۔“

ہا کو خان جو جلیش کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے فوراً کہا:

”جلیش! تو تو تمام مغل عورتوں سے زیادہ کچھ دار اور ذہین ہے۔ اگر دو قوز زندہ نہ ہوتی میں ضرور تجھے اپنی

بیوی بنا لیتا۔“

دو قوز خانوں اپنے شوہر کا منہ دیکھ کر گھبرا گئی۔

اس کا جی چاہا کہ ہا کو خان کا منہ نوچ لے جو اس کے منہ کا انتفا کر رہا تھا لیکن کچھ نہ کہہ سکی اور اندر ہی اندر

گھٹ کر رہ گئی۔

جلیش کی مدلی باقوں نے کسی کو اس قابل ہی نہ چھوڑا تھا کہ اب کوئی مزید جرح کرتا۔ پورے دربار کے جیسے ساپ

مگو لگیا تھا۔ سب چپ چاپ نہ ٹٹکتے ہوئے تھے۔

انٹھانیکہ کے عیسائی ناٹوں کا سر ملکہ دینت چار اب تک بڑی خاموشی سے تمام گفتگو سن رہا تھا۔ ہا کو خان نے

جوابات کی تھی اس کے بعد کسی کا منہ نہ ٹٹکتا بات کرے ہا کو کو روکنے کی کوشش کرے۔

اس نے محسوس کیا کہ ہلاکو خان اب کوئی فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس پر وہ ہلاکو خان کے سامنے دوڑا ہوا اور بولا:

"اگر خان مجھ وفادار کو اجازت دیں تو میں بھی کچھ عرض کروں لیکن میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ میں خان کے قراقرم جانے کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ ہلاکو خان کی تیوریاں رینڈ کے پیسے جیلے پر ہی چڑھ گئی تھیں لیکن آخری جیلے نے جنگاری کو شعلہ بننے سے پہلے ہی بجھا دیا۔ ہلاکو نے کہا:

رینڈ! تم خود بھی بہادر ہو اور تمہارے ناٹ بھی۔ ہمیں تمہاری وفاداری میں کوئی شبہ نہیں، جو کہنا چاہتے ہو صاف صاف کہو۔"

رینڈ چہارم کو ذرا حوصلہ ہوا۔ اس نے کہا:

"خان عزیز! میرے جاسوسوں نے مجھے اطلاع دی ہے کہ مہر کا سپہ سالار میرس ہندو قرار ایک بڑے لشکر کے ساتھ مقابلے کے لیے آ رہا ہے۔ اگر خان اس ہلاکا کوئی انتظام کرتے جائیں تو یہ مغل اور عیسائیوں دونوں کے مفاد میں ہوگا۔"

رینڈ چہارم نے جو کچھ کہا وہ ہر چند کہ عیسائیوں کے مفاد میں تھا لیکن یہ ایک حقیقت تھی جسے نظر انداز کرنا مہر کا سپہ سالار کی طرف سے غلطی تھی۔ بغداد اور اس کے آگے مسلمانوں نے شجاعت اور بہادری کے جو نمونے پیش کیے ان کا تقاضا تھا کہ ہلاکو خان مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ لگاتا لیکن شاید اس کے دماغ میں قراقرم کے خاقان عالم کا ایسا خیال بیٹھا تھا کہ رینڈ کی بات پر اس کی تیوریاں پھر چڑھ گئیں اور اس نے درستی سے کہا:

رینڈ! کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمارے جاسوس کام نہیں کر رہے ہیں۔ ہمیں تو یہاں تک بتایا گیا ہے کہ مہری فوجیں قاہرہ کو بچانے کے لیے فصیلوں کے آگے گری گری خندقیں کھود رہی ہیں۔ کیا تمہیں ہمارے سپہ سالار کی جنگی مہارت میں کوئی شبہ ہے۔ مسلمانوں کے دلوں پر تو مغلوں کی ایسی دہشت طاری ہے کہ ایک شہر کو فتح کرنے کے لیے ہمارا ایک سوار کافی ہے۔"

پھر ہلاکو خان نے قطبوغا کی طرف دیکھا اور کہا:

"قطبوغا! انصاف کے اس مرد کو اس سلجوقی سلطان کا قصہ سناؤ جس نے ہمیں اپنا تصویر جوتا پیش کیا تھا۔ قطبوغا مسکرایا اور رینڈ کی طرف دیکھ کر بولا:

رینڈ! یہ قصہ بڑا دلچسپ ہے۔ تم اس سے کہہ سکتے ہو کہ بے حال ہو جاؤ گے۔ پہلا لشکر بغداد کو تباہ کر کے آگے بڑھا تو ایک سلجوقی سلطان نے خان کو مخوف پیش کرنے کی درخواست پیش کی۔ اسے جب خان کے سامنے لایا گیا تو

میں ایک ایسا جوتا پیش کیا جس کے دونوں تلووں پر سلطان نے اپنی تصویر نقش کرائی تھی۔ اس نے گڑ گڑاتے ہوئے

کہا:

"ہاں یہ غلام التجا کو تا ہے کہ اس تحفے کو قبول کیجیے اور اس غلام کے مر کو اپنے قدم مبارک سے عزت بخینے۔" (یعنی جب جوتا پہنا جائے گا تو سلطان کی تصویر خان کے قدموں کے پیچھے ہوگی۔)

یہ سننا تھا کہ تمام دربار میں پڑا۔ ہلاکو خان نے بھی ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور کہا:

"دیکھی تم نے مسلمانوں کی زردی۔ پھر بھی تم ہمارے اندیشوں کے پیش نظر مغلوں کا لشکر قطبوغا کے سپرد کر رہا ہے۔ میں۔ قراقرم میں ہمیں کسی سے جنگ نہیں کرنا ہے۔ وہاں تو ہمارے بزرگ غلام فی الاؤ کے سامنے بیٹھ کر ہام

اٹھنے سے خاقان عالم کا انتخاب کریں گے۔"

اس جگہ سلجوقی سلطان کے تحفے والے افسانے کی تشریح ضروری ہے۔

یہ افسانہ کس قدر مضحکہ خیز اور من گھڑت ہے، یہ تو اس کے بھونڈے پن ہی سے ظاہر ہے لیکن ایک مغربی داستان گو نے اپنی افشا پردازی کے زور پر اس افسانے کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ افسانہ اصل اس سلجوقی شہزادے کی شجاعت کی داستان کے تاثر کو کم کرنے کی ایک غیر حقیقی کوشش ہے جس نے اپنے عقبر ہتوں کے ساتھ ہلاکو خان کے لشکر پر حملہ کیا تھا اور جس کے جسم کے ٹکڑے کر کے اس کے منہ میں بٹھائے گئے۔

جب رینڈ نے یہ سنا کہ لشکر میں رہے گا اور ہلاکو خان صرف چند دستوں کو لے کر قراقرم جلتے گا تو وہ عید فوج ہو ا کیونکہ مسلمانوں میں خیال تھا کہ ہلاکو خان مع لشکر کے واپس جلتے گا۔

آخر کار ہلاکو خان نے اپنے سپہ سالار قطبوغا کے پاس مغل لشکر چھوڑا۔ اس نے تمام ارمنی، اگر جتانی فوجیں بھی اس کے حوالے کر دیں اور خود اپنی بیوی و دو قور خاتون اور محبوبہ جلیشیا کو ساتھ لے کر شمال کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس سفر میں اسے کوئی خاص واقعہ نہ پیش آیا سوائے اس کے کہ جب قفقاز کی گھاٹیوں سے وہ گزر رہا تھا تو ایک رات جلیشیا کیس غائب ہو گئی۔

اسے قراقرم جانے کی جلدی تھی اس لیے اس نے جلیشیا کو تلاش کرنے کی کوشش نہ کی۔ یوں بھی اب جلیشیا سے ملنا ہی ممکن تھا۔

خود جلیشیا کو بھی اب ہلاکو خان کے ساتھ رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ جس مقصد کے لیے ہلاکو کے لشکر میں آئی تھی کہ وہ پورا ہو گیا تھا ماسی لیے وہ اپنے بھائی جالیش کے حکم کے تحت ہلاکو خان کو چھوڑ کر اپنے گروہ میں واپس

آئی۔

مصری سوار اس کے پاس آکر گھوڑے سے اتر کر تعظیم بجالایا۔ نقاب پوش نے بھی اس کی تقلید کی اور گھوڑے سے اتر پڑا۔ مصری سردار نے ملا کے بعد ادب سے نقاب پوش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیبرس سے کہا:

”سردارِ عزم! یہ نقاب پوش آپ سے.....“

نقاب پوش نے سوار کا بات کاٹتے ہوئے کہا:

”بہن! یہاں سپہ سالار اسلام بیبرس بندقدار کے حضور میں ہوں۔“

بیبرس کو اور زیادہ تعجب ہوا کیونکہ نقاب پوش کی آواز مد کے بجائے کسی عورت کی تھی۔ بیبرس نے پوچھا:

”ہاں خاتون! میں ہی اسلام کا ادنیٰ خادم ہوں لیکن آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟“

”آپ کو کون نہیں جانتا اس سپہ سالار اسلام! مصر سے بیت المقدس تک اس وقت ہر آنکھ آپ کی طرف لگی ہوئی ہے۔ میں تمام راستے آپ ہی کا ذکر سن رہی ہوں مسلمان آپ کی آمد کے منتظر ہیں۔“

یہ کہہ کر نقاب پوش نے بڑے ادب سے بیبرس کو سلام کیا اور کہا:

”آپ سپہ سالار اسلام! یہ سلام صرف میرا نہیں بلکہ ان تمام مرد و عورتوں کا ہے جو اسلام بھی ہے جن کی آنکھیں اس وقت مصر کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ میں بیت المقدس کی ایک خانقاہ پر بادشاہی ہوں جس کے پورے گھرانے کو مغلوں نے تہ تیغ کر دیا۔ میرا نام مزمل ہے۔“

”مزمل!“ بیبرس نے زیر لب اس نام کو دہرایا پھر پوچھا:

”اگر تم وہی مزمل ہو تو عبید قطیعی کو ضرور جانتا ہو گی۔“

عبید کا نام اس کو مزمل کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے بڑی بے تابی سے پوچھا:

”سالار اسلام! کیا آپ عبید کو جانتے ہیں؟ آپ سے وہ کب ملے تھے؟ کہاں ملے تھے اور..... اور.....؟“

”گھبراؤ نہیں مزمل!“ بیبرس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا:

”عبید بالکل خیریت سے ہے اور اس وقت لشکر اسلام میں موجود ہے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تم اس تک پہنچ گئیں۔ وہ تمہارے لیے جس قدر پریشان ہے اس کا تم اندازہ بھی نہیں کر سکتی۔“

اور واقعی مزمل نے خدا کا شکر ادا کیا۔

اس نے زمین پر سر جھکنے کے بجائے نظریں اٹھا کر آسمان کو اپنی انگلیاں اٹکھوں سے اس طرح دیکھا جیسے وہ براہ راست و بارگاہ قدسی میں پہنچ گئی ہو۔ اس کی نظروں کے اس انداز پر ہزاروں سجدے پھیل رہے ہوئے۔

مزمل نے دربار قدسی میں نذر شکرانہ پیش کرنے کے بعد چہرے سے نقاب دور کر دیا اور چہرہ کا بیبرس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

قاہرہ میں اف بلی کے شہزادے بیبرس بندقدار نے بڑی تیزی سے لشکر ترتیب دینا شروع کیا۔ اس دور قاہرہ کے محلے اور گلی کے پانچواں گز جنوں سے لے کر بیبرس کے محلے سے بے خانقاہ ہو کر مصر پہنچے۔ جب فوجی بھرتی شروع ہوئی تو انہوں نے سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کیا۔ یہ ترک قبائلی تھے اور عربوں پر ہرگز کرنا چاہتے تھے کہ وہ صرف مہمان نہیں ہیں بلکہ ان کے دل اپنے میر باؤں کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بھی خیال تھا کہ اگر خدا خواستہ مصر کا خاتمہ ہو گیا تو پھر کیا ہو گا؟

بیبرس نے ایک طرف چاہا کہ گزین ترکمانوں اور عربوں کو بھرتی کیا۔ دوسری طرف اس نے مصریوں کے جنگجو قبائل کو دعوت دی۔ یہ یہ جو عربی قبائل غالباً دیہی بربر قبیلے ہیں جو حبشی جنگوں میں پیش پیش رہتے تھے اور ان کی مدد مصر کی جیل القدر ملکہ شجرۃ الدرنے منصورہ کے میدان میں فرانسیسیوں کے لشکر کو زبردست شکست دے کر شاہ ذرا اور ملکہ فرانس کو گرفتار کیا تھا۔ جنہیں ملکہ شجرۃ الدرنے اسی طرح خودمانہ کا اظہار کرتے ہوئے بیبرس ہزار تالوار با عزت طور پر راکھ دیا تھا۔

بربر قبائل اپنی جواہری کے لیے افریقہ میں ہمیشہ سے مشہور رہے ہیں۔ بیبرس نے بدو قبائل کو بھی لشکر شامل کر لیا۔

ہلاکو خان کے خلاف قاہرہ میں اس قدر جوش و جذبہ پیدا ہوا کہ قاہرہ کا ہر جوان کوشش کر کے لشکر میں داخل ہو گیا۔ جب لشکر مکمل ہو گیا تو بیبرس نے کوچ کے انتظامات کا معائنہ کیا اور پھر لشکر کے کوچ کا ایک مقرر کر دیا۔

کوچ سے ایک دن پہلے سپہ سالار اسلام بیبرس گھوڑے پر سوار ہو کر آخری تیاریوں کو دیکھنے نکلا۔ میدان میں استاد ہر نیچے پر جاتا اور اپنے سپاہیوں اور سرداروں سے گفتگو کرتا پھر رات کا سپاہی سردار کا اپنے درمیان دیکھ کر خوشی سے چہرے نہ ہاتھ اتار لے کر انہیں فرس راہ کرتے۔

بیبرس کے مزاج میں ہلاکی شوقی تھی۔ وہ سپاہیوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا اور انہیں لطفے ساتھ نیچے کے پاس کھڑا ایک سردار سے باتیں کرتا تھا کہ اس نے دیکھا ایک سوار مر پٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا اس کی طرف اس کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر ایک نقاب پوش سوار تھا۔ بیبرس کو کچھ تعجب ہوا۔ اتنے میں دونوں سوار کے قریب آ گئے۔

میرس نے کہا:

”مزلہ! ہمیں تمہارے عبید نے آگاہ کر دیا ہے۔ اب وہ ہمارے رملے کا ایک سردار ہے اور غزوہ کے خلاف جہاد کے لیے ہمارے ساتھ جارہا ہے۔“

”تمہارا غرض! عبید جہاد پر جارہا ہے تو مجھے بھی اس جہاد میں شریک ہونے کی اجازت دیجیے۔ میں اس کے

دوش بدوش لڑ کر شہادت کی سعادت حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“ مزلہ نے جذبات بھرے لہجے میں کہا:

”غالباً ہے مزلہ! اور غالباً ہی ہے وہ گمراہ اور قوم جس میں ایسی بیٹیاں موجود ہوں۔“ میرس کا سر فخر سے اونٹ

ہو گیا۔ اس نے کہا:

”جس قوم کی بیٹیاں اس قدر بہادر ہوں وہ قوم کبھی کسی کی غلام نہیں ہو سکتی۔ مزلہ! اہم تمہاری خواہش پوری

کری گے مگر اس وقت تم ہمارے ساتھ چلو۔ عبید تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔“

مزلہ گھوڑے پر سوار ہو کر میرس کے ساتھ چلنے لگی۔

ہلاکو خان کی یلغار کے دوران پناہ گزینوں کا ایک سیداب معرچہ چل گیا تھا مگر یہ حکومت مصر کی اسلامی رولاری

اور مل کر رہ گیا تھا کہ اس نے ان خانان بر باد لوگوں کی دلہاری میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ اگر کوئی امیر پہنچا تو اسے امیر

کی حیثیت سے قبول کیا اور شہزادے کو شہزادہ ہی سمجھا گیا۔ چنانچہ زوال بغداد کے بعد جمال الدین اتابک اور بیت المقدس

سے عبید فلسطینی بھی قاہرہ پہنچ چکے تھے۔ اتابک اور عبید کو میرس نے ایک ایک رملے کا سردار مقرر کر دیا تھا اور اب

یہ دونوں غلوں کے خلاف سرخوشی کا مظاہرہ کرنے کے لیے بے چین تھے۔

جمال الدین اتابک کی دل آرام تو اس کے ساتھ تھی لیکن عبید، بیت المقدس میں مزلہ سے بچھڑ گیا تھا اور

اسے پتہ نہ تھا کہ مزلہ اب زندہ بھی ہے کہ نہیں۔ بس ایک موبہم امید تھی اور اس نے طے کیا تھا کہ اگر اللہ نے فتح

نصیب کی اور مسلمانوں نے بیت المقدس سے غلوں کو نکال بھی گایا تو وہ ایک بار پھر مزلہ کو ڈھونڈنے کی کوشش

کے گا۔



میرس بندقدار اور مزلہ گھوڑے اڑاتے ہوئے عبید کے پیچھے کی طرف چلے۔ لشکر کے نیچے میدان میں کئی تین

کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔

مزلہ نے دیکھا کہ میرس جس طرف سے گزرتا ہے لوگ اپنا کام چھوڑ کر اب سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس نے

اپ درست فرما رہے ہیں سالار محترم! مگر اب یہ دل اتنا دکھا ہوا ہے کہ ذرا سی چوٹ بھی برداشت نہیں

ہی جانتی ہوں کہ عبید بیان موجود ہے لیکن وہ کہ یہ خیال آتا ہے کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔

مزلہ نے مزلہ کی آنکھیں چھلک آئیں۔ یہ نہیں مزلہ میرس سے یا کسی نادیدہ درد سے۔

مزلہ نے کچھ پر پہنچ کر دونوں گھوڑے اڑاتے۔ میرس نے کہا:

”مزلہ! میں اطمینان سے بیٹھو۔ عبید اطلاع پاتے ہی آجائے گا۔“

مزلہ نے شاید کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا لیکن اس کا منہ کھلا ہی رہ گیا اور آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میرس

کی طرف تھی۔ اس نے جو مزلہ کو حیران پایا تو لپٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔

مزلہ کا منہ اٹھائے عبید کھڑا تھا۔

مزلہ نے میرس پر بھی حیرت کے وہی تاثرات تھے جو مزلہ کے چہرے پر تھے۔ دونوں آنکھیں پھیلنے لگیں اور

اپنے

عبید مزملہ کو دیکھ کر اس قدر حیران ہوا کہ سپہ سالار کو تعظیم پیش کرنا بھی بھول گیا۔ وہ بس کشتی اندر دیکھے جا رہا تھا۔

عجب رقت انگیز منظر تھا۔

بیرس کبھی ایک کو اور کبھی دوسرے کو دیکھتا۔ دو محبت بھرے دلوں کا یہ اچانک ملاپ اس قدر کہ خود بیرس اس منظر میں کھوسا گیا۔

کچھ دیر بعد بیرس کی محویت ختم ہوئی تو اس نے کہا:

”عبید! ہوش میں آؤ تمہارا مہمان تھکا ماذہ بہت دور سے آیا ہے۔ اسے اندر لے جاؤ۔“

عبید اور مزملہ جیسے خواب سے چونک پڑے۔ پھر عبید گڑ بڑا کہ بولا:

”معاف کیجیے سپہ سالار میں..... مجھ سے غلطی.....“

بیرس کو عبید کی بولچلاہٹ پر ہنسی آگئی۔ اس نے کہا:

”اُن تکلفات کو چھوڑ دو اور مزملہ کو اندر لے جاؤ۔ اسے آرام کی سخت ضرورت ہے۔“

عبید نے حیران سے پوچھا:

”سپہ سالار! کیا آپ مزملہ کو جانتے ہیں؟“

بیرس کو ہنسی آئی اس نے کہا:

”تم اس وقت اپنے حواس میں نہیں ہو۔ تم نے خود ہی مجھے اپنے اور مزملہ کے بارے میں تمام باتیں کہیں یہ مجھ سے ملے اور اپنا نام بتایا تو میں فوراً سمجھ گیا کہ مولے مزملہ کے اور کون ہو سکتا ہے جو ان پُرخصا بیت المقدس سے قاہرہ کا سفر کرے گا۔ اچھا، اندر جاؤ اور اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرو۔“

”اندر آپ کے خیمے میں؟“ عبید نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں ہاں۔ میرے خیمے میں۔“ بیرس نے مسکرا کر کہا:

”میں تمہارے لیے دوسرا انتظام بھی کیے دیتا ہوں۔“

تو دوسرا انتظام..... عبید نے پوچھنا چاہا لیکن اتنی دیر میں بیرس گھوڑے پر بیٹھ چکا تھا۔ اس گھوڑا ہوا ہونیکا۔

عبید اور مزملہ، بیرس کو جلتے ہوئے دور تک دیکھتے رہے۔ پھر عبید مزملہ کو پیٹے ہوئے خیمے میں میں آرائش و زیبائش کی کوئی چیز نہ تھی۔ پورے خیمے میں ایک دری بھی تھی۔ ایک کونے میں تابی نقرہ پھیلی تھا۔ خیمے کی کسی چیز سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ یہ محل کے سپہ سالار کا خیمہ ہے۔ یہاں تک کہ سونے

پانچ ایک طرف ایک چھوٹا سا قالین بچھا ہوا تھا جس پر تکیہ رکھا تھا۔ بیرس غالباً اسی پر سوتا تھا۔ یہ دونوں قالین پر بیٹھ گئے۔ ان کی بے چینی روجوں کو قرار اور دل کی دھڑکنوں کو سکون حاصل ہو گیا تھا عبید بہت بڑی غور سے مزملہ کو دیکھتے ہوئے کہا:

”مزملہ! کیا تمہیں امید تھی کہ میں یہاں مل جاؤں گا؟“

مزملہ کے چہرے پر ایک نرمہ بعد چلی بار خوشی کی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے کہا:

”عبید! میں نے بچپن میں سنا تھا کہ اللہ کی ذات سے ناامید نہ ہونا چاہیے اور یہی امید تجھے یہاں پہنچ لائی۔“

عبید کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ اس نے پوچھا:

”اے ہاں یہ تو بتاؤ مجھ سے الگ ہونے کے بعد تم پر کیا گزری اور تم یہاں تک کیسے پہنچیں؟“

یہ بڑی طویل داستان ہے۔ مزملہ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا:

”میں یوں سمجھتا ہوں کہ خدا کو ملنا منظور تھا۔ اس لیے اس نے اپنا ایک فرشتہ میرے پاس بھیج دیا اور اس فرشتے نے مجھے رہنمائی کا انتظام خود ہی کر دیا۔“

عبید نے الجھے ہوئے کہا:

”یقیناً کوئی فرشتہ ہی یہ کام کر سکتا ہے لیکن ذرا اس فرشتے کی بات بھی تو کچھ بتاؤ تاکہ اگر اس سے کبھی ملاقات باہر کا شکر یہ ادا کر سکوں۔“

”وہ ایک لڑکی تھی۔ نہایت حسین و جمیل لیکن وہ کون تھی یہ میں نہیں جانتی۔“ مزملہ نے عبید کو بتایا:

”دیکھنے میں وہ جنت کی حور معلوم ہوتی تھی لیکن وہ بڑی پراسرار تھی اور اس کے ماتھی تو اس سے بھی زیادہ رازدار۔“

”لیکن وہ جن پری تو نہیں تھی درنہ بھلا بیت المقدس میں ایک مسلمان لڑکی کی کون مدد کر سکتا ہے؟“ عبید نے پوچھا۔

”اے کہا۔“

”وہ کوئی بھی ہو مگر بڑی طاقت کی مالک تھی۔ اس نے مجھے اپنی بہن بنایا اور کہا کہ اب تم میری بہن ہو۔ ہاں کوئی لڑکی نہیں بگاڑ سکتی۔“

”جس بات ہے؟“ عبید نے حیران ہوتے ہوئے کہا:

”میں نے اپنا نام کچھ نہیں بتایا۔ اس کے آدمیوں سے کہنے پوچھا ہوتا۔“

”لڑکی لڑکی اور بولی؟“

”عبید! وہ کوئی بھی ہو۔ میں اس کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔ میں نے اس کا نام آوریہ رکھا ہے۔
پوچھا کہ وہ خود ہی اپنے متعلق کچھ بتانے سے گریز کر رہی تھی۔ اس سے جب میں نے اپنا اصل بیان کر دیا تو وہ
ہوئی۔ فوراً ہی کہا کہ وہ اپنے آدھیوں سے مجھے سرحد پار سمجھا دے گی۔ پھر اس نے جو کہا تھا پورا کر دکھایا۔ اس نے
پرامر اس قاضی میرے آگے پہنچے چلتے رہے۔ وہ لہنے لہنے کرتے پہنچے تھے۔ ایسا لباس میں نے اپنے یہاں کبھی نہ
عبید سوچ میں پڑ گیا۔

آخر وہ لڑکی کون ہو سکتی ہے اور وہ پرامر آوریہ؟
سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ ہونہ ہو، یہ سب کھیل محنت اور پریوں کا ہے۔ کبھی کبھی وہ آدمی
ساتھ ایسی ہی ہمدردی کیا کرتے ہیں!

ابھی وہ ہی سوچ رہا تھا کہ خیمے کے دروازے پر کوئی کھنکھار۔ پھر کسی نے عبید کو آواز دی۔ عبید فوراً
یہ سپہ سالار میرس کی آواز ہے جو اندازے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔

مرزا اور عبید اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ عبید بڑھ کر خیمے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ باہر میرس بندقدار
دوست جلال الدین آتا تھا، اس کی نو مسلم بیوی، ایک قاضی اور چند عوار موجود تھے۔
عبید ان لوگوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ میرس بندقدار، عبید کی اس گھبراہٹ سے بڑا لطف اندوز ہونا
سے نہ رہا گیا۔ اس نے پوچھا:

”سپہ سالار۔ آپ اور یہ لوگ۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”یہ دوسرا انتقام ہے عبید!“۔ میرس نے ہنس کر کہا۔

”جی! عبید کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہ آیا۔“

میرس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

”عبید! یاد رکھو۔ ہمارا آدمی صرف ہمار ہی نہیں ہوتے وہ غفل مند بھی ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا یہ

میں تمہاری صلاحیت کو زنگ لگ جائے گا۔“

”جی بالکل بخیر! آپ نے۔“

عبید نے قاضی صاحب، معزز مرزا، ان فوج اور سب سے آخر میں اپنے دوست جلال الدین تاہک کو
سے دیکھا۔ تاہک مسکرا رہا تھا اور عبید ایک ایک گام نہ یوں تک رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ خدا! یہ تو ہٹاؤ گے
خیمے پر کیوں جمع ہیں؟

میرس سب کو اندر لے آیا۔

اس نے قاضی صاحب کو قالین پر بٹھایا اور کہا:

”قاضی صاحب! دولہا دھن دونوں حاضر ہیں اور ماشاء اللہ بالغ بھی ہیں۔ ان کے ہوش و حواس میں ہونے
انہانت ہیں دینا ہوں۔ ہر دس ہزار دینار اور یہ انگوٹھی رومال دولہا کے لیے ہے۔ دولہا کی ولایت..... یہ
ہونے اس نے عبید کی طرف دیکھا۔

عبید بات کی تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے انگوٹھی پہن لی اور رومال حبیب میں رکھتے ہوئے سرت امیر

پہن لیا

ولایت میں اما زید کھو دیجیے۔“

”مرزا ملہ بنت.....“

”مرزا ملہ بنت، زریک قبیسی! اس کا جواب بھی عبید ہی نے دیا۔“

قاضی صاحب مسکرائے اور بولے:

”گو یا مرزا ملہ بنت، زریک قبیسی کا عقد یعنی مبلغ دس ہزار دینار میں ملے ہمراہ عبید ولہ اما زید بہ ہوش و حواس
ہزار ہا پایا۔“

”جی ہاں قاضی صاحب۔ میرس نے کہا۔“

”لیکن جی ہاں کہنے کا سہی تو صرف دولہا کو دیا جاسکتا ہے۔ آپ جی ہاں کیسے کہہ رہے ہیں سپہ سالار صاحب!“
قاضی صاحب مسکرا کر بولے۔

اس پر لطف بات پر تاہک زعفران زار بن گیا اور ہلکے ہلکے متعقے بلند ہوئے۔ مرزا نے یہ سننے ہی پہرے
انقلاب ڈال لیا اور پیٹھ کھما کر بیٹھ گئی۔

پھر اس خیمے میں درے کے فرش پر انتہائی سادگی سے اسلامی دستور کے مطابق مرزا اور عبید کا عقد ہو گیا۔ دولہا
غفل نہ رہیں برائیں۔“

سپہ سالار نے اپنا خیمہ عبید کے حوالے کر دیا تاکہ وہ کچھ دے دل اٹھان سے شب عروسی کی مسرتوں سے ہلکا
ہو سکیں۔



صبح نماز فجر کے بعد کوچ کا تقارہ ہوا۔ ڈیرے خیمے اکھاڑے جانے لگے۔ بار بار دای کے چھڑوں پر سلمان خورد دوش

لاواگید نیز سے برادر شمشیر زن اور گوبھیس (مجنینفیس) دسنے الگ الگ ترتیب دیے گئے۔ گوچمن دستور پٹن کا کام دینا تھا۔ یہ چرخیاں لگی ہوئی گاڑیاں ہوتی تھیں جن پر بھاری پتھر چڑھا کر چرخیاں گھاتی جاتی تھیں اور گولوں کی طرح یہ بھاری پتھر جو امیں لہراتے نشانے پر پھینکے جاتے تھے۔ ان پتھروں سے قلعوں کی فصیلیں اور دروازے توڑے جلتے تھے اور قلعہ پر موجود فوج میں تنکے چماتھا۔

سب سے طاقت ور دستے سواروں کے ہوتے تھے جو آگے آگے چلتے تھے۔ ان کے بعد پیدل پھر توپ خانہ ہوتا تھا۔ سامان کی گاڑیاں سب سے پیچھے رکھی جاتی تھیں۔

جب سب سامان بار کیا جا چکا اور سوار اور پیدل دستے میدان میں صف آرا ہو گئے تو سپہ سالار میسر میں معائنہ شروع کیا اور دستوں کو مختلف قسم کی ہدایات دیں۔

میسر دستوں کو دیکھتا ہوا جب عبید کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ مزملہ عبید کے گھوڑے سے گھوڑا لائے چار جامہ پہنے اور پورا اسلحہ لگائے موجود ہے۔

میسر نے اپنا گھوڑا عبید کے پاس روکا اور مکر کر کہا:

”عبید! اپنی فوجی دوا لھن کو تھام رہا ہوں۔ کچھ دن آرام کر سکے۔ ہم انشاء اللہ بہت جلد فتیاب ہو کر واپس آجائیں گے۔“

عبید نے مزملہ کی طرف دیکھا اور کہا:

”سپہ سالار معظم! میں نے انہیں لاکھ روکا گا کہ میری اپنی خد پر اڑی ہیں اور قاہرہ جانے پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتیں۔ آپ انہیں حکم دیجیے کہ یہ قاہرہ چلی جائیں۔“

مزملہ جو گھوڑے پر بیٹھی کسم۔ ہی تھی اس نے فوراً کہا:

”میرا خیال ہے کہ ہمارے سپہ سالار جام شہادت کے خواہشمند کسی سپاہی کو روکنے کی کوشش نہیں کریں گے پھر بھی میں ان سے درخواست کرتی ہوں کہ مجھے عبید کے پہلو پہلو کافروں کے مقابلے کی اجازت دی جائے۔“

میسر میں دوبارہ مسکرا دیا اور کہا:

”عبید! تمہاری مزملہ ٹھیک کہہ رہی ہے اور ہمارے کسی کو کون روک سکتا ہے۔ ہر چند کہ عورتوں کا ہوا سچا کہ میدان جنگ میں جانا کسی طرح مناسب نہیں پھر بھی میں مزملہ کو اس لیے اجازت دینے پر مجبور ہوں کہ تم اس کے ساتھ موجود ہو۔“

مزملہ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ اس نے حبیب عبید کو چڑانے کے لیے کہا:

”دیکھ! میں نہ کہتی تھی کہ سپہ سالار مجھے ضرور اجازت دیدیں گے۔“

”کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔“ میسر نے مبرا کر کہا:

”لیکن ہماری خواہش ہے کہ مزملہ پچھلی صفوں میں رہے اور بار برداری کی دیکھ بھال کرے۔ خدا نخواستہ اگر میں ضرورت محسوس ہوتی تو ہم اسے ضرور آگے بلوائیں گے لیکن میدان جنگ میں سامان بخور و نوش، دوا اور ارمہ پی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے مزملہ پچھلے دستوں کے ساتھ رہ کر کدوئی ثواب کما سکتی ہے جو اسے الگ صفوں میں مراد لگی دیکھنے پر ملے گا۔“

مزملہ کچھ گئی کہ میسر سے بحث فضول ہے۔ اگر اس نے زیادہ صند کی تو ممکن ہے کہ میسر اسے قاتلہ ہوجھ دیں اور یہی کیصیت سے محروم ہو جائے۔

”سپہ سالار معظم! حکم مرا سکھوں پر۔“ یہ کہہ کر مزملہ نے اپنا گھوڑا موڑا اور الگ صفوں سے پچھلی صفوں میں آگئی۔ میدان میں صفیں درست ہو گئیں تو قلعہ ابلجں قاہرہ کے قلعے سے بج اٹھے۔ یہ سلطان مصر صلیف الدین قطوزی کی آمد کا نشان تھا۔ سلطان بہ نفس نفیس لشکر اسلام کو رخصت کرنے تشریف لارہے تھے۔

قلعے سے اس میدان تک شہریوں کی دورویہ قطاریں بن گئیں۔ زمین پر قلعینیل کا فرش بچھا اور خوشبوئیات بڑی گئیں۔

سلطان نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ اپنی فوج کو الوداع کہنے ڈیڑھ میل کے اس راستے کو پاپیادہ طے کریں گے۔ بائیں جانب شانہ جلوس قلعے سے برآمد ہوا تو اس کی شان دیکھنے کے قابل تھی۔

آگے آگے شاہی علم بردار اور نقیب بادب کا لہرہ لگاتے ہوئے چل رہے تھے۔ نقیبوں کے زرق برق لباس اور کمر میں تیزی پٹیاں عجب بار دکھا رہی تھیں۔ علم کے پیچھے ایک آدمی کے سر پر طلائی صل میں قرآن حکیم رکھا تھا۔

دھاتھ ساتھ علمائے کرام اور قضاہ چل رہے تھے۔ دائیں جانب قاضی تاج الدین شافعی، قاضی صدر الدین سیما فی صنفی، قاضی شرف الدین عوامی اور قاضی شرف الدین محمد بنی تھے۔ اس زمانے میں مصر میں چاروں اماموں کے قاضی دربار میں

نہایت شرف تھے تاکہ بوقت ضرورت ان سے مذہبی مشورہ لیا جاسکے۔

تین بردار کے بائیں جانب سلطان کے امراء اور اعلیٰ ہند سے دار تھے۔ وزیر بہا مال الدین اور وزیر خزائنہ سیلی ملک بنی نمایاں تھے۔ اس کے پیچھے شاہی محافظ دستے کے سوار تھے جنہیں جلوس کے احترام میں پیدل کر دیا گیا تھا۔

ان کے بعد سلطان صلیف الدین قطوزی، سرپرست گھڑی جو امرات سے مرع، کاؤن پر دو آب دار و قنوجن کی چمک سے گھومتے ہوئے تھے۔ وزیر جامہ پر لانا، بانات کا اچکن ناکرت، ہنوں کے بجائے رشتے ہوئے میسر سے ملے تھے۔ ایک غلامی منازکی کی، ہر طرف سے غور تحسین اور نعرہ بکسیر کی ایمان پر در اور ایمان افروز آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

نہایت میدان کے قریب پہنچا تو سپہ سالار اسلام میسر بندہ قدر لاکھوڑا اچکا کر پیشروائی کے لیے آیا۔ گھوڑے

سے اتر کر قرآن بردار کے پاس پہنچا۔ رطل سے قرآن حکیم نکال کر اسے بوسہ دیا۔ پھر واپس رکھا اور علماء اور فضلاء کو
کرتا ہوا سلطان قطوزی کے پاس پہنچا۔

جلوس رک گیا۔

سلطان نے مسکرا کر فرمایا:

”بھیرس بندقدار! سرزمین مصر اور افواج اسلام کو تھماری ہمداری اور حسن تدبیر پر بجا طور پر فخر ہے۔ ہمیں
ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان سفاک مغلوں کے مقابلہ میں کامیابی عطا فرمائے گا جنہوں نے دارالاسلام بغداد اور بیت اللہ
کی پاک سرزمین کی بے رحمتی اور بے گناہ موام قاتل مام کیا؟“

مجمع نے ”آمین آمین“ کی صدا بلند کی۔ کچھ علماء اور قضا نے بھی دلی زبان سے آمین کہی۔

چو فیث طویل القامت سپہ سالار بھیرس بندقدار جس کے بائیں طرف تلوار اور دائیں جانب خنجر گاڑا
نے اظہار تشکر کے طور پر سر کو قدر سے خم کیا اور ادب سے بولا:

”سلطان معظم کے ارشادات سے افواج اسلام کی یقیناً حوصلہ افزائی ہوگی میں سرزمین مصر کے افواج و افواج اسلام کے نمائندے کی حیثیت سے سلطان معظم کو یقین دلانا ہوں کہ حد نظر تک پھیلے ہوئے لشکر کسی ملک کی
کے لیے نہیں جارہا ہے بلکہ اس کا مقصد ان لوگوں کی پامالی ہے جنہوں نے اسلامی سلطنت کے امن و سکون کو تہ
کیا اور بغیر کسی اشتغال کے حکومتوں کا خاتمہ کر کے آبادیوں کو دیرazon میں تبدیل کر دیا۔ ہمیں خدا کی قسم
یقین ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے دشمن پر قابو نہ پا سکیں۔“

”شبابش بندقدار! سلطان بولا:

”لشکر اسلام کے سپہ سالار کو ایسے ہی خیالات کا حامل ہونا چاہیے۔ ہم تم سے بہت خوش ہیں اور اعلان
ہیں کہ جنگ کے بعد ہم سپہ سالار بندقدار کو والی حلب مقرر کریں گے۔“

تمام اکابرین اور مذہبی پیشواؤں نے اس اعلان پر اظہار خوشنودی کیا۔

پھر یہ جلوس اس جگہ پہنچا جہاں سلطان کے بیٹے کا انتظام کیا گیا تھا لیکن سلطان نے بیٹے سے انکار کر دیا
اعلان فرمایا کہ:

”ہم اپنی فوج کے کوچ کے منظر کو کھڑے ہو کر دیکھیں گے اور جب تک پورا لشکر ہمارے سامنے سے گزر نہ
ہم ہرگز نہ بیٹھیں گے۔“

تیسرے نفا سے پرچوٹ پڑے ہی کوچ شروع ہوا اور دستوں میں حرکت پیدا ہو گئی۔

سب سے آگے سواروں کے دستے تھے۔ فوج کی اصلاحت ہی گھوڑ سوار بچے جلتے تھے۔ یوں تو ہر سوار

یہ نیزہ تھا لیکن ان میں بعض دستے خالص نیزہ بردار تھے۔ نیزوں کے علاوہ تیرکمان بھی جنگ میں استعمال ہوتے
تھے۔ کچھ یوں کا توپ خانہ بھی خاص اہمیت رکھتا تھا۔ محاصرہ کے وقت یہ گولہ بھینس بہت مفید ثابت ہوتی تھیں۔

مصری فوج میں ہر اول دستہ ایک ہلکی سی فوج ہوا کرتا تھا۔ یہ دستہ انتہائی تیز رفتار سواروں پر مشتمل تھا۔ جب
پرستہ تیزی کے ساتھ سلطان کے سامنے سے گزرا تو منہ زور گھوڑے قابو میں نہ آتے تھے اور ان کے سوار لگا بے پناہ پھینچ
کر بار بار انہیں روکتے تھے۔

ہر اول کے بعد دوسرے سوار دستے سلطان کے سامنے سے گزرنے لگے۔ ہر اول جیسی ان میں تیزی نہ تھی لیکن جب یہ
راؤنڈار بلند کیے ہوئے مہزین کے سامنے سے گزرے تو لوگوں کے منہ سے بے ساختہ ”اللہ اکبر“ کے نعرے نکل گئے۔ بوٹ سوار
دستے ان کے پیچھے تھے۔ پھر توپ خانہ تھا اور سب سے آخر میں پیدل دستے تھے۔ بار برداری کے پھکڑے پیادوں کے
ماتھے گمران کی حفاظت پر سوار مقرر تھے اور وہ ان پھکڑوں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے چل رہے تھے۔

دوپہ تک افواج اسلام سلطان قطوزی کے سامنے سے گزرتی رہی اور سلطان بغیر کسی تھکاوٹ کے یا آتھابٹ کے
رہے اطمینان سے لشکر کو رخصت کرتا رہا۔ ہر دستہ ایک ٹکے کے لیے سلطان کے سامنے ٹھہرتا، تعظیم پہلاتا۔ پھر آگے بڑھ جاتا
جب یہ دستے گزر گئے تو سپہ سالار مصر سلطان کے پاس پہنچا اور سوار ہونے کی اجازت مانگی۔
سلطان نے اجازت دی۔

وہ فرما ”فرما ہر عالم اور فاضلی کے پاس گیا اور دھلے شیر کا طالب ہوا۔ سب نے اسے دعا دے کر رخصت کی اجازت
دی۔ پھر میرس بندقدار نے درگھڑے ہوئے ایک آدمی کو اشارہ کیا وہ سپہ سالار کا گھوڑا لے کر اس کے پاس آ گیا۔ میرس
نے ایک بار پھر سلطان کو تعظیم پیش کی اور جہت نکال کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

میرس جیسے ہی گھوڑے پر بیٹھا۔ اس کا گھوڑا اسے اس برق رفتاری سے لے اڑا کہ لوگ دیکھتے ہی نہ گئے۔
انہیں دور پر صرف گرد کا ایک گولہ ماد لکھائی دیا اور میرس سب کی نظروں سے اوجھل ہو کر لشکر میں پہنچ گیا۔



میرس بندقدار کو سب سے زیادہ خطرہ پشت کے حملے سے تھا کیونکہ عیسائی و صلیبی اور ٹیڈرس مجرورم کے گناہے
تھیں جو بڑے بیٹھے تھے۔ میرس کو ان قتلوں کے قریب سے گزرنے پڑے۔

اسے اس بات کی فکر تھی کہ کیسے شہل میں لشکر کے چل جانے سے عیسائی فائدہ نہ اٹھائیں اور اس پر پشت سے حملہ
نہ کریں۔

عیسائی صلیبی اس موقع سے مزدور فائدہ اٹھاتے لیکن مشکل یہ آپٹی تھی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہلاکوں کی طرف تاراج کرے۔ ان کے خیال میں مسلمان ان سے بدتر جہاد تھے۔ کیونکہ مسلمان کسی علاقے کو فتح کر کے مسلمانوں کے باشندوں کے مذہب میں قطعی دخل نہ دیتے تھے۔ دوسری طرف ہلاکوں کی فوج میں جو عیسائی شامل تھے ان کے متعلق تمام عیسائیوں کا یہ خیال تھا کہ ان عیسائی ناموں اور ٹیبلوں کی خود اپنی کوئی آواز نہیں اور یہ مغلوں کے کسب غلاموں کی طرح شامل ہیں۔

دوسرا خطہ انہیں یہ تھا کہ اگر مغلوں نے مسلمانوں کے آخری مرکز یعنی مصر کو ختم کر دیا تو وہ پھر یورپ اور افریقہ میں داخل ہو کر تباہی اور بربادی کا طوفان اٹھائیں گے اور یورپ کے شہروں کا بھی وہی حال ہو گا جو بغداد کا ہوا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے (غالباً) کہ مثل اور مسلمان دونوں لڑا کر کمرور ہو جائیں۔ اس وجہ سے انھوں نے اسلامی لشکر کو چھوڑنا مناسب خیال نہ کیا اور لشکر اسلام آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔

ہلاکوں کی واپسی کے بعد مغلوں کا پورا لشکر قطبوغا کے ماتحت آ گیا تھا۔ اس بات سے وہ بہت خوش تھا۔ اپنا خواب پورا ہونا کوئی دے رہا تھا۔ اس نے ہلاکوں کے واپس جلتے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مصر پر قبضہ کرے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دے گا اور بڑا قزم کی غلامی کا جو اسی طرح اندھ پیٹنے کا جی طرح روس کے شہنشاہ بنگالہ نے اتار بیٹھا ہے۔

مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر قطبوغا نے اپنے لشکر کو حرکت دی اور بڑا تیز رفتاری سے بڑھ کر غولیاٹ کے کنویں کے قریب خیمہ زن ہوا۔

اس کے خیال میں یہ بہترین میدان جنگ تھا کیونکہ اس کے چاروں طرف دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ یہ علاقہ عین جاوٹ کا تھا اور غولیاٹ کے سامنے کا میدان بالکل قطبوغا کا میدان کہلاتا تھا۔ قطبوغا نے اس جگہ کو بہت سوجھ بوجھ کے جنگ کے لیے منتخب کیا تھا۔

قطبوغا کو غولیاٹ میں خیمہ زن ہونے بارہ گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ لشکر اسلام کا ہراول خودار ہوا۔ اور میدان جنگ میں آ کر ٹھہر گیا۔

قطبوغا نے ہراول دستوں پر حملہ کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے پورے لشکر کو گھیر کر ہائی لیٹار کر کے کاری ضرب لگائے تاکہ پھر مسلمان قطعی طور پر ختم ہو جائیں اور انہیں دوبارہ سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو کہ مسلمانوں کے ہراول کے بعد آہستہ آہستہ لشکر کے اصل دستے آتے رہے اور میدان میں اترتے رہے۔ صبح سے شام تک مسلمانوں کے لشکر کے آنے کا تا بندھ رہا۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے کہ میرس ہندو کا قلعہ ترکستان میں دشت قبچاق کے علاقہ سے تھا اور اس کا خاندان

پٹیرخان کے حملے کے وقت ہجرت کر کے مغرب کی طرف آ گیا تھا۔

ترک حکومت کے ان ایام میں اس کا خاندان تباہ ہو گیا۔ کچھ توغلوں کے ہاتھوں مارا گیا اور باقی لوگ بردہ فروزون کے ہاتھ پر گرفتار کر لیا گیا۔

میرس اس وقت بچہ تھا کیس خدا نے اسے بڑی دورانہ بستی اور کچھ عطا کی تھی۔ اس نے مغلوں کی جنگ کا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ان کے حملہ کرنے کے تمام طریقوں سے پوری طرح واقفیت حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ مصر میں جو مارتے تھے ان میں سے بہت سے ایسے سپاہی تھے جو مغلوں کے ہاتھوں شکست کھا کر مصر میں پناہ گزین ہوئے تھے۔ وہ لوگ بھی مغلوں کے طریق جنگ سے پوری طرح آگاہ تھے۔

میرس ہندو کا کہ جس وقت اقتدار حاصل ہوا اور وہ سپہ سالار کے عہدے پر فائز ہوا اس نے اپنے لشکر کے غلوں کے جنگی طریقوں سے مشتیں کرائیں تاکہ جب جنگ ہو تو وہ غلوں کے خلاف اپنی طریقوں کو اختیار کرے جو اصل غلوں کے وقت برتتے تھے۔

مغل جلتے تھے کہ مسلمان اور دیگر قومیں پرانے طرز سے جنگ لڑتی ہیں۔ یہ عینہ امیسو اور قلب ترتیب دی ہیں اور وہ غلوں کے وقت قلب پر اس قدر شدید دباؤ ڈالتے تھے کہ ان کا روکنا کسی طرح ممکن نہ ہوتا اور یہ اندر گھس کر بادشاہ کو قتل یا گرفتار کر لیتے۔ کبھی کبھی مغل عینہ اور امیسو (دایاں اور بایاں بازو) پر شدت سے حملہ کر کے اپنے مخالف کی صفوں کا ترتیب بگاڑ دیتے اور بدحواسی پھیلا کر کامیابی حاصل کر لیتے۔

میرس ہندو نے ان تمام باتوں پر اچھی طرح غور کر لیا تھا اور اپنے لشکر کی ترتیب اس طرح کی تھی کہ وہ مغلوں کے تمام حملوں کا تدارک کر سکے۔

صبح نماز کے بعد میرس نے فوجوں کو ترتیب دیا۔ اس نے عینہ پر مصری فوج تعینات کی اور امیسو میں ان مہاجرین کو لڑا۔ جو مغلوں سے انتقام لینے پر آمادہ تھے۔ قلب کو اس نے جان بوجھ کر کمزور کیا تاکہ مغلوں کو اندر آنے کا موقع دیا جائے اور فوج کا بہترین حصہ جو مالک بحریہ کے تیز رفتار سواروں پر مشتمل تھا اسے میرس نے جنگ سے الگ رکھا تھا تاکہ وقت اور اس سے کام لیا جاسکے اور توغلوں (مغلوں کا چھٹا کھلم) کی شدت کم کی جاسکے۔

گوشہ سیتیجی سال کی فوجات نے مغلوں کے جو حصے اس قدر بلند کر دیے تھے کہ کسی کو اپنے برابر تصور نہ کرتے تھے۔ انہیں آج تک شکست کا سامنا نہ ہوا تھا۔ اس لیے ان کا یہ عقیدہ بن گیا تھا کہ مغل متحدین دینار حکومت کے لیے پیدا ہوا ہے۔ یہ بات ان کی مذہبی کتاب "یاسا" میں درج تھی جو تو جیسی جنگی زبان نے لکھوائی تھی جیناچو ایک شاعر تھا جسے ہی قطبوغا نے اپنے خاص دستوں کے ساتھ طوفانی حملہ شروع کیا لیکن خلاف امید اس کا یہ حملہ جلدی نہیں ہونے کے عینہ (دایاں بازو) پر ہوا بیاں پر مصری فوج میں بھرپور قزم کے جوان تھے۔ انہوں نے مغلوں کو

روکا۔ بیبرس کو اس حملے پر قدرے تعجب ہوا مگر اسے اس کا امکان ضرور تھا اور اس نے اس غیر متوقع قسم کے حملے کے
کی کوشش کی لیکن بیبرس نے فوراً اپنی حکمت عملی تبدیل کی اور اس کے اگلے سے معری فوج نے پیچھے ہٹنا شروع کیا
معریوں کے پیچھے ہٹتے ہی مغلوں کے حملے میں اور تیزی آگئی۔ وہ معریوں کو دوڑتے پیچھے دھکیلتے چلے گئے اور معری
میزانہ میں شکست کے آثار پیدا ہو گئے۔

ٹھیک اس وقت بیبرس نے ایک ایسا قدم اٹھایا کہ جسے دیکھ کر قطب بونا حیران رہ گیا۔ اس کے تصور میں بھی نہ تھا
کہ مسلمان فوج وہ قدم اٹھانے کی جواکثر متوقعوں پر عمل اٹھایا کرتے تھے۔

بیبرس خود قلب فوج میں موجود رہا اور اس نے وائیں بازو کی فوج کو جو اس کے حکم سے پیچھے ہٹ رہی تھی فوراً
پیغام بھیجا کہ خطر جانے اور پلٹ کر حملہ کرے۔ دیکھتے ہی دیکھتے معری فوج جو بظاہر شکست کھا رہی تھی ایک دم ایسا ہلکا
پر پٹری اور پھر پلٹ کر اتنا زبردست حملہ کیا کہ قطب بونا کو پسینہ آ گیا۔

وہ حیرت سے اس فوج کو دیکھ رہا تھا جو کچھ دیر پہلے شکست کھا کر بھاگنے کو تھی لیکن اب اس نے پلٹ کر
ایسا حملہ کیا جیسے وہ تازہ دم لشکر ہو۔

قطب بونا نے منبصل کر اس غیر متوقع حملے کو روکا لیکن اب حملہ کرنے کے بجائے اسے مدافعت کی جنگ لڑنا پڑی
تھی کیونکہ معری فوج برابر دباؤ ڈال رہی تھی۔

پلٹ کر اور چھیٹ کر اس طرح کے حملے کو تو بونا کستے تھے۔ یہ خالص مغلوں کا ابداع کر دہ تھا مگر بیبرس نے آج
اس طریقے کو خود انہی کے خلاف استعمال کیا تھا۔

قطب بونا نے معریوں کی اس پلٹ اور چھیٹ کو بڑی مشکل سے روکا مگر اب اس پر دوسری مصیبت پڑی اور
وہ بھی پشت کا حملہ۔

بیبرس کے اشارے پر ملکوں کے غنودہ دستے جنہیں جنگ سے الگ رکھا گیا تھا۔ وہ بادوباراں کی طرح متحرک
ہوئے اور آندھی اور طوفان کی طرح قطب بونا کی پشت پر غوردار ہوئے۔ قطب بونا کو اس حملے کا خیال بھی نہ تھا۔ یہ حملے
اس کی فوج گھیرے میں آ گئی۔

آگے معری فوج، پیچھے ملکوں کے دستے۔ منہ گھبرا گئے اور قطب بونا کی ہزار کوشش اور کھینے سننے کے باوجود ان
کے قدم میدان میں نہ جم سکے اور وہ مدحواس ہو کر میدان چھوڑ چکے۔

ادھر قطب بونا کے دستے بھاگے۔ ادھر مغلوں کی بغیر فوج کو۔ بیبرس اور صاحب لشکر نے ہمارے رکھ رکھاؤ کی
زیادہ دہرہ بھر کے اور ان کے قدم بھی اکٹھے ہو گئے۔ قطب بونا کے گرجستانی اور ازبکی دستے بالکل یکاریا ہوتے۔
اللہ اکبر کے خلف شگاف غرور سے اس دھاگو کا ٹکڑے ٹکڑے مسلمانوں کو مغلوں پر پہلی بار کامیابی حاصل ہوتی تھا۔

جن کی اڑتیس سال میں یہ پہلی شکست تھی۔

ہزاروں مغل میدان جنگ میں مارے گئے۔ کچھ گرفتار ہوئے اور باقی جان بچا کر ایسے بھاگے کہ انہیں پلٹ کر
دیکھنا جنگ کو دیکھنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔
مغلوں کا سپہ سالار جس پر ہلاک خان کو ناز تھا اور جو مغلوں کی طاقت کا محور و مرکز تھا، زندہ گرفتار ہوا۔



قطب بونا گرفتار ہو کر بیبرس بند قدار کے سامنے پیش کیا گیا تو بیبرس نے پوچھا:

قطب بونا: اس جنگ میں ہماری فتح کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

قطب بونا اگر کڑ کر بولا:

”یہ غرض ایک اتفاقیہ فتح ہے۔ شام سے قراتر ہم مغلوں کا لشکر پھیل چکا ہے۔ یہ ایسا انتقام لیں گے کہ
لاٹھر بھر باد رکھیں گے۔“

بیبرس کو اس کے ڈینگ مارنے پر ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا:

”اگر یہ غرض اتفاق تھا تو جھگڑ خان کے وقت سے اب تک اس طرح کا اور کوئی اتفاق کیوں نہ ہوا کہ تم تو شکست
ہائیک بھول گئے تھے۔“

”ہم اسے شکست تسلیم نہیں کرتے۔“

قطب بونا پھر اکر لایا:

”ہلاک خان کو کچھ ہی اس کی خبر مل جائے گی اور وہ دنیا لشکر لے کر تم سے بدلہ لینے آئے گا۔ پھر تم اور تمہارا دل و تناع
فیلے گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے پکچا جائے گا۔ مغل شہسوار معری ریت اپنی زمینوں کی قبیلوں میں بھر بھر کر لے
لینگے۔“

”ہمیں انھیں ہے کہ ہلاک خان ہم سے مقابلے کے بجائے تمہیں دھوکہ دے کر قراتر بھاگ گیا۔“ بیبرس نے
لاٹھر بھر باد رکھیں گے:

”وہ جانتا تھا کہ معر کو فتح نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اس نے اپنی جان بچائی اور تمہیں قربانی کا بکرانہ ہمارے
لاٹھر بھر باد رکھا۔“

”نہیں۔ ہلاک بزدل نہیں۔ قطب بونا غرور سے بولا: ”وہ قراتر میں شکست کے لیے قراتر گیا ہے۔“

تم بھی میرا عیبید!

میرس نے انابک کو اشارہ کیا۔

اس کی تلوار چمکی اور منغل سپہ سالار قبا بوغا کا سر فریش خاک پر پڑھکنے لگا۔



میرس، قبا بوغا کی پُر غرور باتوں پر مسکرایا اور کہا:

"اچھا قبا بوغا۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔"

"جو چاہے کرو مجھے اس کی پروا نہیں۔ قبا بوغا بگڑ کر بولا۔

میرس نے زری سے پوچھا:

"تم گرفتار ہونے والوں سرداروں کے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے؟"

"قتل!" قبا بوغا نے کہا:

"تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور ہمارا عیب بیٹھ جائے۔"

"جھٹیک ہے قبا بوغا، میرس نے کہا:

"تم نے اپنی سزا خود ہی تجویز کر دی لیکن مطمئن رہو۔ ہم تمہیں ہاتھی کے پیر کے نیچے کھال میں بند کر کے زندانیوں کے اور نہ ہی یوسف سلجوقی کی طرح تمہاری بوٹیاں کاٹ کے تمہارے منہ میں ڈالیں گے۔ ہم تمہارے سر کو بڑے احترام سے نیزے پر چڑھا دیں گے اور پھر یہاں سے معرکہ اس کی نمائش ہوگی۔ یہ عزت افزائی تمہیں ضرور پسند آئے گی۔ کیوں قبا بوغا؟"

قبا بوغا نے کوئی جواب نہ دیا۔

میرس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سناٹے عبید اور جلال الدین انابک سر جھکاتے کھڑے تھے۔ میرس نے جلال الدین انابک کو مخاطب کیا:

"جلال الدین، تم مجھ سے پاس ایک شہید خاتون کا پیغام لائے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کی بے چین روح کو تم قبا بوغا کا سر نذرانہ کے طور پر پیش کرو۔ ہمیں امید ہے کہ یہ حقیر نذرانہ ضرور قبول ہوگا۔ انصوبی کہ ہاگو ہمارے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا ورنہ ہم اس کے سر کا نذرانہ پیش کرتے۔"

جلال الدین انابک ایک قدم آگے بڑھا اور قبضہ شمشیر پر ہاتھ رکھا۔ اس وقت عبید سے نہ رہا گیا۔ اس نے

ادب سے کہا:

"میر سالار اعظم! مغلوں نے بیت المقدس کی بے حرمتی کی ہے۔ اس لیے اس کافر کا قلم کرنے کی سعادت ہے عطا کی جائے۔"

بے شک۔ بے شک! ہم بیت المقدس کی بے حرمتی کا بھی انتقام لیں گے۔"

میرس یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا:

"اور وہ انتقام لیا جائے گا ہاگو خان سے۔ اگر ہاگو ہمارے مقابلے پر آ گیا تو خدا کی قسم! اس کے سر نذرانہ لے کر ہم اس مسجد میں ضرور جاؤں گے جہاں امام اور مؤذن کے لبوں پر ضرب لالہ لالہ کو توڑنے کی کوشش ہو رہی ہے۔"

قبا بوغا کا سر ایک بانس پر نصب کیا گیا۔ وہ قبا بوغا جیسے یقین تھا کہ اس نے جو ڈینگاری ہے وہ ضرور پوری ہوگی مگر ایسا نہ ہوا۔

میرس بند قدار فتح کے ڈنگے بھجائے قاہرہ پہنچا۔ سلطان سیف الدین قطوزی اور مصری عوام نے اس کا اس قدر فخر استقبال کیا جس کی مثال قاہرہ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

عین جلالت کے میدان میں جو منگل گرفتار ہوئے تھے میرس انہیں قید کر کے اپنے ساتھ قاہرہ لے آیا تھا۔ ان مغلوں کو شہر کی گلیوں میں پھرا گیا۔ اہل قاہرہ نے دیکھ دیا کہ وہ منغل جنہیں کبھی شکست نہ ہوئی تھی، انہیں شکست دے کر منتشر کر دیا گیا ہے۔ مصری کیا، تمام اسلامی شہروں میں عین جلالت میں مغلوں کی شکست پر خوشی کے شادیانے بجاتے گئے اور نکلنے پڑھنے لگے۔۔۔۔۔ لیکن میرس کو پھر قاہرہ چھوڑنا پڑا۔

سلطان سیف الدین نے اس کو حکم دیا کہ مغلوں کا تعاقب کر کے انہیں بلاد شام سے نکال باہر کیا جائے۔ میرس نے بے پناہ چالاکی بلکہ مع لشکر کے میدان جنگ کا رخ کیا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ حکم میرس کو میدان جنگ ہی میں ملایا تھا۔ سلطان مصر نے اسی حکم کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ اگر میرس مغلوں کو شام سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ملک کی حکومت اسے بطور انعام عطا کی جائے گی۔

میرس کا لشکر اس وقت مغرور و منصور تھا اور سب ہی مغلوں سے انتقام لینے پر تھے ہوئے تھے۔ چنانچہ میرس غولوں کے دستوں کے ساتھ مغلوں کی باقی ماندہ فوج کو بھگانے کے لیے آگے بڑھا۔ جھگڑے ہوئے مغلوں نے کئی بار پلٹ پلٹ کر میرس پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اس طرح میرس انہیں مارا تا کاٹتا دریاے فرات تک پہنچ گیا اور میدان مغلوں کی دست برد سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔

اسی کام سے فارغ ہو کر میرس مصر واپس آ گیا۔

سلطان قطوزی نے مظاہر اس پر بڑی خوشی کا اظہار کیا مگر وہ دل ہی دل میں میرس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف و تاراج کے تمام عوام و خواص میرس کو دم بھرتے تھے۔ قطوزی کے ہوا خواہوں نے جتنی پرتیل کا کام کیا۔ قطوزی کچھ اس قدر

بخش ہوا کہ اس نے اپنے اعلان کردہ انعام کا بھی کچھ خیال نہ کیا اور طلب کی حکومت بھٹکے اپنے سپہ سالار میرس کے والی موصل کے ایک بیٹے علاؤ الدین کو دے دی۔

میرس کو اس کا بہت رنج ہوا۔ اسے تو طلب کی حکومت کے علاوہ اور زیادہ انعام و اکرام کی توقع تھی۔ سلطان عمر کی اس بدعہدی پر میرا یاد اور ملک بھڑک اٹھے۔ ان کا خلاف ہو جانا درست تھا کیونکہ مغلوں کو شکست دے دوچار کرنے میں ملک و دستوں اور ان کے سردار میرس کا سب سے بڑا ہاتھ تھا۔

سلطان نے ایک نادانی یہ بھی کی کہ اپنے سرداروں کو تو مال غنیمت سے خوب نوازنا لیکن میرس کی طرف کچھ نہ دی بلکہ اس نے میرس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیروں پر غور کرنا شروع کر دیا لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی اور ملکوں نے خود اسے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹا دیا۔

قطوزی کے قتل پر چاوشوں نے مرلے مرلے لٹکارنا شروع کر دیا: "مسلمانا قطوزی کی روح کی بخشش کی دعا کرو اور اپنے سلطان میرس ہندو کی درازی ٹھری دعا مانگو۔" میرس نے اپنی امارت کے زلے میں میرس کی بڑی خدمت کی۔ پھر اس نے جبرے وقت میں دینے لگا۔ کو بچایا۔ وہ عام انسان میں اس قدر مقبول ہو گیا کہ سلطان قطوزی کے قتل کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور سب اسے بخوشی اپنا امیر اور سلطان مقرر کیا۔

میرس نے سلطان عمر ہوتے ہی مغلوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان سے مسلمانوں کی گون ہوشی جھاکو خان گردش کرنے لگا اور لوگ جوق جوق لشکر میں شامل ہونے لگے۔



ہاگو قراقرم واپس جانے لگا تو اس نے تیر رفتار قاصد کے ذریعے اپنے جانیوں کو پیغام بھجوایا کہ وہ قتل میں شرکت کرنے قراقرم آ رہا ہے۔

اس نے اپنے گھوڑوں کے گلے اور خیمہ و خگاہ کے ساتھ شیل کا رخ کیا لیکن اب واپسی کے متعلق صلاح و غور دینے کے لیے اس کے پاس میرا یاد اور جیسا کوئی مقلد موجود نہ تھا۔ اس کی بیوی دو قوز خاتون عیسائی بہنیں تھیں اور بڑا بد دل سے قراقرم واپس جا رہی تھی۔ اسے اس کے عیسائی سردار حصہ رائیڈ ہر وقت یاد آتا رہتا اور جب وہ اپنے متحرک عبادتی چیل میں بیٹھ کر عبادت کرتی تو پتہ نہیں کسی کی یاد میں اس کے آنسو نکل آتے۔

ہاگو خان کی حسین محبوبہ جلیشیا بھی راستے میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ اب وہ خود ہی راہرو اور خود ہی اپنا راہر تھا۔

ہاگو خان گھاس موکھ سے پیسے ہی قفقاز کے کنارے شمال کی طرف چلا۔ اب وسطی گرا تھا اور تہریز کے علاقے میں بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے قراقرم پیچھے کی اطلاع بھجوا دی تھی اس لیے تہریز قراقرم سے سفر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

اس نے سوچا کہ وہ جس طرح قراقرم سے ہٹتا گاتا، دو عیسائی اڑانا ہوا روانہ ہوا تھا اسی طرح آہستہ آہستہ قراقرم واپس جائے گا لیکن باوجود اطمینان کے اس کا دل اندر سے خود بخود ادا تھا۔

وہ دو قوز خاتون پر بہت مہربان نظر آتا۔ دو قوز بھی پیریانی میں کوٹنا ہی نہ کرتی لیکن ہاگو خان کی ظلوٹوں اور عیشیہ کے جس لذت و رونے سمجھا تھا اس کی تباہی کو دو قوز خاتون بجائے بڑھانے کے اور دم کر دیتی اور ہاگو خان بے کیفی کا شکار رہتا۔

ادھر کچی دن سے ہاگو خان کے جاسوس سوار اسے برابر اطلاع دے رہے تھے کہ شمال کی اونچی پہاڑیوں پر کچھ پر اسرار ساتھی متحرک نظر آتے ہیں جیسے وہ اس کے لشکر کا تعاقب کر رہے ہوں۔

پہلے تو ہاگو خان نے اس اطلاع کو قفقے کے گہرے مان میں ڈبو دیا لیکن جب یہ خبریں اسے روز بپہانی ملنے لگیں تو ایک دن وہ ان مایوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا لیکن مایوں کو کس نے پکڑا ہے۔ سائے تو بس ملتے ہوئے ہیں۔ انہیں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دیکھا جاسکتا ہے لیکن انہیں گرفت میں لینا ناممکن ہے۔

ہاگو خان تمام دن شمال میں گھوڑا بھاگے ڈھیرتا، لیکن نہ کوئی سایہ ملا اور نہ دکھائی دیا۔ وہ شا آ کو ٹھک ہار لے واپس آ گیا۔ اسے بخروں پر سخت غصہ تھا۔

اپنے نیچے پر واپس آتے ہی اس نے مخدوں کے سردار کو بلوایا اور اسی قدر چپکا کر کہ انہیں چھٹی کا دو دھریاد لایا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے دو قوز خاتون پر الزام لگایا کہ وہ مخروں سے سازش کر کے اس کے سفر کو التوا میں آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ دو قوز خاتون خوب چھوٹ چھوٹ کے روئی مگر ہاگو خان کا دل اس کی طرف سے اپن نہ ہوا۔

اب ہاگو خان کے نیچے کے سامنے یہ ہنگامہ برپا تھا کہ تمام کے دھندلے میں جنوب کی سمت ایک سوار گرد رہا ہوا اور ہوا۔ اس کی رفتار دھڑ سے زیادہ تیز تھی۔

ہاگو خان کو نہ والے کو سمجھت اور خوشی کے طے جملے جذبات سے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ اور زیادہ غریب ہوا تو اپنے اوپر قابض رکھ رکھ کا اور خوشی سے چیخ کر بولا:

"میں مغلوں کا مقتدر ہے۔ قتل ہونا کا یہ قاصد ہمارے لیے خوشی اور کامرانی کا پیغام لے کر آ رہا ہے۔ ہاگو کی آواز لوگوں کی حیرت میں کمی آ گئی اور ان کے چہرے مسرت سے کھل اٹھے۔

سوار ہاکو خان کے خیمے کے سامنے آکر رہا۔ اس کا سامنہ پھولا ہوا تھا اور چہرہ گرد اور پسینے میں لکھڑا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے گھوڑے سے اترا۔ پہلے دو زانو ہو کر بیٹھا پھر سجدے میں گر گیا۔
 "مراٹھا و مغل سوار کیا یہ چ نہیں کرتے؟ تم قتل بوجھا کے شکر سے آ رہے ہو؟" ہاکو خان نے مرمت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

سوار نے سجدے سے سر اٹھایا اور پشمرہ آواز میں بولا:

"یہ درست ہے شاہ عراق و فارس! میں قتل بوجھا کا لشکری ہوں لیکن...."

ہاکو خان نے اسی کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

"لیکن کیا؟ کیوں نہیں کہتے کہ ہمارے ہمار سپہ سالار نے مصریوں کے پرچے اڑا دیے؟"

"یہ بھی درست ہے اہل خان! سوار نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا:

"سپہ سالار قتل بوجھا نے جوان مردی کا بے مثال مظاہرہ کیا!"

"شاباش قتل بوجھا! ہاکو خان خشکی سے بولا:

"ہم نے اسی لیے تو اس جبار کے سپرد اپنا لشکر کیا تھا!"

"لیکن اب لشکر وہ لشکر نہیں رہا۔ سوار کو بھی جیسے غصہ آ گیا اور اس نے ہاکو خان کو دو ٹوک جواب دیا۔

ہاکو خان کو زندگی میں شاید پہلی بار بھر جھری آگئی۔ اس کا لہجہ بدل گیا اور اس نے نرم آواز میں پوچھا:

"کیا کہہ رہے ہو سوار! لشکر کو کیا ہوا؟"

"مغل لشکر شکست خاں کھا کر منتشر ہو گیا۔ سوار نے اور وضاحت کی:

"ہماری فوج بھیڑ بکریوں کی طرح بھگادی گئی۔ سپہ سالار قتل بوجھا قتل کر دیے گئے۔"

ہاکو خان کا رنگ اڑ گیا۔

اس کے چہرے پر اس طرح سیما ہی پھیل گئی جیسے کوئی خون کی مہرخی کھینچ لے۔ اس نے آسمان کی طرف نظر

اٹھائی اور بولا:

"اے نیلے آسمان پر منڈلانے والی رُحو! یہ میں کیساں رہا ہوں۔ وحشی مغل تو تمدن دنیا پر حکومت کرنے

کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔ پھر یہ شکست کیوں ہوئی؟ قتل بوجھا کیسے مارا گیا؟"

جب ہاکو خان کو جادوئی نیلے آسمان سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے موالیہ نظروں سے سوار کو دیکھا۔ سوار

اس کا مطلب سمجھ گیا اور بولا:

"اہل خان۔ ہمارے لشکر نے مسلمانوں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا مگر وہ مسلمان نہیں معلوم ہوتے تھے۔"

میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مخلوق سے محل ہی لڑ رہے ہیں۔ ان کا سپہ سالار۔ میرس بندقدار ہم پر ہمارے ہی طریقے
 سے حملہ آور ہوا۔"

"وہ کیسے؟" ہاکو نے ایک مرد آہ بھرتے ہوئے سوال کیا۔

"انہوں نے مخلوق کا 'تو لغزہ' ہمارے خلاف استعمال کیا۔"

"کیا واقعی؟" ہاکو خان کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

ہاکو خان کے لشکر میں یہ خبر پھیلی تو ایک کلام چلی گئی۔ کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ مغل شکست کھا سکتے ہیں۔

لیکن یہ ایک حقیقت تھی جسے تاریخ عالم کو بہ حال تسلیم کرنا پڑا۔



مسلمانوں کے مقابلے پر مخلوق کی یہ پہلی شکست ایسی نہ تھی جو جنگل کی آگ کی مانند اطراف عالم میں نہ پھلتی۔

نہ جڑے ایران و فارس کے ایوان لڑنا تھے۔ ڈوئل یورپ پر سکنتہ طاری ہو گیا عالم اسلام کو خود بھی یہ معجزہ ہی معلوم

نہ تھا۔

جس وقت یہ خبر جنگیز کے پوتے بر قانی خان کو پہنچی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جب سے دارالاسلام بغداد

لگاتاری کا واقعہ ہوا تھا بر قانی خان شرمندہ شرمندہ تھا۔ وہ اب مسلمان بوجھا کا تھا اس لیے اسے یوں محسوس ہوتا تھا

یہ بغداد کی تباہی کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ اس کا دل ہر وقت خون کے آنسو رو یا کرتا تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا

اور ہاکو خان سے انتقام لینا چاہتا تھا۔

ایک موقع اسے اس وقت ملتا تھا آیا تھا جب ہاکو خان نے اپنے خیمے کے دیر سے قفقاز کے جنوب میں لگا کر

دال ایک رصد گاہ قائم کی تھی۔ اس نے اسی وقت ایک سخت خط ہاکو خان کو بھیجا تھا جو اعلان جنگ کے مترادف تھا

تھا۔ ہاکو خان اس توہین آمیز خط کو پکڑ گیا اور بغیر بر قانی خان کے مقابلے پر آئے جنوب کو روانہ ہو گیا تھا۔

بر قانی خان کو علم تھا کہ ہاکو خان جنوب سے واپسی پر ضرور اس پر حملہ آور ہوگا۔ اس لیے اس نے تیاریاں شروع

کر لی تھیں اور پندرہ ہزار صبار رفتار سواروں کو جوڑی سرحدوں پر بھیج دیا تھا لیکن اسے ہاکو خان سے مقابلے کی

نوشت نہ پیش آئی۔۔۔ اور مغل لشکر مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا کر تباہ ہو گیا۔ پھر بھلا اسے اس خبر سے

خوش نہ ہوئی۔ اس مزہ جافرا سے تو اس کا پیٹوں خون بڑھ گیا تھا لیکن اس شکست کی خبر لانے والی ہستی

نوی مشکوک اور برا مرام تھی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ:

ایک شام جب خاقان اور شمشادہ مغرب برقی خان اپنے نیم پختہ محل سے نکل کر دریا کے کنارے میر کر رہا تھا تو اسے ایک جاسوس کی گرفتاری کی اطلاع دی گئی۔

برقانی خان نے حکم دیا کہ جاسوس کو اس کی واپسی پر پیش کیا جائے۔ برقانی خان اپنے بڑے بھائی سامیں باؤ خان کی حیات ہی میں مسلمان ہو گیا تھا اور اس نے اسلامی طرز زندگی اختیار کر لیا تھا اس کے شمشادہ ہونے کے بعد تقریباً ایک لاکھ مغل اور تمار بھی مسلمان ہو گئے۔ اس طرح کھڑستان روس میں ایک چھوٹا سا اسلامی مرکز قائم ہو گیا تھا۔ شام کو جب جاسوس کو دربار میں پیش کیا گیا تو دربار کا فوری مشغول سے منور ہو رہا تھا۔ بیچ دربار میں ناز کے لیے صفیں بچھائی گئی تھیں۔ یہ نماز مغرب کا وقت تھا۔ بلا تیز درجہ و عہدہ تمام مسلمان نماز میں شریک تھے۔ ہر ان گہرا سکوت طاری تھا۔ سوائے پیش اماں کے اور کوئی آواز سنانی نہ دیتی تھی۔ فرض کی ادائیگی کے بعد صفیں بے ترتیب ہوئیں اور نمازیوں نے سنتیں اور نفل ادا کیے۔

اس اجماع افسردہ منظر کو دیکھ کر دربار برقانی سے وابستہ غیر معمولی امیر اور سردار اسلام کے شکوہ و ملال کے دل ہی دل میں فائل ہوئے جا رہے تھے۔

نماز ختم ہوئی تو لوگ منتشر ہو کر پھر اپنے اپنے مقام پر پہنچ گئے اور باقاعدہ دربار لگ گیا۔ برقانی حکم پر جاسوس کو گرفتار کرنے والے مفت سوار ایک نقاب پوش کو لے کر آئے۔ نقاب پوش نے برقانی خان کے سامنے پہنچے ہی اپنے سر کو ذرا سا جھکا کر کہا:

”اسلام علیکم! اے شمشادہ مغرب!“

برقانی خان کی نظریں پہلے ہی اس پر جمی ہوئی تھیں۔ سلا کی آواز پر وہ چونکا اور آہستہ سے کہا:

”وعلیکم السلام!“

پھر قدر سے رک کر بولا:

”اے نقاب پوش خاقان! اگر تو مسلمان ہے تو پھر ہمارے سامنے اس نقاب کی کیا ضرورت ہے؟ تو بے

نقاب الٹ دے۔“

تھام کر دربار کی نظریں سمٹ کر نقاب پوش خاقان پر مرکوز ہو گیا۔ لیکن اس کی طرف سے کسی رد عمل کا اظہار نہ ہوا۔ برقانی خان نے کوئی جواب نہ دیا کہ کہا:

”تیری خاموشی یہ ظاہر کرتی ہے کہ تو مسلمان نہیں ہے۔ بہر حال تو جو کوئی بھی ہو ہم تجھے یقین دلاتے ہیں کہ اگر بے گناہ ہوئی تو تجھ سے کوئی تعارض نہ کیا جائے گا۔ ہم تجھے عزت سے تیرے گھر پہنچا دیں گے کیونکہ ایک

عمران کی نظر میں رعیت کی ہومیٹیاں، خود اس کی اپنی ہومیٹیاں ہوتی ہیں۔ اب بتاؤ اپنی صفائی میں کیا کہتی ہے

برقانی خان کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ نقاب پوش خاقان نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا نقاب اتار چھڑکا اور

زاریہ آواز میں بولی:

”بے شک میں مسلمان ہوں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ مجھے بے دین سمجھا جائے۔“

خاقان نے نقاب کیا الٹا گو بادل سے چاند نکل آیا۔

تفقا زکی حسین ساحرہ جلیشا کے رخسار شدت جذبات سے گل ناز ہو رہے تھے۔ اس کے کانوں میں بڑے ہلنے میرے کے آدینے مشغول کی روشنی میں گردن کی حرکت کے ساتھ طرح طرح کے رنگ بکھر رہے تھے۔ قات کی راہ کے حسن سے تھما اور بامہبت ہو کر رہ گیا۔ متقی بزرگوں کے لبوں اور داڑھیوں میں حرکت سی پیدا ہوئی جیسے وہ زرباب قدرت کے اس دلفریب اور دل نواز شاہکار کو دیکھ کر قادی مطلق کی صفت گری کی تعریف میں سبحان اللہ کہہ رہے ہوں۔

ایک لمحے کے لیے تو دربار میں ایسا سکوت طاری ہوا جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو۔ شمشادہ برقانی خان بھی اس کے حال ہلا کر اسے بڑا متاثر ہوا مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھالا اور بولا:

”الحمد للہ کہ تو مسلمان ہے۔ تیرا نام کیا ہے؟“

”جلیشا“ جواب دے کر جلیشا نے سر جھکا لیا۔

”تو کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور کہاں کی رہنے والی ہے؟“ برقانی نے دلچسپی سے پوچھا۔

لیکن جلیشا کے جواب دینے سے پہلے سرانے برقانی (دارالحکومت) کے صدر قاضی سیف الدین نے برقانی کو ٹوک دیا۔ انھوں نے شاہی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے پروتھا رانداز میں کہا:

”اے شمشادہ مغرب! آپ نے شریعت کے مطابق اور اپنے حکم سے مختلف لوگوں کو مختلف عہدے تفویض کیے تھے۔ کیا آپ نے وہ حکم واپس لے لیا ہے؟“

”نہیں۔ ہرگز نہیں۔ آپ کو یہ گمان کیسے ہوا قاضی صاحب؟“ برقانی خان نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

قاضی صاحب نے اسی وقار سے جواب دیا:

”اگر شمشادہ نے وہ حکم واپس نہیں لیا تو انہیں یاد ہونا چاہیے کہ خود ان کے حکم سے دارالحفاظ سرانے قاضی کا صدف قاضی میں ہوں قاضی سیف الدین۔ اسی لیے صدر قاضی کی موجودگی میں شمشادہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی مشکوک ہستی کے حکم سے کوئی سوال کرے۔ یہ مقدمہ میں سنوں گا اور فیصلہ بھی میں ہی کروں گا۔“

قاضی صاحب کے اس بے باکانہ انداز سے دربار میں سنا چکا گیا۔ دربار میں بڑے بڑے علما کے بزرگان دین موجود تھے۔ انہوں نے لاریب۔ لاریب (بے شک) کہہ کر قاضی صاحب کی تائید کی۔ شمشادہ برقانی خان کا سر قاضی کے دلیرانہ انداز گفتگو سے جھک گیا تھا۔ اس نے گردن سیدھی کر کے کہا:

”قاضی صاحب ہم معذرت خواہ ہیں۔“

پھر برقانی خان نے جلیشا کو مخاطب کر کے کہا:

”جلیشا، صدر قاضی کی موجودگی میں ہم تمہارا مقدمہ سننے سے معذور ہیں۔“

یہ کہہ کر برقانی خان نے جلیشا کو پکڑ کر لانے والوں کو اشارہ کیا اور جلیشا کو صدر قاضی کے سامنے پہنچا دیا۔

صدر قاضی نے کہا:

”خاتون! تم نے اپنا نام جلیشا بتایا ہے۔ تمہارے نسب اور سکونت کو پوچھنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ انصاف نہ تو نسب و سکونت کے پتھروں سے ٹھوکر کھاتا ہے اور نہ متاثر ہوتا ہے۔ انصاف صرف تمہارے صفاتی کے بیان سے متاثر ہوگا۔ ہاں جلیشا! ہمیں بتایا گیا ہے کہ تم سرانے برقانی میں مشکوک حالت میں داخل ہوئی تھیں اور تم نے صدر دروازے کے ناظم کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔“

جلیشا نے بڑے صاف اور واضح الفاظ میں جواب دیا:

”محترم قاضی صاحب! یہ ٹھیک ہے کہ جب میں سرانے برقانی میں داخل ہوئی تو میرے گھوڑے کی رفتار اتنا تیز تھی۔ اگر تیز رفتاری کو مشکوک کہا جاتا ہے تو میں ضرور مجرم ہوں۔“

”پھر تم نے صدر دروازے کے ناظم کے حکم کی تعمیل کیوں نہیں کی؟“ قاضی صاحب نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

جلیشا نے فوراً جواب دیا:

”اس کے لیے بھی میرا پسند ہی جواب ہے۔ صدر دروازے کے پہرے داروں نے مجھے رک جانے کا حکم دیا لیکن میرے گھوڑے کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ اس پر قابو پانے میں مجھے کافی دیر لگ گئی۔ جب میں نے گھوڑا رکاوٹ مخالف سوار میرے قریب پہنچ گئے اور مجھے حراست میں لے لیا۔“

”کیا اس قدر تیز رفتاری کا تمہارے پاس کوئی جواز ہے جبکہ شہر میں داخل ہوتے وقت رفتار کو کم کر لیا جاتا ہے۔“ قاضی صاحب نے بڑا منطقی قسم کا سوال کیا۔

درباروں کو شبہ ہوا کہ اب خاتون ضرور جواب ہو جائے گی لیکن حسین خاتون پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اس نے بڑی جرأت سے کہا:

”جی ہاں۔ اس برقی رفتاری کی وجہ جو ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ شہر میں داخل ہوتے وقت گھوڑے کی رفتار

کما دینی چاہیے لیکن جو خرمی شمشادہ مغرب کو سنا جا رہی تھی، وہ اس قدر اہم اور خوش کن تھی کہ میں نے ایک راجہ اہل کی تصدیق پر ولولہ نہ کیا۔

اہم اور دل خوش کن خبر کے الفاظ پر ہر ایک کے کان کھڑے ہوئے۔ برقانی خان بھی خاتون کو غور سے دیکھنے لگا۔ صدر قاضی نے پوچھا:

”وہ کون سی اہم خبر تھی جس نے تمہیں حکومت کے ایک قانون کو توڑنے پر مجبور کر دیا۔“

جلیشا کے چہرے پر ایک ایسی چمک پیدا ہوئی جس نے اس کے صدمہ میں اور اضافہ کر دیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

”قاضی صاحب! پہرے داروں نے بھی مجھ سے یہ سوال کیا تھا لیکن میں چاہتی تھی کہ اس خبر کو شمشادہ مغرب کے کانوں تک پہنچا دے۔ پہلے پہنچانے کی سہولت حاصل کروں۔ اب چونکہ میں شمشادہ کے حضور میں ہوں اس لیے اس کے اہل میں کوئی فتنہ نہیں۔ وہ خبر ایک مزدوم ہے ان مسلمانوں کے لیے جس کے دل بغداد کی تباہی پر آج بھی خون کے آنسو روتے ہیں۔ مزدوم جو افسوسہ دہل کو کہ ہلاک خان کے سپہ سالار قلعہ بھانے معری لشکر کے ہاتھوں شکست فاش کھائی اور قلعہ بھانے لشکر کو ہلاک کر دیا گیا۔“

خاتون کے اس اعلان پر پورا دربار سرست سے جھوم اٹھا۔ ہر طرف سے الحمد للہ! الحمد للہ! کی صدا میں بلند ہونے لگیں۔ شمشادہ مغرب خوشی سے پاگی سا ہو گیا۔ اور اپنی مسند پر کھڑے ہو کر چیخ اٹھا:

”الحمد للہ کہ مسلمانوں نے بغداد کا بدلہ لے لیا۔“

صدر قاضی اس قدر بے چین ہوئے کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جلیشا کے پاس پہنچے۔ انہوں نے فرط مسرت سے جلیشا کی پیشانی کو چوما اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

جلیشا بھی جذبات سے اس قدر خلیب ہو رہی تھی کہ صدر قاضی کے سینے سے ایسے چٹ گئی جیسے کوئی میچی آگ بجڑے ہوئے پپ سے ایک دت کے بدلتی ہے۔ اس کے اٹک رواں ہو گئے۔ پہلے اس کی سسکیاں اُبھریں پھر جیچہ بھج کدو نہ لگی۔

ہر درباری کی آنکھیں صدمت کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ قاضی صاحب نے بڑی مشکل سے خود کو جلیشا کی گرفت سے آزاد کر لیا جلیشا ان سے چمٹے بے تاملوئے جے جا رہی تھی۔

پہلے تو قاضی صاحب اور دیگر لوگ ہی سمجھتے رہے کہ جلیشا پر خوشی کا دورہ پڑا ہے مگر جب اس کا ردنا کسی طرح بلند ہوا تو قاضی صاحب اور برقانی خان پریشان ہونے لگے۔ خود برقانی خان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے چھری رن لگی جلیشا تھی کہ بس دوسے جا رہی تھی جیسے ندی کا بند ٹوٹ گیا ہو۔

ہا کو خان تھا۔ اس نے اپنی سرحدوں کو پوری طرح مضبوط کر دیا تھا۔

میرس بندقدار نے سنتریل کی چوکیوں کے لیے ہوائی ٹاک بھی نامہ بر گھوڑوں کا انتظام کر دیا تھا تاکہ مغل کیں بھی نظر آجائیں تو اسے فوراً اطلاع مل جائے لیکن سلطان میرس کا قیام قاہرہ میں مستقل نہ تھا۔ اس کا تیز رفتار گھوڑا کبھی مشرق، کبھی مغرب تو کبھی شمال میں نظر آتا۔ وہ جہاں بھی منزل کرتا ایک خیمے میں ایک رات سے زیادہ بسر نہ کرتا۔ وہ سونے کے لیے شب خوبی کا لباس بھی نہ پہنتا تھا۔ وہ اتنا محتاط تھا کہ اس کے خیمے کے باہر ہر وقت ایک زین کا ہوا گھوڑا کھڑا رہتا۔

اسی دوران ایک انتہائی خوش آئند واقعہ پیش آیا۔

اس کے سرحدی پوکیدار کچھ مغلوں کو لے کر اس کے دربار میں حاضر ہوئے۔ ان مغلوں میں ایک حمین و حیل موت بھی تھی جس کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا۔ اس جھنڈے کے اوپری حصے میں کمرے کا کھٹا تھا اور درمیان میں ہلال شہری ہاروں سے بنایا گیا تھا۔

یہ مغل ہلا کو خان کے اردو سے تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ تفتاز کے قاصد تھے اور مرلے برقانی سے شنشاہ مغرب برقانی خان کے پاس سے امن اور دوستی کا پیغام لے کر گئے تھے۔ برقانی خان کو قراقرم میں منگو خان کی موت اور سلطان مصر کے ہاتھوں قذافی کی شکست فاش کی خبر مل چکی تھی۔ یہ وفد برقانی خان کی طرف سے سلطان مصر کو مبارکباد پیش کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

قاہرہ میں جب اس وفد کو سلطان کے سامنے پیش کیا گیا تو جلیشیا نے، جو اس وفد کی سردار تھی، انہیت فصیح عربی زبان میں برقانی خان کا امن پیغام کی زبانی بیان کیا۔

سلطان میرس اس کی عربی دانی سے اس قدر متعجب ہوا کہ اس نے سوال کیا:

اے لڑکی! تو نے اتنی اچھی عربی کہاں سے سیکھی؟

جلیشیا نے جواب سے جواب دیا:

شاہ مصر! میں عربی کے علاوہ بارہ اور زبانیں اسی روانی سے بول سکتی ہوں۔

سلطان خود بھی بے شک زبانوں کا ماہر تھا۔ اس نے جلیشیا کے کسی ایسی زبان میں بات کی جس کے لیے اس کا خیال تھا کہ جلیشیا نہ جانتی ہوگی لیکن سلطان میرس کو اس وقت اور زیادہ حیرانی ہوئی۔ جب جلیشیا نے بڑی روانی سے سلطان کو اسی زبان میں جواب دیا جس زبان میں سلطان نے سوال کیا تھا۔

سلطان نے دو تین اور زبانوں میں بھی جلیشیا سے گفتگو کی جس کا جواب جلیشیا بغیر کسی پریشانی کے دیتی رہی۔ سلطان نے پوچھا:

جلیشیا کو چپ کرنے کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں تو شاہی حکیم کو طلب کیا گیا۔ اس نے جلیشیا کی ہنر دیکھنے کے بعد اعلان کیا کہ اگر وہ اسی طرح کچھ دیر اور روتی رہی تو اس کے پاگل ہو جانے کا خطرہ ہے لیکن جلیشیا پاگل نہیں ہوئی۔ اس کی آہ وزاری خود بخود رک گئی اور دنیا کی کیفیت میں سکون پیدا ہو گیا۔

اب جلیشیا کیم صم تھی اور پٹی پٹی نظروں سے ایک ایک کامند کچھ رہی تھی۔ صدر قاضی نے ایک قدم اس کی طرف بڑھایا تاکہ اسے تسلی دیں لیکن وہ اچھل کر فوراً ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور بدحواس ہو کر کہی:

"قاضی صاحب! خدا کے لیے میرے پاس نہ آئیے۔ میں بہت گنہگار ہوں۔"

جلیشیا اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکی معاً ایک بار ہوا میں لہرائی۔ پھر غش کی گڑگری صد قاضی نے ڈھکراے اپنی ہانوں پر روک لیا اور پھر زمین پر بیٹھ کر جلیشیا کا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔ برقانی خان ان کے متوجہ ہو کر شاہی گیم نے اس کی نبض دوبارہ دیکھی پھر برقانی خان کو بتایا:

"فکر نہ کیجیے شنشاہ! امر ایضاً خطرے سے باہر ہے۔ وہ جلد خوشی میں آجائے گی۔"



صاف ظاہر تھا کہ ہلا کو خان، اس پسلی شکست کی خبر ملتے ہی واپس آئے گا اور تاجو خان کے انتقام کے بدلے مصر کو کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہلا کو خان کے حکم کا خطرہ اب پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا تھا۔ میرس بندقدار نے جواب ملک الظہر میرس بندقدار کے نام سے مصر کے تخت و تاج کا مالک تھا، اس نے ہلا کو خان کے مقابلے کی بڑے زور شور اور اٹھانک سے تیاریاں شروع کر دیں۔

میرس اس قدر زمین تھا کہ اس نے مغلوں کے خلاف مغلوں ہی کی چال چلی مغلوں کا طریقہ تھا کہ وہ جس علاقہ پر حملہ آور ہوتے وہاں کی آبادی کو قتل کر دیتے اور آبادیوں اور کھیتوں کو اس خیال سے برباد کر دیتے کہ اگر مسلمان پٹ کر حکم کریں تو وہ مغلوں کو پیچھے ہٹنا پڑے تو مسلمانوں کو نہ تو خدا ملے اور نہ گھوڑوں کو گھاس بھی ہوگی۔ اس حکمت عملی کو پیش نظر رکھتے ہوئے میرس نے بندقدار نے شمالی شام پر بیغار کی اور وہاں کے مسلمانوں کی عیسائی آبادی کو ساقط کر دیا (مسلمانوں سے تو آبادیاں تقریباً خالی ہو گئی تھیں)۔ اس نے غذا اور پھوس کے ذخیرے یا تو ضائع کر دیے یا اپنے ساتھ لے آیا۔ وہ شام کے پانچ سو صاحبزادوں اور صلیبی عیسائیوں کو بھی اپنے ساتھ لے آیا تاکہ قاہرہ میں وہ اپنی آنکھوں سے مصریوں کی عافیت کا مشاہدہ کر سکیں۔

سلطان میرس بظاہر قاہرہ میں بیٹھا ہوا تھا لیکن اس کی نظریں بڑی احتیاط سے شمال کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

”تم نے شاید اپنا نام جلیشیا بتایا ہے۔ ایسا نام مسلمان لڑکیوں کا نہیں ہوتا۔ کیا تم عیسائی ہو؟“

اس سوال پر جلیشیا سچے دل سے غامض رہی۔ پھر اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

سلطان نے حیران نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا:

”جلیشیا! ہمیں انصاف ہے کہ ہمارے سوال سے تمہارے دل کو تکلیف پہنچی۔“

جلیشیا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

”سلطان! میرا میری گستاخی معاف فرمیں کیونکہ سلطان نے جو بات کہی تھی اسے سن کر مجھے اپنی پھیلی

زندگی یاد آگئی تھی۔ میں سلطان سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتی۔ سلطان نے مجھے عیسائی سمجھا یہ بھی غیبت

ہے کیونکہ اپنے پیچھے مذہب میں نہیں عیسائیوں سے بھی بدتر تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب میں ایک سچی مسلمان ہوں۔“

اس سے پہلے میں مسلمانوں کی کٹر دشمن ”مباحی“ فرقے سے تعلق رکھتی تھی جس میں ہر گناہ ٹوابع ہے بلکہ یوں کہنا

چاہیے کہ ان کے عقیدے میں گناہ کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اب میں نے اپنی زندگی اسلام کی مرندگی کے لیے

وقف کر دی ہے اس خیال سے کہ شاید خدا میرے پیچھے گناہ معاف کر دے۔“

سلطان کو شاید غلوں کو شکست دے کر اتنی خوشی نہ ہوتی ہوگی جتنی اسے اس وفد کی آمد سے ہوئی۔ اس نے

دشت کے اسی سرداروں کی بڑی خاطر رات کی۔ ان میں سے کئی ایک کو اپنے حلقے میں اعلیٰ رتوں پر سرور کیا۔

دربار سے واپسی پر جب عبید نے منزل کو بتایا کہ مراٹھے برقانی سے ایک امن وفد آیا ہے اور جلیشیا نامی

ایک خوبصورت لڑکی اس وفد کی سرور ہے تو منزل کا چہرہ فرط مسرت سے دھک اٹھا۔

اس نے عبید کو بتایا کہ جلیشیا وہی لڑکی ہے جس کی آمد سے وہ ارضِ فلسطین سے فرار ہو کر مصر پہنچی تھی۔

منزل نے عبید پر زور دیا کہ وہ اسی وقت اسے لے کر جلیشیا کے پاس چلے۔ عبید نے اسے ٹانجا ہاکیونکہ رات ہو چکی تھی

مگر پھر اسے جلیشیا کے پاس جاتے ہی بن پڑی۔

جلیشیا اور وفد کے دوسرے ارکان شاہی محان خانے میں ٹہرے ہوئے تھے۔ عبید نے ان کو مائدے کے

دواں پہنچا۔ محان خانے کے تمام لوگ عبید کو پہچانتے تھے۔ پہنچنے پر ان دونوں کو جلیشیا تک پہنچنے میں کوئی تاخیر

پیش نہ آئی۔

محان خانے کے محافظ نے ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر منزل کو بتایا کہ جلیشیا اس کمرے میں ٹھہر رہی ہے۔

منزل کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ یہ وہی جلیشیا ہے پھر بھی اس کے دل میں طرح طرح

کے دوسرے پیدا ہو رہے تھے۔ آخر اس نے جی کر ڈاکو کے دستک دینے کے لیے اپنا ہاتھ دروازے کی طرف بڑھایا۔

لیکن دستک دینے سے پہلے ہی دروازہ خود بخود کھل گیا۔

جلیشیا سامنے کھڑی تھی۔

منزل اور جلیشیا نے ایک دوسرے کو اس انداز سے دیکھا جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہیں۔ پھر دوسرے جلیشیا

اور دوسرے منزل نے بازو پھیل دیے اور وہ ایک جان دو قاب کی طرح ایک دوسرے سے پٹ گئیں۔ جلیشیا منزل

کو اپنے کمرے میں لے گئی اور دروازہ بند کر لیا۔

پھر جو باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو جلیشیا کی کلفت بن گیا۔

جلیشیا نے بے جھجک مزاح کہتا ہوا کہ جب وہ اس سے ارضِ مقدس کے کھنڈرات میں ملی تھی تو اس وقت وہ

مباحی فرقہ کی ایک مگرزمل لاکر تھی اسے ہاکیونکہ کدو بار میں ایک خاص مقصد کے لیے بھیجا گیا تھا۔ پھر جب ہلکے

فراق واپس جاتا تھا تو اسے واپس بلایا گیا اور وہ ایک رات موقع پا کر ہاکیونکہ کے لشکر سے غائب ہو گئی۔

جلیشیا نے بتایا کہ اس کا بعض جلیشیا اس علاقے کا امیر تھا۔ اسے حکم دیا گیا کہ جلیشیا کو فلسطین واپس بھیجا جائے

فلسطین ہی اسے خبر ملی کہ اس کے بعض کو مصر میں ہی کے حکم سے قتل کر دیا گیا ہے، اس لیے اسے اپنے فرقے

سے نفرت ہو گئی۔

منزل نے پھر سے اسی جلیشیا سے پوچھا:

”کیسے تم برقع خلی کے وفد کی جگہ پر آ گئیں؟“

جلیشیا نے جلیشیا سے کہا:

”میرا ایک بڑی دست ہے جس میں یوں بھجوا کر اللہ نے مجھے سیدھے راستے پر ڈالنا تھا۔ جب قتل ہونا کو میں جاکو

کے میدان میں شکست ہوئی تو کسی سستی نے میرے کان میں کہا کہ جلیشیا تیری نجات اسی میں ہے کہ تو یہ خبر برقانی کو

پہنچا دے۔ بس میں گھوڑے پر بیٹھ کر راستے برقانی کی طرف بھاگ پڑی۔ میری تیزی کا یہ عالم تھا کہ دو دو منزلیں

ایک ایک دن میں طے کرتی لیکن جگہ جگہ میں یہ خبر لے کر برقانی محان کے دربار تک پہنچ گئی لیکن.....“

جلیشیا کہتے کہتے رگ جھنجھکی اور اس کی شوقی ایک دم سیدھی گئی۔

منزل نے پھر پوچھا:

”کیا وہ جلیشیا اتنے نامور تھی؟“

جلیشیا نے ٹھنڈے ہنس بھرتے ہوئے کہا:

”مگر وہی منزل دیکھا پہنچ کر تو میری دنیا ہی پٹ گئی۔“

جلیشیا نے پھر جھنجھکاؤ سے پوچھا: ”منزل کو کچھ ہونے لگا۔ اس نے جلیشیا کو ٹھوکارا۔“

”نہ تم کہتے کہتے بار بار رک کیوں جاتی ہو پورے بات چیت کا منزل نے یوں کہا جیسے اگر جلیشیا سے نہیں

بتائے گی تو وہ اس سے روٹ جائے گی۔

جلیشیا کو شاید اس کا علم ہو گیا۔ وہ منزل کو ناراض نہ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا:

”کیا بتاؤں منزل! میں نے برقائی خان کے دربار میں ایک ایسا منظر دیکھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جب میں دربار میں پہنچی تو دربار میں بالکل سناٹا تھا۔ ایسا سکوت کہ سوتی گرسے تو اس کی بھی آواز سنانے سے اس کا یہ مطلب نہیں کہ دربار میں کوئی موجود ہی نہ تھا۔ دربار کچھ بھرا ہوا تھا لیکن برقائی خان، تمام مسلمانوں کے ساتھ بھرے دربار میں مغرب کی نماز پڑھ رہا تھا۔ انہیں اس طرح نماز پڑھتے دیکھ کر میرا دل جیسے اندر سے بولا:

”سچے مسلمان تو یہ ہیں جلیشیا! وہ لوگ سچے مسلمان کیسے ہو سکتے ہیں جو مسجد میں جھکے ہوئے سروں کو کاٹ کر خوش ہوتے ہیں:

بس اسی دقت میرا دل اپنے عقیدے سے پھر گیا۔ میں روتے روتے بے حال ہو گئی پھر سچے دل سے توبہ کر کے مسلمان ہو گئی۔ برقائی خان مجھ سے اس قدر خوش ہوئے کہ اس وفد کا قائد بنا دیا:

اس کرے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں اور دوسرے کرے میں عبید بیٹی منزل کے انتظار میں سوکھ رہا تھا پھر نہ جانے کیسے منزل کو عبید کا خیال آ گیا۔ اس نے واپس جانا چاہا مگر جلیشیا نے اسے کب چھوڑنے والی تھی۔ آخر عبید کو ایسے ہی واپس جانا پڑا اور یہ دونوں مدت بھر باتیں کرتی رہیں۔

شہنشاہ مغرب برقائی خان کے امن میں مسلمان معرکوں کا ظاہر نہیں بندھتا۔ خود اپنے ہاتھ سے برقائی خان کو لکھا:

ایک قجائی کا خط، قجائیوں کے خان کے نام

ایک پکے مسلمان کی طرف سے ایک طاقتور نو مسلم کے حضور!

ہاں کو خان اسلام کو ایک سرے سے نیست و نابود کرنے پر

تکا ہوا ہے اور میں یہ کوشش کر رہا ہوں کہ خلافت عباسیہ کو

از سر نو بحال کروں اور کافروں کے خلاف جہاد کروں۔

برقائی خان کا امن وفد واپس جانے لگا تو سلطان مصر نے بت سے متاثر بھی بقیہ عثمان کو بھیجے۔ ان تھان میں قرآن پاک کا ایک نسخہ معریشی جزدان میں پرستار کام کیا گیا تھا، اہمیتی دانت اور مندل کا ایک مرقع تخت،

ایک نذرانہ جانا زعفرانی دستوں کی نفیس تلواریں، ریشمی زرہ کی دمشق کمانیں، اعلیٰ درجے کے طوطے، تازی گھوڑے، مبارک شتر، جنگلی گدھوں کا ایک گلا، زرہ من کے ساتھ متعش زمینیں بھی تھیں، کمانا پکھنے میں متاثر نیزیں اور بہت سے بندر جو ریشمی کپڑے پہنتے تھے، شامل تھے۔

برقائی خان کی طرف سے میریں بندھتار نے اپنا ایک اصرار بیت اللہ کے لیے روانہ کیا تاکہ اس کا ثواب شہنشاہ مغرب کو ملے۔

امن وفد کو ٹرے احترام سے رخصت کیا گیا۔ جلیشیا نے برقائی سے قاہرہ میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت حاصل کر لی تھی اس لیے وہ اپنی سیلی منزل کے پاس ٹھہر گئی۔



ہاں کو خان کو اپنے وطن جانا نصیب نہ ہوا۔ اس کے ارد میں موجود ٹرے بوڑھوں کے دل میں بس ایک ہی امن تھی۔ قطبوغا کی موت کا بدلہ لیا جائے۔ اور قاہرہ کی فصیلوں کو ریگستان کی ریت کی طرح پیس ڈالا جائے۔ ہاں کو نہ نیا لشکر ترتیب دینا شروع کیا کیونکہ اب مسلمان ایک آہنی دیوار تھے اور ایک گرز کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ مغلوں کے سر پاش پیش کر سکتا تھا۔

میریں بھی خاموش نہ بیٹھا تھا۔ وہ شمالی سرحد سے قاہرہ تک پھرنے لگا اور فوجوں کو منظم کرتا۔ اس نے محسوس کیا کہ ابھی تک بعض مسلمانوں کے دلوں پر غلبہ کا خوف طاری ہے۔ میریں رٹا ہڈ نہ سچ تھا اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ مہم کے قلعے میں گھس جاتا اور بڑے پیار سے انداز میں ہنس ہنس کر مغلوں کا مذاق اڑاتا۔

ایک بار اسے ایک عجیب مذاق سوجھا۔

وہ شمال کی طرف غائب ہو گیا۔ اور ایک مٹھی کا بیس بدل کر ہاں کو خان کے علاقے میں جا پہنچا۔ وہاں ایک نانانی لڑکانہ پاس نے کھانا کھایا۔ لوگوں کی باتیں سنیں اور ایک روٹی کے نیچے اپنی ایک تینتی انگوٹھی اس طرح چھپا دی کہ انداز کو وہ کھانی سے نظر آجائے۔

پھر اس نے اپنی سرحدیں واپس آکر ہاں کو خان کو خط لکھا:

”تمہاری ایک چوکی پر خان نانانی کی لڑکانہ ہے۔ وہاں میں اپنی

انگوٹھی بھول آیا ہوں۔ وہ تلاش کے بجھے واپس بھجوا دو۔ وہ انگوٹھی

مجھے بہت پسند ہے۔“

ہاکو خان کو یہ خط ملا تو وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ میرس کی اس ستم ظریفی کا قاصد کے کوہ و بازار میں بڑھ چکا ہوا۔ لوگ اس قصے کو مزے لے لے کر بیان کرتے اور قہقہے لگاتے۔

شہنشاہ مغرب برقانی خان کو میرس کا پرنسٹون خط اور پیش ہاتھ ملے تو وہ بہت خوش ہوا اور قتل پر میرس کی اس حکمت عملی کا یہ اثر ہوا کہ ۲۶۲ کے باروں میں جب ہاکو خان نے ایک نئے لشکر جوہار کے ساتھ معراج کی تو قفقاز کے دروں کے پیچھے زرین خیل (برقانی خان کا خاندان زرین خیل کہلاتا تھا) کی ایک فوج نمودار ہوئی۔

ہاکو خان کے قدم رک گئے کیونکہ برقانی خان کی منسل فوج اس کی پشت پر لگی تھی۔

ہاکو خان تیزی سے پلٹا اور اپنی ایک حملہ آور فوج کو قفقاز کی چوٹی پر لگا ہوا دروں کے راستے اس طرف بھجوا جہاں قفقاز کی چوٹیاں بحر زلیخہ پہنچتی تھیں۔

برقانی خان کا فوجی پڑاؤ بے خبری کے عالم میں تھا اس لیے ہاکو خان کی فوج نے دریائے تیرک کے آگے ہڈ بول دیا۔

برقانی خان کے دستوں کو شہنشاہی دشت کی طرف پسپا ہونا پڑا لیکن یہ پسپائی عارضی تھی۔ برقانی کی فوج نے فوراً سنبھل کر جوابی حملہ کیا۔ ہاکو خان کی فوج گہرے پیچھے تھی۔ دریائے تیرک سمجھتا تھا اس کی سطح ٹوٹ گئی اور اس کے صدارت سوار دریا برد ہو گئے۔ کئی دستے پیچھے رہ گئے جو برقانی کے سواروں کی تلواروں کا لقمہ بن گئے۔ اس علاقے میں برقانی خان کی فوج اس کے نوجوان بیٹے نوگانی کے ہاتھ میں تھی جس نے اپنے جوابی حملوں ہاکو خان کا نام میں دم کر دیا۔

اب پہلے کی طرح مغلوں میں پھر خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

ہاکو خان کو جنوبی محاذ پر میرس بندہ قدر سے خطرہ پیدا ہوا۔ اس نے کوشش کی کہ عیسائیوں کو مسلمانوں خلاف کھڑا کر دیا جائے لیکن عیسائیوں نے ہاکو خان کی مسلسل درخواستوں کے باوجود کوئی توجہ نہ دی۔

اس طرح ہاکو خان کا معرغہ مرنے کا خواب چمکا چوڑ ہو گیا۔ عین جاوت کے میدان میں مغلوں کی پہلی فوج ان کی آخری شکست پہنچی۔ ساتھ ہی دنیا کو گلگیر کی شاکی اود بربریت سے ہمیشہ کے لیے بہت مل گئی اور وہ کبھی سہرا نہ اٹھ سکے۔ انہوں نے جب بھی سراٹھانے کی کوشش کی مسلمانوں نے ان کا سر کیل کر دکھ دیا۔

جلال الدین آتابک اور عید کی زندگی میں پہلے ہی شکر نے کھانا شروع ہو گئے تھے۔ صحابی ناز میں جیلے اب صدق دل سے مسلمان ہو چکی تھی اس کی شادی سلطان مصر کے ظاہر میرس ہند قلعہ کے حاکم کے ساتھ ہو گئی۔

۵ کوکا چین

کھنے کو تو قبلائی خان، مغلوں کا خاقان تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اب اس کی خاقانی ترقی کر چکی تھی اور ارض چین تک محدود ہو گئی تھی۔ روس کے تاتار ان زرین اور سطح مرتفع ایران کے ایل خانی مغلوں کا خاندان ہوا۔ ہاکو خان کی اولاد تھا، قبلائی خان کو رسمی خاقان تسلیم کرتا تھا اور ہر ایک اپنی سلطنت کا خود مختار تاجدار تھا۔ قبلائی خان کے قبیلے بھائی سنگو خان، ہاکو خان اور ادلی بولغا اپنے آبائی قبرستان برخان کلدون میں دفن ہو چکے تھے یا بقول مغلوں کے نیلے آسمان کے اوپر آرام کرنے چلے گئے تھے۔

اس وقت ایران میں ہاکو خان کا پوتا ارغون خان حکومت کر رہا تھا۔ ارغون کی شادی قبیلہ کنکراٹ کی ایک خوبصورت لڑکی سے ہوئی تھی لیکن وہ زیادہ عرصے زندہ نہ رہ سکی۔ اس کی وفات کے بعد ارغون خان نے خاقان کو اہل شادی کر وہ دوسری شادی بھی قبیلہ کنکراٹ میں کرنا چاہتا تھا۔ خاقان کی چہریتی، بیوی باجونی خاتون بھی اسی قبیلے کی تھی۔

ارغون خان دراصل شہزادی کوکا چین کا نواسیدہ عاشق تھا۔ شہزادی کوکا چین کے حسن کا چہرہ بھر چین سے لے کر بحیرہ چین تک پھیل چکا تھا۔ شاعر کاظم اور مورو کاظم جب تخلیق کے لیے رواں ہوتے تو کوکا چین کے چہرے سے متاثر رہتے۔ مغل جوانوں کی بالہ سری کے سرور میں کوکا چین کی لہکار آتی۔ کوکا چین ہر مغل جوان کے ہاؤں کی گنگ بن چکی تھی۔

ارغون خان نے اپنی عرضداشت میں کھل کر شہزادی کوکا چین کا نام لے لیا بلکہ یہ درخواست کی تھی کہ اگر خاقان اجازت دے تو وہ اپنا ایک وفد خاقان کے دربار میں بھیج دے۔ یہ وفد کنکراٹ کی دو شیرازوں میں سے جس کو

پیشہ کرے اسے دہلیس بنا کر ایران روانہ کر دیا جائے۔

قبلائی خان بڑا جہاں دیدہ اور گرگ باران دیدہ تھا۔ وہ ارغون خان کا مطلب سمجھ گیا اور اس کے اہل خانہ کی دل ہی دل میں داد دی۔ خاقان نے اجازت دے دی اور ایرانی وفد جو دواؤں میں پرستش میں تھا ایران سے

ٹائی ٹو (خان بالین) کی طرف چل پڑا۔

اس وفد میں ایک تو مغل سردار تھا اور دوسرا ایک مسلمان عہدے دار جس طرح اس وقت جہیں میرہ کاروبار سلطنت پر چینی پھلتے ہوئے تھے اسی طرح ایران میں مسلمان مدبرین، مغلوں کو انسانیت اور جہاں باز کا درس دے رہے تھے۔ ارغون کا وزیر اعظم ایرانی حکیم اور مورخ رشید الدین بھی مسلمان ہی تھا۔



چنگیز کے پوتے قائم و خان کی چھاپہ مار تگ و تانہ سے قبلائی خان پریشان تھا۔ اس کا مسلمان عہدہ بایاں جنوب بعید کا میڈو چھوڑ کر شمال میں قائم ہو کر آگیا تھا۔ قائم و خان نے مشرق اور مغرب کی تجارت کو فروغ دے کر کے شاہراہوں کو پر خطر بنا دیا تھا۔ قبلائی خان خود بھی چاہتا تھا کہ شہزادی کی شادی ارغون خان سے ہو جائے تاکہ دونوں سلطنتوں میں از سر نو خلوص و محبت کے رشتے استوار ہوں اور شہزادی کے ایران جانے کے بعد خاندان مسلمانوں کی جنوب اور جنوب مغرب کی طرف ہجرت کا سلسلہ بند ہو جائے۔ وزیر بایاں احمد کے قتل کے بعد مسلمان خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ پھر جب خاقان کی شہزادی کا قتل عام کیا گیا تو مغلوں سے ان کی ہمدردی ختم ہونے لگی اور وہ ہجرت پر مجبور ہو گئے۔

خاقان مسلمانوں کے اس طرح ملک چھوڑ جانے سے خوش نہ تھا۔ اس نے احمد کے بیٹوں کو پھر سے مالی امداد دے کر ان کو خوش کرنے کی کوشش کی لیکن مسلمان شہزادی اور نصرانی مشیر بایاں مارکو پو یو سے خائف تھے۔ ان دونوں نے خاقان کے کان بھر کر مسلمانوں کا قتل عام کرایا تھا۔

جب مسلمانوں کی ہجرت کا سلسلہ کسی طرح بند نہ ہوا اور رصد گاہوں، چھاپہ خانوں، بارود خانوں، جہازات اکثریت مسلمانوں کی تھی، خالی ہونے لگے تو خاقان نے سرحدیں بند کر دیں اور ملک چھوڑنے والوں کی گرفتاری حکم دے دیا۔

اس پکڑ دھکڑ میں ایک دن قبلائی خان کا ناظم کتب خانہ مشہور عالم جمال الدین گرفتار ہو کر اس کے سامنے لایا گیا تو خاقان کو بہت افسوس ہوا۔ جمال الدین اٹھا پلٹے کا ستارہ شناس بھی تھا۔ خاقان نے اسے ایک جیہ

نئی یاد کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی تھی جس کا آغاز، خاقان قبلائی خان کے اٹھارہ خاندانی سے ہونا تھا۔

جمال الدین کو اس کے سامنے پیش کیا گیا تو خاقان نے اس سے پوچھا:

”جمال الدین! ہم نے تمہارے ساتھ تو کوئی زیادتی نہیں کی پھر تم یہاں سے کیوں بھاگے؟“

جمال الدین اپنی جان سے عاجز ہوئے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ مرنا یوں بھی ہے اور توں بھی تو پھر شہرہ

باز کیوں نہ مریں۔ یہ سوچ کر انہوں نے کرٹک کر جواب دیا:

”خاقان کا یہ خیال غلط ہے کہ ہم بھاگ رہے ہیں۔“

خاقان کو غصہ آگیا۔ بھلا خاقان بھی کبھی غلط ہو سکتا ہے۔ اس نے اُنہیں نکالنے ہوئے کہا:

”جمال الدین! تم یہاں سے بھاگے ہو۔ تم سے کہتے ہو کہ ہم غلط کہہ رہے ہیں۔ کیا خاقان بھی غلط ہو سکتا ہے۔“

”مصلحتی چیزیں اور ویسے ہی ہو سکتی ہے۔“ جمال الدین نے تلافی سے کہا:

”خاقان تو صرف ایک انسان ہیں اور پھر آپ تو کسی دین و بھی تسلیم نہیں کرتے۔“

خاقان کو اور طیش آگیا۔ گرج کر بولا:

”جمال الدین! تم خاقان کو بے دین کہہ رہے ہو۔“

پھر اس نے سانگا کی طرف دیکھ کر کہا:

”تم نے سانگا۔ یہ ہمیں کافر کہہ رہا ہے۔“

سانگا اب دربار پر چھاپا ہوا تھا۔ احمد کے قتل کے بعد نہ صرف سانگا کو وزیر بایاں کا عہدہ ملا بلکہ نئی عالم

بالی کو بھی معزول کر دیا گیا اور اس کی ذمے داریاں بھی سانگا کو سونپ دی گئی تھیں۔

سانگا فوراً خاقان کی طرف ذمہ داری کرتے ہوئے بولا:

”جمال الدین! ہمارا خاقان قبلائی خان چار بیغبروں کو مانا اور ان کی عزت کرتا ہے۔ یہ بیغبر حضرت یسوع مسیح

نہی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت موسیٰ اور ہمارے شاکیا مئی کو تم بدھ ہیں۔ اس کے علاوہ خاقان اس کے

لکھ بھگاتے ہیں جو جلاوادی آسمان میں ہے۔ پھر خاقان کافر کیسے ہو سکتے ہیں؟“

خاقان خوش ہو گیا۔ وہ بولا:

”سانگا تو بڑا عقل مند ہے۔“

پھر اس نے جمال الدین سے مخاطب ہو کر پوچھا:

”اب تیرے پاس اس کا کیا جواب ہے۔ صحیح جواب نہ دے گا تو میں تجھے قتل کرادوں گا۔“

جمال الدین نے کہا:

خاقان پر نشہ سوار ہوا تو اس نے سر دربار خوش شکل کنیزوں پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ کنیزوں کو باری باری ہاتھوں میں کھینچ کر بوس و کنار میں مصروف ہو جاتا۔ پھر ایک خوش خاک تہقہ لگا کر انہیں مہمان مغل کی طرف بلادیتا۔ تمام درباری خاموش کھڑے یہ منظر دیکھ کر غصہ سے دھڑک رہے تھے۔

اس مغل میں سوائے مکان اور میزبان کے کسی مردار کو شراب پینے کی اجازت نہ تھی۔ سعید تبریزی کو اس واقعہ پر پہلوں کا شربت میا کر دیا گیا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ کر شربت کی چکیاں دیتا اور آقا و غلام کی ان ہانچوں پر مسکرا کر دیکھتا رہا۔

خاقان نے اپنی چیتی بیگم کو ماضی خاتون کے مرنے کے بعد پھر کسی دوسری بیگم کو مردانی مغل میں آنے کی اجازت نہ دی تھی۔ صرف اس کی بہو یعنی مرحومہ کے دل میں جگہ کم کی۔ یہ وہ لالہ رخ کو اپنی مرضی کے مطابق دربار آنے کی اجازت تھی۔ خاقان نے اسے آج بھی بلوایا تھا لیکن وہ مدد شہزادہ خان تیمور خان کی بیماری کا باعث بنی۔

یہ وہ لالہ رخ نے اپنی تمام توجہ اپنے سوتیلے بیٹے تیمور خان کی نگہداشت و تربیت پر لگا رکھی تھی۔ وہ بچہ کو چنگ کم کی یادگار کچھ کہ سینے سے لگائے اپنی بیوی کے دن پورے کر رہی تھی لیکن دیکھنے والے کہتے ہیں اس حال میں بھی لالہ رخ کے حسن و جمال کا مقابلہ سوائے شہزادی کو کاچین کے اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ خاقان لالہ رخ کو شاہ بیگم کا خطاب دیا تھا اور اس کی بہت عزت کرتا تھا۔

مہنگا منہ ناؤ نوشش کے اختتام پر قبلائی خان نے حکم دیا کہ بہت کے شعبہ ہاڑوں کو حاضر کیا جائے تاکہ ان کو خوش کریں۔

سرخ رنگت والے چار بتی اپنے ساز و سامان کے ساتھ دربار میں آئے اور مختلف قسم کے تماشوں اور مسکرائے اہل دربار کو ہلنے لگے۔ آخر میں ایک بتی اور آریا ہنس کے متعلق مشہور تھا کہ یہ مانوقی الغفر کا لکا مکس ہے۔ وہ اگرچہ ہے تو طوفان اٹھا دے اور آندھیاں بلا لے۔ مشہور تھا کہ یہ بتی روجوں سے اڑ سکتی ہے۔

سعید تبریزی اب تک دلچسپی سے کھیل تماشے دیکھ رہا تھا لیکن جب اس بتی نے آکر یہ شہنشاہی کر دی اپنی ہانچوں کو غائب کر سکتا ہے اور پھر جہاں سے چاہے انہیں برآمد کر سکتا ہے تو سعید تبریزی کو اس کے سکا لیکن نہ آیا۔ اس لیے کہ یہ طاقت سوائے ولی اللہ کے اور کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ اس بتی سے کشف و انکشاف کا کس طرح ممکن ہے۔ چنانچہ سعید غور سے اس کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔

بتی شعبہ ہاڑوں نے ایک کنیز سے شراب کا بھرا ہوا جام مانگا۔ کنیز نے خاقان کی اجازت سے جام شعبہ ہاڑوں

میں خاقان سے بحث نہیں کرنا چاہتا لیکن خاقان اور وزیر اعظم سا رنگا سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ کیا چاروں عظیم ہستیوں میں سے کسی ایک نے بھی کبھی کسی کے گناہ کو قتل کیا؟

خاقان اور سا رنگا کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔ خاقان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

جمال الدین! میں تجھے قتل نہیں کر اؤں گا لیکن تو خان بالیغ سے نہیں جاسکتا۔ تجھے کوئی تکلیف دے ہم سے شکایت کر۔

اس وقت خاقان کو اطلاع دی گئی کہ ایران کے شاہ ارغون خان کا وفد خلیج فارس میں داخل ہو چکا ہے۔

خاقان نے حکم دیا کہ وفد کو عزت کے ساتھ دربار میں لایا جائے۔

ایران کا وفد کئی وفد دربار میں آ گیا۔ وفد میں شامل مغل سردار خاقان کے سامنے آتے ہی سجدے کر جھک کر تعظیم بجا لایا لیکن مسلمان عہدے دار نے سر جھکانے کے بجائے باؤں بلند کیا۔

خاقان پر خدا کی سلامتی ہوا اور شاہی خاقان کو نیکو خلقی ہو۔

خاقان نے وفد کو خوش آمدید کہتے ہوئے مغل سردار سے پوچھا:

”یہ مبارک رہا پیٹنے والا کیسی باتیں کرتا ہے۔ اسے تو نے درباری آداب نہیں سکھائے؟“

مغل سردار نے جو خاقان کے آگے دست بستہ کھڑا تھا، کہا:

خاقان اعظم! یہ ایرانی عہدے دار سعید تبریزی ہے۔ اس کا چچا زاد بھائی ہمارے ایران کا مسلمان وزیر اعظم رشید ہے۔ شاہ ارغون نے خاقان سے درخواست کی ہے کہ سعید تبریزی کو مہمان تصور کرتے ہوئے

جملہ شایانہ پابندیوں سے معاف فرمایا جائے۔

قبلائی خان کو ارغون خان کی یہ بات ناگوار گزری مگر وہ صحتی چلا گیا۔ اس نے ایک سردار کو حکم دیا کہ مہمان کی خاطر مدارات کی جائے۔

حکم پاتے ہی چار طرح دار اور ولی آرام کنیزیں جام و سبوت لے کر حاضر ہو گئیں۔ ان نشیدہ و ماغریہ جیوں کے نقش و نگار بہتے ہوئے تھے۔ مہمانوں میں شراب اور مغلوں کا مرغوب مشروب یعنی سفید گھوٹ لیوں کا دودھ ہوا۔ مزید شراب اور دودھ گنگا جمنی گھڑوں میں بھر کر گنگا جمنی جیوں پر سجاویں گئے۔

کنیزوں نے خاقان کا اشارہ پا کر کمر کو مید بخون کی طرح لہراتے ہوئے مہمانوں اور مغلوں کو گود دیا۔ دودھ و شراب کے قہقہے فغان ملنے لگیں۔ مضامین کیف کو دھونگٹیں اور رنگ و ترنگ نے ایسا زور دیا

کو دے دیا۔ بتی نے جام اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی شراب فرش پر انڈیل دی۔ پھر اس نے اس جام کو ہوا میں اچھل دیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ جاکچے گرنے کے بجائے ہوا میں غائب ہو گیا۔ اس حیرت انگیز شعبہ کے کوچیک کرناکاروں اور دربار نے بتی کو بہت داد دی۔

سعید تبریزی اس شعبہ کے کوچیک رہا تھا وہ بھی بہت حیران ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بڑی کو یہ طاقت کیسے حاصل ہوئی۔

اتنے میں بتی نے کنیز سے کہا کہ خاقان کے آگے ایک خالی چوکی رکھ دی جائے۔ چونکہ خاقان کے سامنے رکھ دی گئی۔ شعبہ باز دور کھڑا تھا۔ اس نے ہوا میں اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے اور کھینچے گرائے۔ اس کے اٹے خالی تھے لیکن لوگوں نے دیکھا کہ وہ جام ہوا پر ہوا میں غائب ہو گیا تھا وہی جام اسی طرف بھرا ہوا اب خالی چوکی پر خاقان کے سامنے موجود ہے۔

اس پر داد و تحسین کا ایک بار پھر غلغلہ بلند ہوا۔ خاقان نے جو سعید تبریزی سے بھلا بیٹھا تھا، سعید کی طرف دیکھ کر کہا:

”اے تبریزی پر ہیر نگار۔ تو ان دیکھے خدا کو ماننا ہے۔ کیا ان دیکھے خدا کو ماننے والے بھی ایسے شعبہ کر سکتے ہیں؟“

سعید تبریزی کو خاقان کے طرز گفتگو پر سخت غصہ آیا لیکن وہ ضبط کرتے ہوئے بولا:

”خاقان اعظم! اگر ان دیکھے خدا کے بندوں میں کوئی طاقت ہوتی ہے تو وہ دولت کمانے کے لیے اس انہار نہیں کرتے۔ آپ کے شعبہ باز نے جو کچھ دکھایا ہے یہ تو محض ”نظر بندی“ ہے۔ اس نظر بندی کو توڑنا سکتا ہے۔“

بتی شعبہ باز نے یہ سنا تو سعید تبریزی کو غصے سے گھورنے لگا۔ قبائلی خان کی فطرت تھی کہ وہ ہمیشہ آدمیوں، دوگر و ہوں، دو قوموں اور دو سلطنتوں کو لڑا کر بڑا مغلوظ ہوتا۔ سعید تبریزی کو خود جواب دینے کے بجائے خاقان نے بتی کی طرف دیکھ کر کہا:

”تو کیا جواب دیتا ہے ہمارے ایرانی مہمان کو؟“

بتی نے کہا:

”خاقان اعظم! میں اس ایرانی مہمان کی اندرونی جیب میں ایک ایسا خنجر دیکھ رہا ہوں جس کے دونوں طرف دھاریں ہیں۔ اگر یہ جھوٹ ہو تو مجھے قتل کر دیا جائے۔“

خاقان نے سعید تبریزی کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے کہ رہا ہو کہ اب تو کیا جواب دیتا ہے۔

سعید تبریزی نے کہا:

”بتی شعبہ باز جھوٹ نہیں کہہ رہا لیکن پوشیدہ چیزوں کو کھلی آنکھ سے دیکھ لینا بھی کوئی ایسا سہل کام نہ انسان حاصل نہ کر سکے۔ بعض آنکھوں میں پیدا نشی طور پر یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ نہ در نہ رکھی ہوئی چیزوں کو بھائی دیکھ سکتی ہیں۔ پھر یہ طاقت آنکھوں کے ریاختی سے بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔“

خاقان کو جیسے غصہ آ گیا۔ اس نے بگڑ کر کہا:

”اے ایرانی بھڑھے! (حالانکہ سعید تبریزی بوڑھا تھا) تو خالی بحث کیے جا رہا ہے۔ طاقت کا جواب نہ خدا جانتا ہے۔ تو سچا ہے تو میدان میں آ کر اس طرح کا کوئی شعبہ پیش کر۔“

سعید تبریزی جو ایک سپہاسمان تھا، خاقان کی باتوں سے پریشان ہو گیا۔ اس نے زیر لب سورۃ مزمل دیکھا اور پھر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر آہستہ سے کہا:

”اے پروردگار۔ عزت اور ذلت دینے والا تو ہی ہے۔ اپنے ناچیز بندے کی شرم رکھ لے۔“

دعا سے سعید تبریزی کے قلب کو بڑا سکون ملا۔ خاقان اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سعید تبریزی بت کر کے کہا:

”خاقان اعظم! ہمارے مذہب میں شعبہ بازی گناہ ہے۔ پھر بھی اگر تیری یہ خواہش ہے تو اپنے اس مذہب کو کم دے کہ وہ ایک بار پھر جاک کو ہوا میں غائب کر کے حاضر کر دے۔“

خاقان نے شعبہ باز کو دیکھا۔ اس نے مسکرا کر کنیز سے جا طلب کیا۔ پھر اس کی شراب زمین پر انڈیل دے ہوا میں اچھال دیا۔ سعید تبریزی کی نظریں جاک کے ساتھ اوپر اٹھیں اور آسمان پر ٹھہر گئیں۔

اس بار لوگوں نے دیکھا کہ جام ہوا میں اوپر جاکے بجائے غائب ہونے کے زمین پر آگے گر اور ایک چٹا کے پھیل چھوڑ گیا۔ خاقان اور درباری حیرت سے سعید تبریزی کو دیکھنے لگے۔

خاقان نے قدرے خشکی سے پوچھا:

”اے بوڑھے تو آسمان پر کیا دیکھ رہا ہے؟“

سعید نے جرات سے جواب دیا:

”خاقان اعظم! میں آسمان پر اس کو دیکھ رہا ہوں جو ہم سب کا مالک ہے اور جو عزت اور ذلت دینے والا ہے۔“

بتی شعبہ باز بہت غصے میں تھا اس نے کنیز سے دوبارہ جام مانگا اور ہوا میں اچھالا۔ جام زمین پر گر کر اسی قبضہ پر رہنے ہو گیا۔ اس نے تیسری بار کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پھر نرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

خاقان کی طبیعت کچھ ایسی مکتدہ رہی کہ اس نے خود فوراً درخواست کر دیا کہ جب وہ مہمان منسلک ہو کر
تختیے میں بیٹھا تو اس نے سوال کیا،

اے ارغون خان کے سفیر! تو اپنے ساتھ یہ کس جادوگر کو لے آیا ہے؟
مغل سردار نے ہنس کر کہا:

"خاقان عالی مقام! یہ جادوگر نہیں۔ شاہ ارغون خان کا ایک مسلمان عہدے دار ہے۔
خاقان تشویش سے بولا:

"یہ تو بڑی نکر کی بات ہے۔ اگر ارغون خان ایسے جادوگر میں گھرا رہا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟"
منسلک سردار نے جواب سے کہا:

"خاقان عالی مقام! اس کا انجام یہ ہوگا کہ ایک نہ ایک دن برقیانی شان کی طرح شاہ ارغون خان بھی مسلمان ہو
جائے گا۔"

خاقان گہرا گیدہ اس نے کہا:

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ ان حالات میں میں شہزادی کو کاپچین کو ایران کی طرح بھیجوں گا۔
منسلک ان عظم خاقان ہیں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"

۱ خاقان قتلانی خان دلت بھر بہت بے چین رہا۔ شہزادی کو کاپچین کو وہ خان بالیغ میں رکھنا بھی نہیں چاہتا
تھا کیونکہ اس کے کہنے کی وجہ سے مسلمانوں پر تباہی آئی تھی۔ اب وہ شہزادی سے کسی نہ کسی طرح بچا چھڑانا چاہتا
تھا۔ رات بھر سوچ بچار کے بعد صبح کو خاقان نے ایک یرلیغ (شاہی غرمان) جاری کیا کہ قبیلہ کنکراٹ کی تمام
دو شیرائیں جہاں بھی موجود ہیں وہ دو ہفتے کے اندر اندر خان بالیغ میں حاضر ہو کر ارغون خان کی مکتدہ کے انتخاب میں
حصہ لیں۔ اگر کسی قبیلے کی کوئی لڑکی نہ آئی تو اس کے وارثوں کو اور خود اسے قتل کر دیا جائے گا۔



شہزادی کو کاپچین کنکراٹ قبیلے سے تھی لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ وہ قتلانی خان کی جائز بیوی یا بیوی
بلین سے تھی۔ بہر حال قتلانی خان شہزادی سے بہت محبت کرتا تھا اور اس کا بھی خواہش نہ تھا کہ شہزادی پر
کے مردانہ کردار کا سایہ نہ پڑنے پائے۔ اس لیے قتلانی خان شہزادی کو ہمیشہ اپنے سے دور رکھتا۔ اس
شہزادی کو کاپچین کے لیے مانی ٹوکے جنوب میں ختا کے علاقے میں جس کا دارالحکومت بھی ختا تھا ایک نوجوان

لی بنوادی تھا۔ مغلوں کو لوٹ مار میں سونا چاندی چھڑوں کے حساب سے ہاتھ لگتا تھا۔ اس لیے انہوں نے اس قبیلی
دھات کا مصروف یہ کیا کہ ہر محل کی اندرونی دیواروں اور چھتوں کو ان کے پتروں سے ڈھانپ دیا۔ سونے چاندی کے
پتروں پر مغل مزاج کے مطابق سبزہ زار اور چراگاہوں کی تعداد برقیانی کی جاتیں۔ اس پس منظر میں جینی مزاج کے
انہوں کے لیے بھول پتیلیں، پودے اور چڑیوں کی تصویریں بنائی جاتیں۔ پھر یہ پتروں دیواروں اور چھتوں پر منڈھ
دیے جاتے۔

شہزادی کے محل کی تعمیر میں یہ جہت بھی پیدا کی گئی تھی کہ اسے عام محلوں کے نقشے سے بٹ کر گولڈ کے طرز
پر بنایا گیا تھا۔ شہزادی کو کاپچین کو شاہی بیگمات کے مرتبے کے برابر تمام اختیارات اور مراعات حاصل تھیں۔ قتلانی خان
کی ہر جائز بیگم کی خدمت پر بارہ بارہ ہزار روپوں میں مقرر تھیں لیکن شہزادی چونکہ ناکتہ انتہی اس لیے اس کے
علی میں کینزوں اور عداوتوں کی تعداد چودہ ہزار تھی۔ اس کے اخراجات بیگمات کے خرچ سے ڈیڑھ گنا زیادہ تھے۔
شہزادی کو ختا کچھ اتنا پسند آیا کہ وہ وہیں کی ہو کر رہ گئی۔ قتلانی خان اور شاہی خاندان سے نفرتی کھنے والے شہزادی
کو کاپچین کو بھگائے اس کے ناک کے محبت میں شہزادی ختا کہتے تھے۔



دیس (روم) کے مارکو خاندان کے دو نضرانیوں پر قتلانی خان بہت مہربان تھے۔ وہ اس سے پہلے بھی قتلانی خان
کے پاس کچھ عرصہ گزار چکے تھے۔ اس بار وہ اپنے ساتھ دو سال کے ایک بچے مارکو پو کو بھی لائے تھے۔ یہ بچہ
فلبھرت، ذہین اور بڑا چالاک تھا۔ اس کی پرورش خود قتلانی خان نے کی۔ اسے قتلانی کے دربار میں رہتے ہوئے
دس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اب اس کی عمر اکیس سال تھی اور وہ شیر مایات کا عمدہ سنبھلے ہوئے تھا۔
مارکو پو پور کار دی دوسرے پر اکثر ختا جایا کرتا تھا۔ پہنچ کر اسے شہزادی کے حضور میں بھی حاضر کر دیتی پڑتی۔
برعکس پہلے لازمی، پھر رسمی اور اب دلچسپی بن چکی تھی۔ چونکہ معاملہ آقا اور عطا کا تھا اس لیے درمیان میں دقار کا
بارہ سال ہوئے۔

مارکو جب بھی ختا کے دورے پر جاتا تو ایک دفعہ کے بجائے کئی بار شہزادی کے سلام کو حاضر ہوتا۔ شہزادی
کو شاید اس کی یہ دیدہ دلیری پہلے ناگوار گزری ہو لیکن اب تو مارکو پو دو چار ماہ مکھنہ نہ آتا تو شہزادی بے چین
کی ہو جاتی۔

قتلانی خان کو یقین تھا کہ شاہ ارغون خان، شہزادی کو کاپچین کو اپنی ملک بنانا چاہتا ہے۔ انتخاب کا اس نے

محض ڈھونگ رچا ہوا ہے لیکن جب ارغون خان نے سنجیدگی کا ثبوت دیتے ہوئے قبلانی خان کو وفد بھیجنے کا حکم دیا تو قبلانی خان نے شہزادی کو کاچین کو خٹا سے خان بایلیغ بلوایا۔ وہ یہ انتخاب اپنے خان بایلیغ میں منعقد کرانا چاہتا تھا۔

مارکو پولو جب سرکاری دورے پر خٹا پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ شہزادی کو کاچین کو قبلانی خان نے خٹا بایلیغ بلوایا ہے۔ اسے اس بات کا بڑا افسوس ہوا۔ وہ فوراً خان بایلیغ واپس بھی نہ جاسکتا تھا۔ خٹا میں وہ ایک ماہ قیام کرتا تھا۔ سواہی اسے ایک ماہ خٹا میں رہنا تھا۔ پھر وہ اگر خٹا بایلیغ واپس جاتا تو اسے کوئی ٹکڑہ نہ ہوتا۔ خٹا میں شہزادی اپنے محل میں اپنے ملازمین کی ساکھ تھی لیکن خان بایلیغ میں اسے قبلانی خان کے کسی محل میں رکھا گیا ہو گا۔ یہ سوچ کر مارکو چپ ہو رہا۔ اور اس ایک ماہ کے عرصے کو کسی اور دلچسپ طریقے سے گزارنے کی تدبیریں کرنے لگا۔

قبلانی خان کی خواب گاہ میں روزانہ چھ لڑکیاں رات گزرتیں۔ اس طرح ہر سال اس کی نئی دانتوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہو جاتی۔ قبلانی خان کو حکومت کرتے تیس سال کا عرصہ ہو چکا تھا اور دانتوں کی تعداد ہر تین ہزار سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس تعداد میں وہ دو شیردہن شامل نہیں جو ہر سال۔ نو رپ کے بادشاہ خاقان کو تحفے کے طور پر بھیجتے یا جو لڑکیاں عیسائیت کی ترویج کے لیے مغلوں کے دربار میں آتیں اور مذہب کی تبلیغ سے پہلے انہیں خاقان کی نظر ثانی کا سامنا لینا پڑتا۔ ان میں وہ داستانیں بہت خوش قسمت تصور ہوتیں جو سال میں ایک رات سے زائد بار خاقانی خواب گاہ کی زینت بنتیں۔ ایسے حالات میں ان بہ قیمت لڑکیوں کو خطری قلعہ پورے کرنے کے لیے مجبوراً دوسرے ذرائع اختیار کرنے پڑتے سرکاری مشافہاتیں ان کی مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتیں اور یہ لڑکیاں اپنے تشنگی بھانے خان بایلیغ سے باہر طوائفوں کے محلوں میں پہنچ جاتیں۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے انہیں مشافہاتوں اور محلی کے خادموں کا پورا تعاون حاصل ہوتا۔ غرض کہ یہ گھناؤنا کاروبار بڑے وسیع پیمانے پر جاری تھا جس کی وجہ سے خاقان کو ہونہ ہو کر تمام بیگمات، شہزادیاں اور شہزادے اس سے پوری طرح باغیر تھے کیونکہ اس جام میں سب ہی شنگے تھے اس لیے کوئی کمی کو نہ ٹوٹتا۔ شاہی بیگمات جب اپنی باری کا انتظار کرتے کرتے تھک جاتیں تو انہیں بھی ایسے طریقوں کا سامنا لینا پڑتا۔ پھر بھلا اگر شہزادی کو کاچین نے کوئی لغزش کرنے کی کوشش کی تو اس میں تعجب کس بات کا۔ حملات کی کون عورت تھی جس کا دامن داغدار اور آلودہ نہ تھا۔

مغلوں کے وہ چاروں قبیلے جن سے چنگیز خاندان نے اپنا پہلا لشکر ترتیب دیا تھا۔ تمام کے تمام کوستان بھیل بھیل بیکال اور کوہ الطائی کے نیم دائرے میں بکھلے ہوئے کوہ کے شمال میں آباد تھے۔ قبیلہ کنکرات جس کی دو شیردہن کا انتخاب ہونا تھا وہ کوہستان بھیل بھیل کی ترائی اور مغل کے کوہی کے اوپر آباد تھا لیکن اب یہ تمام قبائل مغلیہ فتوحات کے ساتھ ساتھ اپنا اصل مسکن چھوڑ کر ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ قبیلہ کنکرات کی زیادہ تعداد جا موٹی خاتون اور شہزادی کو کاچین کی

دوسرے خان بایلیغ اور خٹا میں بکھار دی گئی تھی۔

پندرہ دن کا مقررہ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا اور اسی تیزی کے ساتھ کنکراتی دو شیردہن اپنی اپنے ورثا کے ساتھ خٹا بایلیغ میں اکٹھا ہو رہی تھیں۔ ذرائع آمد و رفت کی دشواریوں کے باوجود ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

ان لڑکیوں اور ان کے ورثا کے لیے ایک وسیع میدان میں بڑے بڑے خیمے اہستہ اہستہ کھڑے کیا اور ان کی تمام آسائیاں انہیں میسر تھیں۔ ان کے خیموں کے گرد سخت پہرہ لگایا گیا۔ کسی مغلیہ کی حیثیت کی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

پندرہ دن گزرنے کے بعد خاقان کو بتایا گیا کہ انتخاب میں حصہ لینے والی لڑکیوں کی تعداد تیرہ سو کے قریب پہنچ چکی ہے۔ خاقان کے حکم پر اس وقت میں حدود کا اور اضافہ کیا گیا لیکن یہ تعداد اس سے تیرہ سو پر آکر ایک لاکھ اب مزید انتظار کی ضرورت نہ تھی اس لیے قبلانی خان نے ساحروں اور شامانوں سے مشورہ کر کے انتخاب کا ایک دن مقرر کر دیا۔

ملکہ ایران کے انتخاب میں حصہ لینے والی ان لڑکیوں کے لیے میدان میں ایک بلند دھارا اور وسیع و بے لپٹی خیمہ لگایا گیا جس میں لباس تبدیل کرنے اور بناؤ سنگھار کے لیے تمام ضروری انتظامات کیے گئے تھے۔ خاقان نے حکم دیا کہ انتخاب سے ایک دن قبل تمام بیگمات اپنے زیورات اور لباس اس خیمے میں بچھا دیں تاکہ ہر لڑکی اپنی پسند کے لباس اور زیورات سے خود کو آراستہ کر سکے۔

اس خیمے کے باہر چار بڑی بڑی میزوں کو ملا کر ایک اونچی جگہ چھوڑ دیا گیا۔ جس میں روشنی فرس بچھا تھا۔ اس چھوڑے کے ایک طرف ایرانی سفیروں کی زرنگا چوکیاں اور دوسری طرف شہنشاہ چین خاقان اعظم قبلانی خان کا تخت ٹھاس تھا۔ تخت کی دائیں جانب بیگمات اور قبلانی خان کے بیٹا بیس بیٹوں، جس میں صرف بائیس جائز تھے، کے بیٹھے کا انتظام تھا۔ کسی داستانہ کو جس میں شرکت کی اجازت نہ تھی عائدین سلطنت میں سے صرف سات لاکھ سو اس وقت دانت عظمیٰ کے عہدے پر فائز تھا، مدعو کیا گیا۔ معزول لاما ناگس کو ولی عہد کی اتالیقی لالہ ریح کی پُر زور سفارش پر شرکت کی اجازت دی گئی۔ لالہ ریح نے خود بھی اس محفل میں شریک ہونے کی خواہش کی تھی۔ اس کیلئے شاہی خواتین میں ہلا جگہ مخصوص کی گئی تھی۔

خاقان قبلانی خان کے شامانوں اور ساحروں کا بتا ہوا انتخاب کا مبارک دن آہستہ آہستہ صبح سویرے گلنے سے پہلے تمام لڑکیاں اپنے خیموں سے بڑے خیمے میں منتقل ہو گئیں۔ خیمے میں زیورات اور کپڑوں کے ڈھیر لگے تھے۔ لڑکیاں نے اپنی مرضی کا لباس اور زیور پہن کر کپڑوں کی تعداد اس قدر زیادہ کی کہ لڑکیوں کو ان کے انتخاب

میں بڑی دقت پیش آئی۔ ہر لباس اور ہر زیور دیدہ زیب تھا وہ کسی کو پسند کرتیں اور کسی کو رد کرتیں۔ اس لیے انہیں صرف لباس بدلتے بدلتے کافی دھڑکھڑایا۔ ابھی ناؤ سنگھار باقی تھا۔

انتخاب کے میدان میں سوائے خاقان، لالہ رنج اور دونوں سفیروں کے بقیہ تمام لوگ پہنچ چکے تھے۔ خاقان سفیروں کے ساتھ اپنے دربار میں بیٹھا انتخابات مکمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ لڑنے والے جیسے ہی تیار ہو جائیں اسے اطلاع دی جائے لیکن اطلاع آتے آتے آدھا دن گزر گیا۔ خاقان کو بڑا غصہ آ رہا تھا مگر سعید تبریزی سکرا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ان درندہ صفت انسانوں کو کیا پتہ کہ جمال اور جمالیات کے کیا تقاضے ہوتے ہیں اور عورت کا بناؤ سنگھار کیا ہوتا ہے۔

ٹھیک بھری دوپہر میں خاقان کو لڑکیوں کے مکمل طور پر تیار ہونے کی اطلاع دی گئی۔ ہر چند کہ موسم خشک تھا لیکن دوپہر کو یوں بھی دھوپ میں تیزی آ جاتی تھی۔ بھر ایک نوکھلنے کا وقت ہو رہا تھا۔ دوسرے بیگمات دھوپ میں بیٹھے بیٹھے جنگ لگ چکی تھیں۔

خاقان نے شانوں اور ساحروں سے مشورہ کر کے اعلان کیا کہ انتخاب کھانا کھانے کے بعد ہوگا۔ خاقان کے اس اعلان سے باہر میدان میں بیٹھی ہوئی بیگمات کی جان میں جان اپنی لیکن لڑکیاں بگڑ گئیں۔ انہوں نے احتجاج کیا کہ کھانا کھانے سے ان کے پیڑ سے خراب ہو جائیں گے اور سنگھار بگڑ جائے گا۔ لیکن اس احتجاج سے خجے کے اندر، یکدم توڑ پڑا۔ خاقان کے خوف کی وجہ سے کسی کو آواز بلند کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب بھر اپنی اپنی جگہ آ بیٹھیں۔

اب دن ڈھل رہا تھا اور موسم خوش گوار ہو گیا تھا۔ خاقان بھی جمائوں کے ساتھ آگیا تھا۔ خاقان کے تخت پر بیٹھنے کے بعد سب اپنی اپنی جگہ ادب سے بیٹھ گئے۔ خاقان نے اشارے سے دونوں سفیروں کو اپنے پاس بلا کر اپنی بیگمات اور شہزادوں سے متعارف کرایا۔ اس تمام عرصے میں دونوں سفیروں کی نظریں بار بار سوخ رنگت والی لڑکی کی طرف اٹھتی رہیں جس کا تخت خاقان کے تخت کے پچھلے دائیں پاس کے برابر بچھا تھا۔ وہ دونوں کمال حیرت سے لالہ رنج کو دیکھ رہے تھے۔ شاید انھوں نے اس سے پہلے ایسا حسن کبھی نہ دیکھا تھا۔ خاقان نے سب سے آخر میں لالہ رنج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ مرحوم ولی محمد جنگ کم کی بیوہ ہے جسے شاہ غیاث خطاب دے کر کم نے اپنی بیٹی بنالیا ہے۔

سعید تبریزی لالہ رنج کو شہزادی کو کاجین سمجھ رہا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ اگر میں اس لڑکی کو منتخب کر کے ارغون خان کے پاس لے جاتا تو وہ اس انتخاب کی ضرورت دیتا۔

سفیر واپس اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئے۔ لڑکیوں کے نام کی فرست انہیں دیا کر دی گئی۔ ایک فرست خجے

کے پاس کھڑی ہوئی ناظمہ کو دی گئی تاکہ وہ اسی ترتیب سے ایک ایک لڑکی کو انتخاب کے لیے جلوہ گرے کرے۔ شام کو خاقان نے شام کو جاری تھی۔ خاقان جلد سے جلد انتخاب ختم کر کر عمل میں واپس جانا چاہتا تھا۔ اس نے سعید تبریزی کو مخاطب کر کے کہا:

”اے ایرانی بوڑھے۔ جلد انتخاب کر لے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے۔“

سعید تبریزی نے کھڑے ہو کر ادب سے جواب دیا:

”خاقان معظم! اگر ایک ایک لڑکی کو بلا کر انتخاب کرتے رہے تو میں تمہاری جینے کے برابر لگے گا۔“

خاقان بگڑ گیا۔ اس نے کہا:

”ہم کیسے یقین کریں کہ اتنا وقت لگے گا۔ تو انتخاب کو خواہ مخواہ کل پر ٹال رہا ہے۔“

سعید تبریزی مسامتہ سے بولا:

”خاقان معظم! میں تو شاہ ارغون خان کے سامنے بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ پھر خاقان کو کس طرح ذیوب دینے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ میں وقت کا پورا حساب لگا کر ثابت کر دوں گا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل درست ہے لیکن اس سے پہلے مجھے خاقان ایک پیالہ شربت پینے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔“

خاقان کو تبریزی کی بات بہت چھٹی لگی۔ اس نے کہا:

”اے ایرانی دانا! تیری باتیں بڑی دلچسپ ہیں۔ تو وقت کا حساب لگا کر بتا لیکن شرط یہ ہے کہ تجھے

کھنے کا کوئی سامان نہیں دیا جائے گا۔“

سعید تبریزی نے خاقان کی شرط مان لی۔ اسے شربت کا گلاس مہیا کر دیا گیا۔ سعید نے مزے لے لے کر شربت پینا شروع کیا۔ خاقان اور سب لوگوں کی نظریں سعید پر لگی تھیں۔ سب خاقان اور سعید کی نوک جھونک سے

لطف لے رہے تھے۔ تمام دربار میں صرف لالہ رنج کو یہ یقین تھا کہ سعید تبریزی کا حساب درست ہوگا۔

سعید تبریزی نے شربت پی کر گلاس کینز کے حوالے کر دیا۔ پھر وہ خاقان کی طرف دیکھ کر بولا:

”خاقان معظم! اس بات سے تو ضرور اتفاق کریں گے کہ جتنے وقت میں، میں نے شربت کا پیالہ ختم کیا ہے

کم از کم اتنا وقت تو ہر لڑکی کے انتخاب کے لیے درکار ہوگا۔“

”ضرور ضرور۔ ہم اتنا وقت تو ہر لڑکی کو ضرور دیں گے۔“ خاقان نے بے سوچے سمجھے کہہ دیا۔

سعید تبریزی نے اپنی بات کو اور مضبوط کرنے کے لیے کہا:

”اگر خاقان ہر لڑکی کو اتنا وقت نہ دیں گے تو لڑکیاں یہ شک کرنے لگیں گی کہ ان کے ساتھ بے انصافی

کلی گئی ہے۔ خاقان اس بات کو یقیناً پسند نہ فرمائیں گے۔“

ایرانی فاضل: تو تو بڑے کام کا آدمی ہے۔ خاقان کو تیرے جیسے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ کیونکہ تمہارے اپنا وزیر مالیات مقرر کر دیں۔
سعید بولا:

خاقان کی اس عزت افزائی کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں لیکن ایک تو میرا شاہ مجھے چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو گا۔ دوسرے میں خاقان کا وزیر مالیات بن کر اجمار ایرانی کے انجام کو نہیں پہنچنا چاہتا۔
خاقان اس طنز پر ہلکھلا اٹھا لیکن اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا:
اے دانادا فاضل! ذرا غور تو کر۔ ہم انتخاب کے لیے دس دن کس طرح مخصوص کر سکتے ہیں۔ یہ تو ہمارے بدردہ سر بن جائے گا۔

سعید بولا:

لیکن خاقان کو اس طرح انتخاب کا مشورہ کس احمق نے دیا تھا؟
خاقان نے کہا:

یہ مشورہ ہمارے وزیر مالیات سانگا کا تھا۔
سانگا نے شرم سے گردن جھکا لی۔ اسے بے وقوفی کا وہی ذمہ دار تھا۔
خاقان سعید تبریزی کی عقل کا قائل ہو گیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا:
اے ایرانی دانشور! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اس پر تو خاک ڈال اور اب کوئی ایسی تدبیر کر کہ یہ کام بخیر و خوبی جلد پلے انجام کو پہنچ جائے۔
سعید نے جواب دیا:

خاقان: میرے آقا نے میرے سپرد انتخاب کا کام کیا ہے۔ اس کے انتظام میں، میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا۔ اگر خاقان یہ ذمہ داری بھی میرے سر ڈالنا چاہتے ہیں تو میں اسے بہت جلد ٹٹا سکتا ہوں۔
تو یہ کام کتنے دن میں کر سکے گا؟ خاقان نے پوچھا۔

تبریزی نے جواب دیا:

خاقان مجھے جتنا بھی وقت دیں گے اسے اتنے ہی وقت میں سر انجام دوں گا۔
خاقان نے کہا:

ہم چاہتے ہیں کہ تمام مرحلے ایک ہفتے میں طے ہو جائیں۔

خاقان۔ اگر میں انتخاب ایک ہفتے میں ختم کروں تو پھر مجھ میں اور پہلے انتظام کرنے والے میں کیا

خاقان نے کہا:

ہم کسی کی حق تلفی نہیں کرنا چاہتے لیکن تو یہ کیا جھگڑا لے بیٹھا۔ تو نے وقت کا حساب لگانے کو کہا تھا۔

سعید تبریزی مسکرایا اور بولا:

خاقان اعظم! وقت کا حساب تو میں شرت پینے کے دوران ہی لگا چکا تھا۔

وہ کیسے؟ خاقان چڑھ گیا:

”میں صاف صاف بتا رہا تھا۔ ابھی سیدھی باتیں بالکل پسند نہیں۔“

سعید تبریزی نے خاقان کو کھجائے ہوئے کہا:

”خاقان معظم! ایک دن میں چار پہر ہوتے ہیں۔ جتنے وقت میں، میں نے ایک پیالہ شرت پیایا ہے اس رفتار سے میں ایک پہر میں ۳۶ پیالے شرت پی سکتا ہوں اور چار پہر یا ایک دن میں ۱۴۴ پیالے پیے جا سکیں گے۔ یہی تعداد ایک دن میں لڑکیوں کے انتخاب کی ہوگی۔ اب سیدھی بات یہ ہے کہ ۱۴۴ لڑکیوں کے انتخاب کے لیے ایک دن درکار ہو گا تو ایک ہزار تین سو پچاس لڑکیوں کے لیے دس دن صرف کرنا ہوں گے۔ وہ بھی اس طرح کہ ہم دونوں سفیر بغیر کچھ کھائے پیے تاکہ دن انتخاب کا کام کرتے رہیں۔
خاقان کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ وہ حیرت سے تبریزی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے نظر میں ہٹا کر اس نے لاما فاکس کو دیکھا اور کہا:

”لاما فاکس! تو تو بہت عقلمند ہے۔ بتا یہ کیسا حساب ہے اور اس میں کہاں تک صداقت ہے؟“

لاما فاکس نے فوراً جواب دیا:

”خاقانوں کے خاقان! سعید تبریزی کا حساب بالکل درست ہے۔ دس دن کا وقت صرف ہو گا۔“

خاقان کو فاکس کی بات پر یقین نہ آیا۔ وہ سانگا کی طرف مخاطب ہو کر بولا:

”سانگا! تو خاقان قبلائی خان کا وزیر مالیات ہے تو اپنا حساب لگا کر بتا۔“

سانگا کو موقع مل گیا تھا۔ وہ پہلے ہی حساب لگا چکا تھا۔ اسے مجبوراً کہنا پڑا:

”خاقان عالی مقام! سعید تبریزی کا حساب ہر طرح کے شک و شبہ سے بالکل درست ہے۔ میں نے حساب

لگا کر دیکھا ہے۔ دس دن بالکل درست ہیں۔“

خاقان کو بھی مجبوراً تسلیم کرنا پڑا لیکن وہ تبریزی کی عقل و دانش پر بہت حیران تھا۔ خاقان نے تبریزی کو اپنے پاس بلایا اور ایک کینز سے تبریزی کے بیٹھنے کے لیے ایک چوکی منگوائی۔ خاقان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سعید بیٹھ گیا تو خاقان نے کہا:

فرق رہ جائے گا۔ اگر خاقان میرا مشورہ قبول کریں تو یہ مسئلہ آج ہی حل ہو سکتا ہے۔

"کیا کہہ رہے تھے تو ہم کسی کی حق تلفی نہیں کر سکتے۔" خاقان کو گمان نہ تھا کہ شاید سعید تبریزی، شہزادی کوکا کے منتخب ہونے کا اعلان کر کے جھگڑا طے کرنا چاہتا ہے۔

سعید نے کہا:

"میں خاقان کی آن پر کوئی حرف نہ آنے دوں گا۔ ہر لڑکی کو اس طرح انتخاب کے لیے پہلے سے بارہ گاہقہ ملے گا اور وہ خاقان کی شکر گزار بھی ہوگی۔"

"تیری باتیں ہماری سمجھ سے باہر ہیں ایرانی۔ خاقان نے زچ ہو کر کہا:

"تو جو چاہے کر مگر اس جلد ختم کر دے۔"

اس گفتگو کے بعد سعید تبریزی اٹھ کر اپنے ساتھی مغل سردار کے پاس گیا۔ اس سے کچھ باتیں کیں۔ پھر کینیزوں کو حکم دیا کہ یہ میزیں بنادی جائیں اور زمین پر اعلیٰ قسم کا فرش بچھایا جائے۔ کینیزوں نے میزیں بنا کر قیمتی فرش بچھادیا۔

سعید تبریزی نے امید دار لڑکیوں کے خیمے کی ناظمہ کو اطلاع بھجوائی کہ تمام لڑکیوں کو ایک ساتھ میدان میں بھیجا جائے۔

خاقان بڑے غور اور دلچسپی سے سعید تبریزی کے کام اور احکام کو دیکھ رہا تھا۔ شہزادی کوکا چین کے لیے خصوصی طور پر ایک چھوٹا ٹیمپل نصب کر کے تمام ضروری چیزیں مہیا کر دی گئی تھیں۔ اسے عاکلہ کنرا منی لڑکیوں سے الگ رکھا گیا۔ اس کی رگوں میں شاہی خون تھا اس لیے اس کا انتخاب بھی شاہی طریقے سے ہونا تھا۔

لڑکیوں کا میدان میں داخلہ بڑا کیف آگئیں اور شب آور تھا۔ آگے آگے خیمے کی ناظمہ، پیچھے پیچھے لڑکیاں۔ لڑکیاں میدان میں یوں اٹھلائی اور بل کھاتی داخل ہوئیں جیسے نسیم بحر کے سبک جھونکے اٹھکھیلنا کرتے ہیں۔ داخل ہوں۔ میدان جھگڑا اٹھا جیسے صبح دم سورج کی کرنوں سے دیت کے ذرے روشن ہو جائیں، جیسے ہزاروں تندہ شبنم دب جھور میں ایک ساتھ روشن کر دی جائیں۔ نیلے نیلے، اودے اودے، پیلے پیلے پیریں۔ کوئی دھانی لباس میں تو کوئی رنگ۔ رنگی کپڑوں میں قوس قزح بنی ہوئی۔ سب کے رنگ ایک گھر روپ جدا جدا رنگی تپاں پرے اٹھو۔ نقشے، نیکیے نقشوں والے کھڑے۔

جب انہیں سعید تبریزی کے حکم پر قطار کے اندر کھڑا کیا گیا تو یوں محسوس ہوا جیسے گلشن کی دوش پر مختلف پھولوں کے پودے لگا دیے گئے۔ رنگس، ناسترن، جوبی، موتیا، کسیری، موگرا، چنپا، چینی اور بیلا۔ گلستان کا کون سا پھول تھا جس کی رنگت، انزاکت اور لطافت ان لڑکیوں میں موجود نہ تھی۔ جسم سانچے میں ڈھلے ہوئے بنے

دھوپ نظر دیتے ہوئے۔ رخسار کے گلابی رنگ سے سیب شرابیوں۔ ابرو کے خم سے خنجر بانی بانی ہو جائیں۔ زنجیر کہ دو شیرازوں کی قطاریں کیا تھیں، دریائے حسن کی بل کھاتی قوسیں تھیں۔

عمر سے گزری ہوئی بیکات انہیں دیکھ کر حسد سے جل اٹھیں لیکن خاقان انہیں ہنکھیں بھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ شاداب جوانیوں کا ایسا اجتماع اس کی نظروں سے پہلے کبھی نہ گزرا تھا۔ ایران سے آنے والے مغل مرداؤں کا ایسا بہوت ہوا کہ وہ یہ بھی بھول گیا کہ اسے کون سا فرض ادا کرنا ہے۔ وہ انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ بس دیکھے جا رہا تھا۔ اگر اس وقت کوئی بوڑھے لاما فاکس اور وزیرالیاں مانگنا کے دل ٹوٹ سکتا تو اسے معلوم ہوتا کہ ان کے دلوں میں بھی گدگد پیدیا ہو گئی ہے اور وہ دل دم توڑتی عمر کی کمزور دیواروں سے منہ لے نہیں سنبھلتے تھے۔

صرف للدرخ اور سعید تبریزی ہی ایسی دو ہستیاں تھیں جنہوں نے اس کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ للدرخ لہجہ سپاہ اور تاثرات سے خالی تھا اور سعید تبریزی اپنے کام میں مشغول۔

جس طرح بازار مصر میدان قسطنطنیہ اور روم کے گلی کوچوں میں کینیزوں اور غلام فروخت ہوتے تھے، اسی طرز پر اس انتخاب کی بنیاد رکھی گئی۔ وہاں خریداروں کو خریدنے وقت کینیز کے جسم کو ٹٹولنے کی عام اجازت تھی، ہاں منتخب کرنے والوں کو وہی حقوق حاصل تھے۔ فرق تھا تو صرف یہ کہ وہاں فروخت ہونے والی کینیز بے حصہ جموں کو سمیٹتی تھیں، یہاں انتخاب میں کامیاب ہونے کے لیے ہر دو شیرازہ سینہ تانے دعوت سپردگی دے رہی تھی۔ وہاں بولی دینے والے ہزار، تو یہاں صرف ایک ایرانی مغل سردار، جس کا فیصلہ ذرے کو آفتاب اور افلاس سے کھلی ہوئی دو شیرازہ کے سر پر ملنے ایران کا ناج رکھ سکتا تھا۔

سعید تبریزی نے انتخاب کے پورے اختیارات مغل سردار کو سونپتے ہوئے اسے ہدایت کی: "تو روم خان۔ تم لڑکیوں کی ہر قطار کے سامنے سے گزرنا اور خوب دیکھ بھال کے ہر قطار سے تین لڑکیوں کا انتخاب کرو۔"

"لیکن ہمیں تو صرف ایک لڑکی پسند کرنا ہے۔" تو روم خان نے جرح کی۔ "دوسرے دور میں ان کی تعداد ایک تہائی رہ جائے گی۔" تبریزی نے موٹی عقل والے مغل سردار کو بھجایا۔

اس کند ذہن کے ذہن میں یہ بات بھی نہ سمائی۔ اس نے پھر جرح کی۔ بولا: "لیکن ہمیں تو ایک۔۔۔۔۔۔" بحث مت کر دو۔" تبریزی کو اس کی عقل پر رونا آنے لگا:

گھٹے گھٹے یہ تعداد ایک رہ جائے گی:

توروم خان کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا لیکن تبریزی کے مشورے کے مطابق لڑکیوں کی قطاروں کے سامنے پہنچ گیا۔

اب وہ پہلی قطار کی پہلی لڑکی کے سامنے تھا۔ سیلاب حسن و جوانی سے اس کی آنکھیں چندھیا ہی ہوئے تھیں اور ہاتھ پیروں میں ایک غیر محسوس مسکن ہٹ موجود تھی۔ توروم خان نے ملکہ ایران کے تاج کے تصور میں کوئی بھی دوشیزہ کا طرف ہاتھ بڑھایا۔ لڑکی کو تاج ایران اپنے سر کی طرف آمادہ کھائی دیا۔ توروم خان کے گستاخ ہاتھ لڑکی کی جوانی کے دھجے سے ٹوٹے ہوئے بدن کے جوڑے جوڑے سے ٹکراتے ناز گئے۔

اب توروم خان دوسری لڑکی کے سامنے تھا۔ لڑکی کے جسم میں گدگدی سی پیدا ہوئی اور وہ مل کھا کر دہلے ہو گئی۔ تیسری لڑکی جھک کر توروم خان کے غلے سے لگ گئی۔ اس لطیف بوجھ سے توروم خان مست ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس وقت اس کے کان میں تبریزی کی آواز آئی:

"توروم خان!"

اور توروم خان مستی میں گر آئے۔

پہلے مرحلے میں ایک سو بیس دوشیزاؤں میں منتخب ہوئیں لیکن یہ مرحلہ ابھی نامکمل تھا۔ شہزادی کو کاچین نے ابھی اس میں حصہ نہ لیا تھا۔

سعید تبریزی نے خاقان سے شہزادی کو پیش کیے جانے کی درخواست کی۔ خاقان نے مسکرا کر اجازت دے دی۔ شہزادی کو اطلاع دی گئی۔ خیمہ کا پردہ اٹھایا گیا۔ زریں مگر کنیزوں کا دستہ خیمے سے نکلا۔ ان کے پیچھے شہزادی کو کاچین فتنے جگاتی اور محشر اڑھاتی ہوئی نمودار ہوئی۔

شفیق کارنگ فتنی ہو گیا۔ چکر اپنی چال بھول گئے اور آفتاب شہزادہ کی سیاہ چادر میں منہ پھیلنے مغرب کی طرف جھک گیا۔

شہزادی نے میدان میں قدم رکھا تو بہاریں استقبال کو دوڑیں۔ مضاموں نے مستی میں برساتیں۔ اداؤں نے قدم چومے غز سے پتھر دوڑ گئے اور پھر جیسے چرائیوں میں روشنی نہ رہی۔ سرور قیامت، غنچہ دہن، ہونٹ گلاب کی پیکھر ٹپان، سرگمیں آنکھوں میں سرخ دھبے جیسے شراب کے چھلکے ہوئے۔ یہ وہ کٹورے، ازلیں، ستاروں پر اترتے ہوئے مار سیاہ، جن کا کاٹ پانی نہ مل سکے۔ کھڑی جھونپیسے مغل تیر انداز ایک ساتھ ہزاروں تیر مردانے پر تیار۔

شہزادی نے دربار پر نظر ڈالی۔ کچھ جل گئیں، کچھ شرمائیں۔ شہزادی کو کاچین کو دیکھ کر لالہ رخ کو اس

ہوئی میں ابھی جوانی یاد آگئی۔ اس نے حسین امیر نظروں سے شہزادی کو دیکھا۔ شہزادی سے آنکھیں ملیں تو لوگ کاچین اس حسن بے مثال کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔

شہزادی منتخب کرنے والوں کے سامنے پہنچی۔ ایرانی مغل سردار رجب حسن کی تاب نہ لاسکا۔ اس کی ہانگ ہو گئی۔ اس نے شہزادی کو متاعی نظر سے دیکھا تو شعر کہنے کو جی چاہا۔ مصور کی نظر ڈالی تو خوف کلم کو شہزادینے پر مائل ہوا اور رجب سنگھتر اس کی آنکھ سے جھکا تو شہزادی کا بت نہ لٹھنے کے لیے دل بے چین رہا۔ شہزادی، فردوسی کے شانہ سے کا جواب، انوری کے قصیدوں کا توڑ اور سعدی کی غزلوں کا پھوڑ تھی۔ اس وقت مانی و ہزاراد کا شاہکار ادب و خیال کی سبک رباعی بنی ہوئی تھی۔ اس کا چاندنی کے عرق سے دھلا ہوا بدن ہلکے سے بنے ہوئے واسکٹ نکالتے تھے اس طرح جھانک رہا تھا جیسے حسن و جوانی کا فوارہ چھوٹ رہا ہو۔

انتخاب کا پہلا دور ختم ہو گیا اور شہزادی کو کاچین کو منتخب شدہ دوشیزاؤں میں شامل کر لیا گیا۔ ممکن تھا کہ انی اور درگزر سے لیکن تمام منتخب شدہ لڑکیوں نے دوسرے دور میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے زبان ہو کر کہا کہ وہ شہزادی کو کاچین کے حتیٰ میں دستبردار ہوتی ہیں کیونکہ شہزادی کو کاچین کا مقابلہ کر کے وہ ہلاکتیں ہو نا چاہتیں۔

سعید تبریزی اور توروم خان نے لڑکیوں سے اتفاق کرتے ہوئے شہزادی کو کاچین کو شاہ ایران کی ملکہ اور منتخب کرنے کا اعلان کر دیا۔

خاقان نے اس فیصلے پر خوشی کا اظہار کیا۔ بیگمات نے حسبِ توقع شہزادی پر زور دیا اور ہر پھادر کیے۔ مانگا اور اس نے خاقان کو مبارک باد دی۔ لالہ رخ نے وہ تاج جو اسے ولی مملکت کی بیوہ کی حیثیت سے خاقان نے عطا فرمایا شہزادی کو کاچین کے سر پر رکھا اور اسے کلچے سے لگا کر بزرگانہ دعائی دیں۔ محفل پر غنچہ دہن اور بیگمات دوسرے لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔

نہرے دن شانوں، نوانوں اور ساحروں نے بڑی ساوگی سے شہزادی کو ارغون خان کی بیوی بنانے کی ناکہ اور غون خان کی عدم موجودگی میں خاقان نے اس مسئلے میں کسی حیثیت یا جتن کا اہتمام نہ کیا۔



لوگوں کو جب ختا کے دورے سے واپس آیا تو اسے شہزادی کے انتخاب اور شاہ ایران ارغون خان کی بیوی

چپ ہو جا ایرانی بوڑھے تو اپنے الفاظ واپس لے ورنہ ہم تیرا سر قلم کرا دیں گے۔

علاؤ کامر حاضر ہے خاقان، تبریزی نے جرات سے کہا:

خاقان، مسلمان شہیدوں میں ایک اور شہید کا اضافہ کرنے کی طاقت ضرور رکھتے ہیں لیکن مجھے ان کی پر عبور نہیں کر سکتے۔

خاقان بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ وہ سعید تبریزی کو قتل کر کے ارغون خان کی مخالفت اور شہزادی کو کاجین خانی کو التوا میں نہ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے سعید تبریزی کو غلط ناک نتیجے کی دھونس دے کر مرعوب کرنا چاہا۔

تبریزی نے دندان شکن جواب دے دیا۔ خاقان کو خطرہ تھا کہ اگر اس نے شہزادی کے بارے میں اپنے کوئی فیصلہ کر لیا تو ایرانی اس پر راضی نہ ہوں گے اور اسے ارغون خان کی ناراضگی مول لینا پڑے گی۔

تجانی خان نے مجلس مشاورت ملتوی کر دی۔



خاں گاہ شاہی میں حسب دستور تین درخشاں، قبلانی خان کی ہوس کا منگوار ہونے کے لیے موجود تھیں۔ انہوں نے قلعہ کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے پہلے ایک بالٹی سفید گھوڑی کے دودھ کی چڑھائی کی اور پھر ایک بالٹی سیاہ گھوڑی کے دودھ کی چڑھائی کی۔ اس نے پہلے ایک بالٹی سفید گھوڑی کے دودھ کی چڑھائی کی اور پھر ایک بالٹی سیاہ گھوڑی کے دودھ کی چڑھائی کی۔ اس نے پہلے ایک بالٹی سفید گھوڑی کے دودھ کی چڑھائی کی اور پھر ایک بالٹی سیاہ گھوڑی کے دودھ کی چڑھائی کی۔

خاقان نے دوا کیوں کو آغوش میں دبا کر یوں جھنجھوڑا شروع کیا جیسے شکاری کتے شکار پر گرتے ہیں۔ بلان شہزادہ کا جسم کے نیچے دبی رہیں۔ سسکتی رہیں لیکن سپردگی میں تامل نہ کیا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ شاید یہ لاپرواہی اور سخی رات ہو، صبح دم تو انھیں اس جبری شب بوسہ کی داستان مزے لے لے کر اپنی سیلیوں پر لٹا کر یوں کو معافی تھی۔ سب ہی یہ داستانیں صبح کو دہرائیں۔ جھنجھوڑا درخشاں یہ باتیں تعجب اور حیرت سے سنیں اور ایرانی سچ جھوٹ کے میزان پر تولتے ہوئے حیرت منکرا دیں۔

عصمت کے ان تینوں چراغوں کی لوں رات بھر بھڑکتی اور ڈوبتی رہیں۔ سویرا ہو گیا۔ خاقان کے مزاج میں اب تک چڑچڑاہٹ موجود تھی۔ اس نے بیدار ہوتے ہی سعید تبریزی کو اور غصہ آگیا۔ اس نے انعام سے لاپرواہ ہو کر کہا،

خاقان معظم! مجھے لاما فاکس پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں اس بزرگ کی عزت کرتا ہوں لیکن میں مسلمان ہوں اور یہ ناممکن ہے کہ میں مسلمانوں کے قاتلوں سے کسی ذاتی مسئلے میں رائے لوں۔

میں جانے کا حال حلوم ہوا۔ اس کے دل سے ایک ہلکے اٹھی اور وہ کھینچ تھا کہ رہ گیا۔ وہ تو اس محلے بے ہلکے بارے میں کچھ اور ہی سوچے بیٹھا تھا۔ اسے شہزادی سے ہم کلام ہونے کا موقع کئی بار ملا تھا۔ شہزادی بھی اسے کسی سزا تک پسند کرتی تھی لیکن تعلقات دید شہزادی سے بڑھ گئے تھے کہ شہزادی اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔ اب شہزادی کے خاتمہ واپس جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ خاقان کی ممان اور شاہزادہ کی امانت تھی۔ خان بائیک کے شاہی حکام تک اس کی رسائی کسی طرح ممکن نہ تھی۔ چنانچہ فی الحال اس نے اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔

مارکو پولو خاقان کا میسر مل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی خلوت و جلوت کا ماحول بھی تھا۔ اس چالاک نرالی نے خاقان پر ایسا دماغی ناز ملا تھا کہ عمر کے فرق کے باوجود خاقان، مارکو کو اپنا گہرا دوست سمجھتا اور ہر معاملے میں اس کی رائے کو اہمیت دیتا۔

ایک رات خاقان نے ایک خصوصی مجلس شوریٰ کی تاکہ ایرانی سفیروں سے تبادلہ خیال کر کے شہزادہ کا ایران بھیجے کا فیصلہ کیا جلتے۔ اس مجلس میں خاقان نے لاما فاکس، سانگا اور مارکو پولو کو بھی بلوایا۔ تور دوم خاں اور سعید تبریزی پہلے پہنچے۔ انھیں خیال بھی نہ تھا کہ اس خالص نجی مسئلے پر گفتگو میں کسی اور کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا ہی تھا کہ یہ تینوں دربار خاص میں آگئے۔ تور دوم خاں مغل تو خاموش رہا مگر سعید نزاب کے مسئلے اٹھنے لگا۔ لڑکیاں دو رہا تھ باندھے یوں سہمی کھڑی تھیں جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر خوفزدہ ہوتے ہیں۔

تبریزی سانگا اور مارکو پولو کو دیکھ کر بھڑک اٹھا۔ اس نے کہا،

خاقان معظم! ہم اس وقت ایک نجی موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں۔ انہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تب تو اس بات پر ہے کہ یہ خاقان کی اجازت کے بغیر اندر کیسے آگئے۔ یہ شاہی آداب کی خلاف ورزی نہیں؟ سعید تبریزی کے اس کھڑا انداز گفتگو سے آنے والے جہاں تک پہنچ چکے تھے وہیں دم بخود ہو کر کھڑے ہو گئے۔

خاقان نے مسکرا کر کہا،

اے ایرانی دانشور! فکر نہ کر یہ لوگ تیری طرح دانشور ہیں۔ ہم نے خود انہیں شرکت کا حکم دیا ہے۔ سعید تبریزی کو اور غصہ آگیا۔ اس نے انعام سے لاپرواہ ہو کر کہا،

خاقان معظم! مجھے لاما فاکس پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں اس بزرگ کی عزت کرتا ہوں لیکن میں مسلمان ہوں اور یہ ناممکن ہے کہ میں مسلمانوں کے قاتلوں سے کسی ذاتی مسئلے میں رائے لوں۔

خاقان بھی غضب ناک ہو گیا اور چیخ کر بولا،

خاقان کے پاس پہنچ گئے۔

سیفر ہے۔

”تبریزی خاقان!“ تبریزی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا:

”ہمارا مذہب کہتا ہے کہ جابر سلطان کے سامنے کھڑی کرنا جہاد ہے۔“

”چپ رہ۔ تو میرے جلال کو لگا کر رہا ہے۔“ قلمی خان غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔

توروم ڈر گیا کہ کیسے معاملہ اور نہ بڑھ جائے۔ اس نے ران تو خاقان کے بستر پر رکھ دی اور پھر

وٹی پوٹی فارسی میں تبریزی سے کہا:

”مجھے اپنے ملک ایران کی قسم، خاموش ہو جا۔“

تبریزی خاموش ہو گیا۔ خاقان نے جلد ہی غصے پر قابو پا لیا۔ اسے افسوس ہوا تھا کہ اس نے ناحق رات

بال بات چیر دی۔ خاقان نے توروم خان سے نرم آواز میں کہا:

”توروم۔ تیرا ساتھی عقل مند تو بہت ہے لیکن کسی وقت دیوانوں جیسی باتیں کرنے لگتا ہے تو اسے مجھادے

ہم اس سے ناراض نہیں۔ ہم نے مشورے کے لیے اسے بلایا ہے۔“

تبریزی بھی نرم پڑ گیا۔ اس نے کہا:

”میں خاقان کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے مشورے کے قابل سمجھا۔“

خاقان اس بات سے بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا:

”اے ایرانی فاضل! ہم تجھے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہاں تجھ سے مشورہ یہ کرنا ہے کہ شہزادی

کاچین کو ایران کس راستے سے بھیجا جائے؟“

”جس راستے سے ہم آئے ہیں۔“ تبریزی نے جواب دیا۔

خاقان کے چہرے پر فکر کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس نے کہا:

”ایرانی عالم! تو خدا کو نہیں جانتا۔ اس نے ہم سے دشمنی باندھ رکھی ہے۔ ہم اسے ڈھیل دے رکھے ہیں کہ

ہمیں غفلت ہے اور ایک نہ ایک دن ہمارا غلام ہو جائے گا لیکن اس وقت اس پر اعتماد کرنا عقل مند نہیں۔

اوی کو خشکی کے راستے سے ایران بھیجنا کسی طرح ممکن نہیں۔“

”لیکن خاقان! تبریزی بولا:

”ہم تو اسی کے علاوہ کس سے ہو کر گزر رہے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہم ٹائی کو جا رہے ہیں۔“

”کیا اسے یہ معلوم تھا کہ تم شہزادی کو کاچین کو لینے جا رہے ہو؟“ خاقان نے سوال کیا۔

”ہم نے قائد و خان کے آدمیوں کو بتایا تھا کہ شاہ ارغون کی حکمت کے انتخاب کے لیے ہمیں خاقان کے

خواب گاہ کے دروازے پر ایک کینز۔ نے ان کی رہنمائی کی۔ خاقان صبح تک خواب گاہ کے عقب کے

کمرے میں لیٹا تھا۔ تبریزی کے کانوں میں قلمی خان کی رنگین راتوں کی کہانیاں پڑ چکی تھیں۔ جب وہ خواب

گئے گزر رہا تھا تو وہاں کی ہر چیز نے ہر کہانی کی تصدیق کر دی۔ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہ تھی۔ ہر چیز الٹا پڑی۔ ہند

کہ تمام بستر اسی انداز سے اٹے ہوئے تھے جیسے یہاں کی ہر چیز کی غلطی لی گئی ہے۔ شراب کے ٹوٹے ہوئے

مٹکے، بدبودار دودھ کی بالٹیاں، سونے کے خریکوں میں بھری ہوئی منالکی تصاویر۔ غرض ہر چیز پر خنداں

آئی ہوئی تھی۔

یہ عجیبی کرہ خواب گاہ کی بہ نسبت چھوٹا تھا لیکن اس سے زیادہ آراستہ تھا۔ دیواروں پر چٹے ہوئے

سونے کے پتروں سے نقش رنگا بنے تھے۔ یہ کرہ عقب میں تھا اس لیے اس میں اب تک جلتی ہوئی تندہیں

رات کی یاد میں ماتم کناں نظر آتی تھیں۔

قلمی خان مہری پر بیٹھا کسی جانور کی ٹھنی ہوئی ٹانگ کو چھوڑ رہا تھا۔ بغیر منہ ہاتھ دھوئے (جگہیزو)

دستور تیا میں مغلوں کے منہ ہاتھ دھونے یا غسل کرنے کا کوئی تذکرہ نہیں۔ ساحر اور شامان دفن کرنے سے

پہلے انہیں مزد و غسل دیا کرتے تھے۔ قلمی خان نے زبردستی مسکرنے کی کوشش کی۔ تبریزی اور توروم خان

کو ایک چھوٹے تخت پر بیٹھے گا اشدہ کیا۔ گھوڑی کے دودھ کی بدبو کے جیسے خواب گاہ سے اس کمرے میں

آ رہے تھے۔

تبریزی کو بڑی گھن آئی اور طبیعت متلنے لگی لیکن خاقان کا پاس ادب تھا، برداشت کرتا رہا۔ خاقان نے

آدھی چھوڑی ہوئی ران توروم خان کی طرف بڑھادی۔ توروم خان کو تو جیسے نعمت ملی گئی۔ مغل عدو بار لیل کے لیے

یہ بہت بڑی عزت افزائی تھی کہ خاقان اپنی کوئی ٹھوٹی چیز کسی امیر کو عنایت کر دے۔

خاقان نے کعبہ کی چادر سے غلیظ ہاتھ اور منہ پونچھا۔ پھر تبریزی سے مخاطب ہوا:

”تبریزی! تو تو برا عالم ہے۔ پھر تو نے رات کو مار کو اور ساگ کی توہین کیوں کی؟ وہ دونوں ہماری جیسی

مشاورت کے ارکان ہیں۔“

تبریزی نے بے جھجک جواب دیا:

”خاقان! اعظم! حقیقت بیان کرنا توہین نہیں ہوتی۔ میں نے تو وہی کچھ کہا جو مافی ٹو میں مسلمانوں پر گزرا۔

اگر اسے کوئی اپنی توہین سمجھ لے تو اس میں میرا کیا قصور؟“

قلمی نے گہر کر کہا: ”اے ایرانی! تو محض اس وجہ سے منہ زوری کر رہا ہے کہ تو ارغون خان کا

اس سے تو انکار نہ تھا کہ نهرانی سمندری راستوں سے واقف ہیں لیکن وہ مارکو پولو کے ساتھ سفر کرنے پر تعلق
نہ نہ تھا۔ اس نے کہا:

"خاقان۔ یہ تو ٹھیک ہے لیکن جب تک شاہ ارغون خان سے میں اس کی اجازت نہ حاصل کر لوں، میں
یہ کہہ سکتا ہوں، اگر شاہ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو شہزادی کو سمندری راستے سے بھیجنے میں کوئی حرج نہیں!"
"لیکن ایران سے اجازت منگوانے میں تو کافی عرصہ لگ جائے گا۔" خاقان نے تشریف لے کر اٹھا لیکن
تبریزی نے کہا:

"خاقان کو ہر طرح کا اختیار ہے لیکن اگر خاقان نے شہزادی کو ارغون خان کی منظوری کے بغیر بحری راستے
سے بھیج دیا اور کوئی ایسی وسی بات ہو گئی تو پھر اس کی پوری ذمہ داری خاقان پر آ جائے گی۔ میں خاقان
کو کوئی ایسا مشورہ نہیں دے سکتا جس میں خاقان کی بدنامی کا ذرا سا بھی شائبہ ہو۔
یہ بات خاقان کی موٹی عقل میں نہ صرف فوراً اٹھتی بلکہ اس کے دل میں اتر گئی۔ اس نے کہا:
"تبریزی، تو بھلے جیسے بڑے دربار میں رہنے کے قابل ہے۔ اچھا تو یوں کر کہہ دو کہ شہزادی کو فوراً ایران بھیج
کر اجازت منگوائے۔"

سعید تبریزی بولا:

"یہ خدمت میں خود انجام دوں گا۔
"کیس تو ایران میں بیٹھ کر تو نہیں رہ جائے گا؟ خاقان نے ہنس کر کہا۔
سعید نے کہا:

"خاقان! میرے شامے میرے سپرد ایک خدمت کی ہے۔ میں اسے پوری کر کے اس کے اعزاء کو مال
کے اچھا ہوں۔"

سعید تبریزی کو ایران جانے کی اجازت دے دی گئی لیکن قبلائی خان کا خیال درست نکلا۔ شہزادی کو کاجین
کے انتخاب کی خبر خان بالیغ (مائی ٹو) سے نکل کر چین کی سرحدوں کو عبور کرتی ہوئی خاقان دشت قائد و خان کے
ہاتھ تک پہنچ چکی تھی۔

قائد و خان کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ شمالی ماز پر قبلائی خان کے سپہ سالار بابا یان کے مقابلے پر اپنا لشکر
فوراً چند تیز رفتار دستوں کے ساتھ جنوب کی طرف چلا۔ اسے یہ بھی بتایا گیا کہ شہزادی کو کاجین بہت جلد ایران
کے لیے روانہ ہونے والی ہے۔

قائد و خان نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شہزادی کو کاجین کو گرفتار کر کے قبلائی خان سے سودے بازی کرے گا۔

کے پاس پہنچا ہے۔ تبریزی نے سادگی سے جواب دیا۔
خاقان نے فکر مند لیجے میں کہا:

"ایران کی ملکہ اور قبلائی خان کی بیٹی شہزادی کو کاجین میں بڑا فرق ہے۔ اگر شہزادی اس کے ہاتھ
گئی تو پھر ایک ایسی خوفناک جنگ ہوگی کہ نیلے آسمانوں پر پرانے خاقانوں کی روحیں تڑپنے لگیں گی۔ ہم یہ غلط
قدم اٹھانے پر آمادہ نہیں۔"

تبریزی نے شاید اس انداز سے اس مسئلے پر غور نہ کیا تھا۔ بات اہم تھی۔ لہذا ہر خاقان کا خدشہ درست
معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے سوا اسے کوئی اور راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے کہا:

"خاقان کا خیال درست معلوم ہوتا ہے لیکن شہزادی کو کسی نہ کسی طرح تولے جانا ہی ہے۔"

خاقان اس کے منہ سے یہی بات نکلتے کا خواہش مند تھا۔ اس نے فوراً کہا:

"اے عاقل! اگر تو ہماری بات سے اتفاق کرے تو ہم تجھے اور شہزادی کو سمندری راستے سے ایران بھیج دیتے
ہیں۔"

تبریزی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے پوچھا:

"لیکن بحری راستے کی رہبری کون کرے گا؟ میں تو ان راستوں سے بالکل ناواقف ہوں۔"

"اب تو ہماری بات پر غور کر۔" خاقان نے کہنا شروع کیا:

"ہم نے اتنے بھر تیری باتوں پر بہت سوچا اور ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پولو خاندان ولے ہمارے
ہمدرد نہیں بلکہ مفاد پرست ہیں۔ تیرا کیا خیال ہے تبریزی؟"

تبریزی خاقان کی بات کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ اس نے کہا:

"خاقان! میرے خیال میں یہ خاندان مفاد پرست ہونے کے ساتھ ساتھ مذہب پرست اور زبردست بھی
ہے۔ یورپ کے نهرانی، مغل درباروں میں راجوں اور خوبصورت لڑکیوں کو عیسائی مذہب پھیلانے کے لیے لاتے
ہیں اور یہاں سے دولت اکٹھی کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔"

خاقان بولا:

"ہمارا بھی یہی خیال ہے۔ ہم اس خاندان سے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں۔ مارکو اور اس کے دوسرے ساتھی
دینیں واپس جانے کے خواہش مند ہیں۔ یہ لوگ سمندری راستوں سے اچھی طرح واقف ہیں مگر تیری غلامی ہو
تو ہم تجھے اور شہزادی کو ان کے ساتھ ایران بھیج دیتے۔"

سعید تبریزی کی سمجھ میں اب آ گیا کہ خاقان، مارکو اور اس کے خاندان والوں کو برا بھلا کہوں کہہ رہا ہے۔

قائد و چنگیز خان کی طرح نڈر اور جنگجو تھا۔

قائد دُخان کے دستے تمام ممکنہ عناصر اہلوں کے اس پاس کین گاہوں میں پوشیدہ ہو گئے اور قائد دُخان نے بڑے جبینی سے شہزادی کو کاجین کی آمد کا انتہائی کرنے لگا لیکن قائد کو اس وقت بڑی بالوی ہوئی جب اسے اطلاع دی گئی کہ شہزادی کو کاجین کی روانگی اس وقت تک ملتوی کر دی گئی ہے جب تک شاہ ارغون خان سے اجازت نہ حاصل کر لی جائے۔

یہ باتیں قائد کے اس دستے کے سردار نے بتائیں جس نے سعید تبریزی کو گرفتار کر لیا تھا قائد نے تبریزی کو طلب کر کے اس سے مزید معلومات حاصل کیں۔ سعید تبریزی کو جو کچھ معلوم تھا اس نے بے کم و کاست بیان کر دیا اور خیال تھا کہ قائد اصل حالات سے آگاہ ہونے کے بعد اسے چھوڑ دے گا لیکن قائد نے اعلان کیا کہ جب تک شہزادہ گرفتار نہیں ہوتی، اس ایرانی سفیر کو قید میں رکھا جائے لیکن آرام کے ساتھ.....

قائد نے فوراً اپنا ایک سوار قبلائی خان کے دربار میں پہنچا دے کہ بھیجی کہ شہزادی کو کاجین کو وہ اپنی اولاد کھیلے اس کو فوراً روانہ کر دیا جائے۔ قائد دُخان کے دستے اسے بحفاظت ایران تک پہنچا دیں گے۔ قبلائی خان نے قائد کے سوار کو تو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ شہزادی ہفتہ عشرہ میں روانہ ہو جائے گی لیکن اس کا ماتھا ٹھکا۔ اس نے سوچا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ سعید تبریزی پر ضرور کوئی افتاد پڑی ہے اور قائد کا پیغام خطرے سے خالی نہیں۔



قبلائی خان نے شہزادی کو کاجین کو تری راستے سے بھیجے کی غلطی نہ کی۔ وہ سعید تبریزی کا انتقام کو تاراج اس کے متعلق قائد دُخان نے اسکو اہل تھا کہ شاہ ارغون خان کے سفیر کو حفاظت کے ساتھ ایرانی سرحد تک پہنچا دیا جائے۔ حالانکہ سعید تبریزی ناکردہ گاہ کی سزا میں قید میں اڑیاں لگا رہا تھا۔ قبلائی خان کو جب تک تبریزی کے آنے کی امید رہی اس وقت تک اسے شہزادی کی کوئی نگرانی تھی لیکن جب اس نے اندازہ لگایا کہ ایک تیز رفتار سوار کو خان بالینغ سے ایران چلنے کے لئے میں جتنا عرصہ درکار ہو تب اسے کہیں زیادہ وقت گزر چکا ہے تو قبلائی خان نڈر مند ہوا۔

شہزادی کو کاجین پر وہ دار نہ تھی اور نہ مغلوں میں اس کا رواج تھا۔ وہ اپنے محل سے دوسرے محلوں میں جاتی۔ باغی سیر کرتی۔ قبلائی خان کی بنائی ہوئی سبز پہاڑی پر دن بھر گھومتی رہتی۔ یہ پہاڑی کو کاجین کو بہت پسند تھی۔

یہی چیز سبز تھی۔ جب شہزادی کو سر طرف ہر ای ہر دکھائی دیتا تو اس کا دل بھی خوش ہوں سے ہر اہو جاتا۔ مارکو پولو اور شہزادی کی کئی بار مل بیٹھتے ہوئے لیکن سر اسے مارکو کی محبت نہ پڑی کہ وہ شہزادی کو مخاطب کرے۔ بڑی کاشی و قمار ملے تھا۔ وہ کیوں ایک ادنیٰ سرکاری ملازم سے راہ چلتے پھرتے گشت کو کرتی۔ مارکو اسے دیکھتا اور برس کر رہ جاتا۔

شہزادی کا جب سے ملکہ ایران ہونے کا اعلان ہوا تھا اس کے حسن اور تکلف میں پہلے سے کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ شہزادی جب بھی مارکو کو دیکھتی، ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دوسری طرف منہ پھیر لیتی۔ مارکو سے میں اچھے لگتا۔

اور پھر ایک ایسا موقع آیا کہ مارکو پولو شہزادی کو کاجین کے بالکل قریب ہو گیا۔ قبلائی خان نے سانگا اور مارکو پولو کو تنہائی میں بلایا۔ دونوں حسب الحکم خاقان کے سامنے پہنچ گئے۔ قبلائی بند نظر رہا تھا۔ اس سے پہلے ان لوگوں نے قبلائی خان کو اتنا متعلق کبھی نہ دیکھا تھا۔ قبلائی خان نے اپنی خوشنک اور ٹھیں اڑا رہی تھیں لیکن آنکھوں میں آج خوف تھا نہ خون صرف نیندا ٹکڑیاں لے رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا قبلائی خان نہیں سویا۔

قبلائی نہایت سخت دل تھا۔ وہ اپنی جبینی ہری جاموئی خاتون کی موت پر بھی زور دیا تھا۔ اس کا غم شانے کے لیے بے بیش و طرب کا سمہا دیا۔ غم کے زمانے میں اس کی رنگینیاں اور میا شیشیاں ٹھوٹھ جابا کرتی تھیں پھر آج یہ غلگلی کیوں۔ قبلائی خان نے کہا:

"سانگا تو ہمارا وزیر اور مارکو ہمارا منشی ہے۔ میں شہزادی کی طرف سے بڑی تشویش ہے۔ سعید تبریزی اب نہیں نہیں آیا۔ وہ قائد کو مکاری کا شکار ہو گیا۔ شہزادی کو ایران بھیجا بہت ضروری ہے۔ ملکہ ایران کو ہم خان میں اور زیادہ نہیں روک سکتے۔"

خاقان کے خیالات نہایت اعلیٰ ہیں۔ سانگا نے چالوسی کی۔

نظام اگر خاقان کے کام آسکے تو اس سے بڑھ کر اس کے لیے اور کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ "یہ مارکو پولو کی ناکامی تھی۔

نیل مارکو۔ ہم نے یہ کام تیرے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ خاقان نے کہا:

"قائد نے مغرب میں براہمنی پھیلا رکھی ہے۔ ہم شہزادی کو سمندری راستے سے ایران بھیجا چاہتے ہیں۔

اس کی مارکو پولو کو خوشی سے جو حال ہوا مارکو اسے وہ خود بھی بیان نہیں کر سکتا لیکن اس نے فوراً اپنے نہایت باوجود حاصل کیا اور مکاری سے بولا:

”پولو خاندان کے افراد کی جانب، خاقان کے قہقروں پر نثار ہوں۔ ان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کون
اعزاز ہو سکتا ہے۔“

”تو بکری راستوں سے واقف ہے؟“ خاقان نے پوچھا۔

مارکو نے سر جھکا یا اور بولا:

”چینی سمندر میں جہاں تک خاقان کے ساحلوں کی حد جاتی ہے، یہ غلام کئی بار سمندر سے سفر کر چکے ہیں۔ علاوہ میرے خاندان کے تمام لوگ مشرق و مغرب کے بکری راستوں سے پوری طرح باخبر ہیں اور ایک سے زیادہ دفعہ ساحلِ روم سے ساحلِ چین تک کشتیوں سے سفر کر کے پہنچ چکے ہیں۔“
خاقان نے سالنگ کی طرف دیکھا اور پوچھا:

”تیرا منشا کیلے سا نکلا! ہم شہزادی کو پولو خاندان کے ساتھ ایران بھیج سکتے ہیں؟“

سالنگ کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے احمد کو قتل کر کے مسلمانوں کا زور توڑ دیا تھا لیکن لوہا

اب تک خاقان کے مزاج میں دخل تھا خصوصاً مارکو پولو خاقان کا دوست اور مشیر تھا جب تک احمد کا ٹانہ دریا میں رہا، سالنگ ہر بات میں مارکو پولو کی حمایت کرتا رہا لیکن اب وہ پولو خاندان سے بھی بدلق تھا۔ اسے اپنے آپ کو اس سے بڑھ کر چکا تھا کہ مارکو پولو چین کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے۔ پولو خاندان سے نجات حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع اس کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے فوراً کہا:

”خاقان کی عقل و فراست کو کون پہنچ سکتا ہے۔ تمام درباری اور سلطنت کے عہدے دار شہزادی کے مسئلہ کے بارے میں پریشان تھے لیکن بحری سفر کی طرف کسی کا خیال تک نہ گیا۔ پولو خاندان والے سمندروں کے شمار داران راز داں ہیں اور مارکو پولو تو خاقان کا قابل اعتماد مشیر ہے۔“

”بس فیصلہ ہو گیا۔“ خاقان نے کہا:

”ہم شہزادی کو کاجین کو سمندری راستے سے بھیجیں گے۔“

پھر اس نے مارکو پولو کو دیکھتے ہوئے کہا:

”مارکو ہم تمہاری کشتیوں کی حفاظت کے لیے پانچ ہزار جنگجو غلوں کا دستہ بھیجیں گے۔“

مارکو یہ سن کر گھبرا گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ خاقان نے مدد کو خاموش دیکھا تو کہا:

”مارکو تو خاموش کیوں ہے۔ بحری سفر کے لیے جتنے جن چیزوں کی ضرورت ہو، بیان کر دے۔“

”جتنے مہیا کر دی جائیں گے۔“

مارکو ڈرتے ڈرتے بولا: ”خاقان میری گستاخی معاف فرمائیں۔ اس سلسلے میں میری رائے کچھ مختلف

توڑتا کیوں ہے۔ خاقان نے ہنس کر کہا:

”سفر کی رہنمائی تجھے کرنا ہے۔ تیری رائے سب سے مقدم ہے۔“

مارکو نے کہا:

”خاقان معظم۔ ہمارے اس سفر کا مقصد یہ ہے کہ ہم شہزادی عالمہ کو امن و معافیت سے ایران پہنچائیں۔ اگر ساتھ میں نوجوان بحری بیڑا ہو گا تو ہمارے لیے قدم قدم پر مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ خاقان کی طاقت سے ہیں وہ تو طاقت کریں گے لیکن بعض سرسبزے جنگ پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ہمارا مقصد جنگ نہیں امن ہو گا۔“

زوی عالمہ کے ساتھ پانچ ہزار کاشک بھیجنے کے حق میں نہیں ہوں۔“

عیار مارکو پولو نے کوشش کی کہ اس سفر میں شہزادی کو کاجین کے ساتھ وہ اور اس کے خاندان کے افراد کے رکوی نہ جائے لیکن جب یہ سفر شروع ہوا تو قبلائی خان نے کچھ کمزیریں، غلام اور لشکر شہزادی کے ساتھ کر دیے۔

○

امیر پرست، راسخ العقیدہ مارکو پولو جب پولو خاندان کے دو بوڑھوں کے ساتھ قبلائی خان کے دربار میں اس کی طرح دس سال بچا۔ اس نے اپنی عمر کے مزید بارہ سال قبلائی کے دربار میں گزارے۔ مارکو اور قبلائی درمیان بڑی گہری دوستی ہو گئی۔ یہ نوجوان تاج جو تخیل سے اس طرح مہتر تھا جیسے حساب کرنے کی مشین، خاور خان بالیغ (طمانی قوم) کی شان و شوکت کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس کی کچھ میں بھی آیا تھا کہ دولت حاصل بہترین طریقہ یہ ہے کہ خاقان کی ذات کی خدمت کی جائے۔

مارکو اپنی ذہانت کے زور پر ترقی کرتے کرتے مبشرِ آیات کے عہدے پر پہنچا۔ وہ ختامیں سرکاری کام پر لے جاتا تھا وہاں اسے جو باتیں عجیب معلوم ہوتیں، انھیں قلم بند کرتا جاتا۔ میر قہمانی کو دایس آتا تو قبلائی خان بڑی حواس کے تاثرات ملتا۔

بعض تاثرات بیان کرتے وقت مارکو پر مدہوشی سی طاری رہتی۔ اس کی تحریر ایسی تھی جیسے کوئی کھابنیے کے اندر خواب کی دنیا کا احوال قلم بند کرے۔

شہزاد کے عہدے کی بدولت مارکو بے انتہا دولت کما گیا اور اپنی دولت جو اہرات میں منتقل کرنا لگا۔ اس نے اربابے باجو اہرات ایک بھاری مغل بادے کے اندر ٹانگے لیے تھے۔ مارکو کو امید تھی کہ اگر خاقان

کبھی اس سے ناراض ہوا تو وہ اپنا بارہ اوڑھ کر خانی حدود سے باہر نکل جائے گا لیکن خاقان قبلائی خان نے اس کی مرٹوں پر جانچ پڑتال کا اتنا سخت انتظام کیا تھا کہ بغیر شاہی اجازت نامے کے کوئی شخص سلطنت سے باہر نہ نکل سکتا تھا۔ قبلائی خان اس کو جوان دیشی کو کسی طرح بھی واپس جانے کی اجازت دینے پر آمادہ نہ تھا۔ مگر اپنی دولت اور ملک حرامی پر اتنا دکا پردہ ڈالے ہوئے تھا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آپہنچا جب خود قبلائی خان نے نہ صرف مالک اور اس کے خاندان کو واپس جانے کی اجازت دیدی بلکہ مغلوں کی عزت بھی آنکھ بند کر کے اس کے حوالے کر دی۔

شہزادی کشتی پر سوار ہوئی۔ پولو خاندان کی کشتی آگے تھی۔ جس پر وینس کے تاجروں کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ شہزادی کی کھڑی اس وقت تک آٹھو باقی اور رومال لہرائی رہی جب تک ساحل پر کھڑے لوگوں کے چہرے دھندلا نہ گئے۔ بہت جلد اپنے کھن میں آئی اور اپنے بستر پر لیٹ گئی جیسے ٹھنکی سے چور ہو۔

کشتیاں سینہ آہ پر رواں دواں تھیں۔ طوفانی لہروں سے بچنے کے لیے مارکو پولو نے کشتیاں ساحل سے دور رکھی تھیں تاکہ خطرے کی صورت میں ساحل پر آسانی سے پہنچا جاسکے۔

ایک ہفتے تک یہ کشتیاں اس ساحل کے قریب چلتی رہیں جہاں تک قبلائی خان کی عمارت تھی اور عوام پر مغلوں کا چھاپا ہوا تھا لیکن جوں جوں کشتیاں جنوب کی طرف بڑھتی رہیں، خاقان کا اثر کم ہوتا رہا۔ ان ساحلوں کے رگ خاقان کو نہ تو سمجھتے تھے لیکن اس کی زیادہ پروا نہ کرتے تھے۔

مارکو پولو کو بھی احساس ہو گیا کہ اب وہ خاقان کی حدود تک قبلائی خان کے ٹنگنے سے جینے کے لیے نکل چکا تھا۔ تاہم اس نے شہزادی کو کلاچین کے دائیں بائیں چلنے والی حفاظتی کشتیوں کو حکم دیا کہ وہ آگے آگے چلیں۔ محل سپاہیوں کو حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ جھگڑا بڑھ گیا اور بات تو تو میں میں سے اٹھا پانی تک پہنچ گئی۔ مارکو اپنی کشتی سے نکل کر سپاہیوں کی کشتی میں کود گیا۔ اس نے ایک سپاہی سے اس کی کمان چھین لی جو مارکو کو مارنے پر تیار تھا۔ اس سپاہیوں نے مارکو کو پکڑ لیا۔

شہزادی کو جھکڑے کی خبر ہوئی تو گھبرا کر کشتی میں بنے ہوئے اپنے کمرے سے نکل کر باہر آگئی۔ کو کلاچین کو دیکھ کر اسبابی ٹھنڈے پڑ گئے۔ انہوں نے مارکو کو چھوڑ دیا۔ شہزادی نے حافظ سپاہیوں کے سردار اور مارکو اپنی کشتی پر بلایا۔

اب مقدمہ شہزادی کے سامنے پیش ہوا۔ شہزادی نے لڑائی کا سبب پوچھا۔

مارکو پولو خاموش رہا لیکن محل سردار نے شہزادی کو بتایا:

خاقان نے میں حکم دیا ہے کہ ہم آپ کی کشتی کے دائیں بائیں چلیں۔ یہ نعرانی غلام ہیں حکم دے رہے ہیں کہ ہم انہیں آگے نہ جانیں۔ ہم اس کا حکم کیسے مان سکتے ہیں؟

شہزادی نے سوالیہ نظروں سے مارکو کو دیکھا۔ مارکو محل سردار نے نعرانی غلام کہا تھا 'اسے پہلے ہی تار مار کر ہلاک کر دیا گیا'۔

شہزادی کو کلاچین کے بڑی سفر کا آغاز ہوا۔

مغل خاقان اور چین کا مشفق قبلائی خان اسے الوداع کہنے کے لیے مع ماہرین سلطنت کے ساحل سمندر پر پہنچے۔ وہ دو کشتیاں ڈیڑھ سو صفاتی سپاہیوں کے لیے تھیں جنہیں حکم تھا کہ وہ دوران سفر شہزادی کے لیے ضرورت ہو کر کے دائیں بائیں رہیں۔ تیسری کشتی مارکو خاندان کی تھی اور چوتھی کشتی یا بکرا جسے بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا، وہ شہزادی کو اور اس کی کینروں کے لیے مخصوص تھا۔ مغل سپاہیوں کو تاکید کر دی گئی تھی کہ وہ مارکو پولو اور اس کے خاندان والوں کو تا بعد از دی کریں اور ان کے ہر حکم کو خاقان کا حکم سمجھ کر بنالائیں۔

شہزادی کے کشتی پر قدم رکھنے سے پہلے ساحروں اور شامانوں نے ہزاروں طرح کے ٹونے ڈھونڈ کر ہندوؤں کو ٹانڈیوں میں بند کر کے ان کو بالائی اور ان کے ٹورے کو شہزادی کے قدموں پر ڈالا گیا۔ ساحروں کو معلوم تھا کہ خاقان کو سفید گھوڑیاں اور شکاری چیتا بہت پسند ہیں۔ یہ چیتا ایک بار ایک ساحر کو چیر چاڑھ چکا تھا۔ ساحروں سے بہت ڈرتے تھے۔ ساحروں نے خاقان سے اپنے عزیز ترین پالتو جانوروں کے نام پوچھے۔ خاقان نے چیتے اور سفید گھوڑی کا نام دیا۔ ساحروں نے فوراً وقت سے فائدہ اٹھا دیا اور شہزادی کی سلامتی کے نام پر ان کی قربانی طلب کی۔ شہزادی کو کلاچین سامنے کھڑی تھی۔ خاقان چیتے کو صاف نہ کرنا چاہتا تھا لیکن انکار بھی نہ کر سکا۔ دس گھوڑیاں اور چار ڈوا ذبح کر دیا گیا۔

یہ چیتا خاقان کے ہر سفر میں اس کے ساتھ ہوتا۔ خاقان اس کے ذریعے جھل میں نکل کر کھینٹا تھا۔ چیتے کے لیے جانے کا اسے بڑا افسوس ہوا لیکن شہزادی کو خوش کرنے کے لیے اس نے ایک خوفناک تہقید لگا کر اس کا غم خشک دیا۔ خاقان نے شہزادی کو کلاچین کی جہیز کے طور پر کیا کچھ نہ دیا ہوگا۔ دس پیشیاں بھری (غالباً سونے سے) اس کی کشتی پر رکھی گئیں۔ اس کے علاوہ چھپے خانے کا سامان اٹک تھا۔

مارکو کو شاید اسی کا انتظار تھا۔ اس نے اپنی اور شہزادی کی کشتی کو پیچھے سمندر میں پہنچنے کا حکم دیا۔ محافظ کشتیوں کو کوئی حکم نہ دیا گیا۔ وہ جہاں کھڑی تھیں وہیں کھڑی رہیں۔

مارکو اور شہزادی کی کشتی تو بہت دور سمندر میں پہنچ گئی۔ سپاہیوں نے مارکو کو پیچھے جاتے دیکھا تو بغیر کسی حکم کے انھوں نے بھی ادھر کا رخ کیا لیکن اس وقت تک جنگیوں نے ان کے گرد گھبراہٹ ڈال لی تھی۔ جنگی چاروں طرف سے بغاوت کر کے محافظ کشتیوں کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ ان کا گھبراہٹ بہ لحاظ تنگ ہوتا تھا۔ آخر تنگ آمد جنگ آمد محفل مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔

اس دفعہ محفل سپاہیوں نے پہل نہ کی۔ وہ انتظار کرتے رہے۔ جنگیوں کی کشتیاں ان سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئیں۔ کچھ دیر وہ اس طرح ساکت رہے جیسے مٹی کی مورتیاں ہوں۔ محفل سپاہی انھیں حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک دم ان میں حرکت ہوئی۔ ان کے ہاتھوں میں بھکیاں سی بھر گئیں اور پھر جنگیوں کی کشتیوں سے ایک ساتھ سات سو کے قریب تیر ہوا میں لہرتے ہوئے محفل پر اس طرح گرے جیسے آسمان سے اترے گئے ہیں۔ وہ ابھی سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ تیروں کی دوسری ہارہ پڑی۔ پھر تیسری، اور چوتھی ہارہ پڑی۔ محفل سپاہیوں کا صفیا ہوا ہوا تھا۔ ان کے جسم تیروں سے چلتی ہو گئے۔ کچھ تیروں سے بچ کر باہر بھاگنے کے لیے سمندر میں کود گئے لیکن غرق ہو کر بھٹیوں کا نوالہ بن گئے۔

جنگی دونوں کشتیوں پر چڑھ گئے اور ان کی لاشیں بھیج کر سمندر میں پھینک دیں۔ پھر کشتیوں میں چھید کر کے انہیں غرق کر دیا۔ ان کا انتقام پورا ہو گیا۔

جب جنگی اس کام سے فارغ ہوئے تو مارکو کو پوچھا اور شہزادی کی کشتی کے رخصوان کے پاس پہنچ گیا۔ جنگیوں میں سے ایک آدمی جو ان کا سردار ہو گا، مارکو کی کشتی پر آ گیا۔ مارکو کے ساتھ پلوخانہ اندان کے دونوں پورے موجود تھے۔ سردار نے جنگی زبان میں کچھ کہا۔ مارکو یہ زبان نہ جانتا تھا۔ اس نے بوڑھے پلوکی طرف دیکھا۔ بوڑھے نے سردار کو اسی کی زبان میں جواب دیا۔

شہزادی اور اس کی سہیلیاں بھی ہوئی کھڑی نہ ہنسا دیکھ رہی تھیں۔ بوڑھے پلو اور سردار میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ پہلے تو جتنی سواد کا جو سمجھتے معلوم ہوتا تھا لیکن پھر وہ نرم پڑ گیا۔ اور پھر اتنا نرم ہوا کہ دونوں ہنس ہنس کر باہر نکلنے لگے۔

شہزادی کے چہرے پر نشا نشا اٹھی۔ اس نے جتنی کوشش کی تو سمندر سے مارکو کو دیکھا۔ مارکو پلو سکھار ہوا تھا تمام کشتیوں آہستہ آہستہ اس کی طرف چلیں۔ مارکو اور شہزادی کی کشتی ان کے درمیان تھی۔ سب ساحل پر پہنچ گئے۔ ساحل پر پہنچ کر تمام جنگی سوانے ان کے سردار کے، اپنی کشتیوں چھوڑ کر جنگل میں داخل ہو گئے۔ جنگل ساحل کے ساتھ شروع ہو گیا تھا۔ راہ میں پتھر لیے ٹیلے اور بچی ہڈیاں تھیں لیکن سرسبز اور شاداب۔

رات ہونے والی تھی اور اندھیرا بھینسا جا رہا تھا۔ شہزادی اس کی سہیلیاں اور پلوخانہ اندان والے، جنگی سردار کی رہبری میں جنگل کے دشوار گزار راستے بڑی خاموشی سے طے کر رہے تھے۔ انھیں ابھی منزل کا پتہ نہ تھا۔ شاید بوڑھے پلو کو معلوم ہو۔ مارکو نے ان کے چہروں سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ وہ بالکل مطمئن ہیں۔ پھر اسے خوف کھانے کی کیا ضرورت تھی۔ جن محفل سپاہیوں کا اسے خوف تھا وہ تاک کے تمام سمندر کی نذر ہو چکے تھے۔ آخر ان کی منزل الگ تھی۔ یہ جھوپڑیوں کی ایک پوری بستی تھی۔ جھوپڑیوں پر پھولدار ریلین چڑھی تھیں۔ جن سے بڑی فرحت افزا خوشبو آ رہی تھی۔ یہ بستی ایک بڑے میدان میں تھی۔ چاروں طرف پہاڑ اور جنگل تھے۔ اس بستی کے ایک طرف سے پہاڑی چپتر گزرتا تھا۔

ان جھوپڑیوں پر سکونت داری تھا۔ گھرا گھرا سناٹا قبرستان جیسا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی کی جھوپڑی سے مرنے کے رونے کی آواز آتی۔ وہ بھی بہت دیر بعد۔ مارکو وغیرہ کو میدان کے ایک طرف کھلی زمین میں بٹھا دیا گیا۔ یہاں کا ماحول بڑی ہی طعنائی تھا۔ اتنے سارے لوگوں کے آنے کی کسی کو پروا نہ تھی۔ کسی نے بھی باہر جھانک کر نہ دیکھا کہ کون آیا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اجنبیوں میں ہراس بڑھتا گیا۔ بوڑھے پلو نے سب کو اطمینان دلانے کی کوشش کی مگر سناٹا انہیں کھانے کو دوڑتا تھا۔ دور سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے سینکڑوں ہاتھی چنگاڑے ہوئے۔ کبھی کبھار شیر کے دھارنے کی بھی آواز آتی جس سے چاروں طرف جنگل میں کھلبلی مچ جاتی اور جنگلی جانور اپنی اپنی جگہوں پر بولنے لگتے۔

پھر ایک طرف سے ڈھولوں کے بجنے کی گونج بڑا آواز پیدا ہوئی۔ اس آواز کے ساتھ ہی جھوپڑیوں کی یہ بستی جگمگ اٹھی۔ ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی۔ جھوپڑیوں میں روشنی ہو گئیں۔ شہزادی کو کاجلیں نے دیکھا کہ عورتیں اور مرد بچوں میں شطرنج کھاتی ہوئی کھڑیاں پکڑے جھوپڑیوں سے نکل پڑے۔ اندھیرے کا طعم ٹوٹ گیا۔ ہر طرف مکث نہ سی بکھر گئی۔ مرد اور عورتیں روشنی کی چھریاں لہراتے میدان کی طرف آ رہے تھے۔

بڑا ہی دلچسپ سماں تھا۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ ہاتھ کو ہتھ نہ سجھائی دیتا اور اب یہ عالم کہ اتنی روشنی ہوئی کہ سورتی بھی گرے تو ڈھونڈ لی جائے۔

یہ گروہ وحشیان جب قریب آیا تو شہزادی نے دیکھا کہ ان کے ہاتھوں میں سفید پھریاں ہیں جی کے سروں پر کچھ لپٹا ہوا ہے جو روشنی دے رہا ہے۔ مردوں اور عورتوں کا ایک سا لباس ہے جس میں کینا مشکل ہے، عرف الکاحصہ بتوں یا بھال سے ڈھکا ہوا تھا، بقیہ تمام جسم برہنہ۔ مرد۔ جوان اور اچھڑے مگر کتے تھے لیکن تمام عورتیں جوان نظر آتی تھیں۔ سیاہ بال، سیاہ چہرے۔ چہروں پر سفید دھاریاں پڑی ہوئیں گول گول چھتیاں ان کی صحت اور تندرستی کی

علامت نصیب۔

مرد اور عورتیں شور مچانے (شاید گانا گاتے) میدان میں اکڑ جمع ہونے لگے۔ جو بڑے بچے جو انوں سے خالی ہو گئیں صرف بوڑھی عورتیں اور بچے سنبھالنے کے لیے رہ گئے۔ اچھٹی مسافر انہیں حیرت سے دیکھ رہے تھے لیکن جنگلیوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ کسی نے ان کی طرف نگاہ اٹھانے کا بھی نہ دیکھا۔

ڈھول دوبارہ بجنے شروع ہوئے۔ ڈھول یا ڈھول بجانے والے نظر نہ آتے تھے صرف آواز سنائی دیتی تھی۔ جنگلی جو نیم دائرے میں بیٹھے تھے۔ آگے عورتیں پیچھے مرد وہ تمام ادب سے کھڑے ہو گئے جس سے ظاہر ہوا کہ کوئی اہم شخصیت کی آمد ہے۔

ڈھول کی آواز میں زردی ہوتی گئیں پھر وہ نظر آنے لگے۔ کمان نما ڈھول پر کھال چڑھی تھی۔ آواز میں بڑی گونج تھی۔ آگے آگے ڈھول والے، ان کے عقب میں ایک سفید مٹی اور مٹی پر صرف مٹی بان۔

اس سفید مٹی پر بڈیوں کا بنا ہوا ایک ہودا رکھا تھا جسے چال کی سیڑیوں سے مضبوطی سے بندھا گیا تھا۔ ہودے میں ایک مورتی تھی جس کی شکل بھونڈی اور گہری ہوئی تھی۔ زیادہ غور کیا جائے تو اس کی شبہات کو تم بدھ کے عیسے سے ملتی جلتی معلوم ہوتی تھی۔

مٹی نیم دائرے کے دوسری طرف بٹھا یا گیا۔ جنگلی مرد اور عورتیں رکوع تک جھک گئے۔ ان میں سے چار مرد مٹی کے سامنے آئے اور مٹی پر رکھی ہوئی مورتی کو سجدہ کیا۔ پھر انھوں نے مٹی ان کے ہاتھ میں ملتی ہوئی بی پر کوئی سنوٹ چھڑکا جس سے شعلے بھڑک اٹے۔ مرد اور عورتیں کچھ کہنے ہوئے میدے کھڑے ہو گئے۔

ڈھول اور ڈھول بجانے والے سفید مٹی کو میدان تک پہنچا کر پہلے ہی واپس جا چکے تھے۔ ان کے ڈھولوں کی آواز پھر بلند ہوئی اور آہستہ آہستہ قریب آتی گئی۔ یہ دوسرے سفید مٹی کی آمد تھی۔ اس مٹی پر جنگلی مکہ کی سواری آ رہی تھی۔

مکہ کا رنگ کالا تھا مگر چہرے کے نقوش بڑے شگے۔ لاجبی روشن آنکھیں۔ سیاہ گوندھی ہوئی لیٹیں۔ ہنٹا چہرہ۔ موتی جیسے سفید دانت۔ وہ چاندی کے ٹیڑھے بیڑے بیڑوں سے بنائے ہوئے ہودے میں بڑی شان سے بیٹھی تھی۔ مارکو کو انداز ہو گیا کہ مکہ کی اہمیت ان جنگلیوں کی نظر میں دیوتا (مورتی) سے بھی زیادہ ہے۔ جیسی توجہ چاندی کے ہودے میں آئی ہے۔

یہ مٹی پہلے مٹی کے برابر دو گایا۔ مکہ بغیر کسی کامیابی کے مٹی سے اتری۔ تمام مرد اور عورتیں ہودے میں گر گئیں۔ کچھ آدمیوں نے ہودے سے ایک بے ڈھل سا سستیل نا چاندی کا انتہائی زلفیسترا نکالا۔ یہ مکہ کا تخت تھا تخت مٹی کے آگے رکھ دیا گیا۔ مکہ اس پر بیٹھ گئی۔

باس سے مکہ بھی آزاد تھی۔ سر پر کئی رنگ کے پردوں کا تاج تھا۔ شعلوں کی روشنی میں ان کے مختلف رنگوں کی تفصیل معلوم کرنا مشکل تھا۔

ڈھول کی آواز ایک بار پھر بلند ہوئی۔ شہزادی نے سوچا۔ شاید اب بادشاہ کی سواری ہو لیکن یہ ایک کالا مٹی تھا جس پر وہی سردار بیٹھا تھا جس نے ان کی میاں تک رہنمائی کی تھی۔ اس کا مٹی مورتی کے مٹی کے پیچھے رکھا گیا سردار مٹی سے اتر کر مکہ کے قریب آیا۔ مجمع نے خم ہو کر اس کی تعظیم کی۔ سردار مکہ کے قدموں میں جھک گیا۔ مکہ نے سسکیاں کچھ کھا۔ سردار سیدھا ہو کر مکہ کے برابر کھڑا ہو گیا۔

سردار نے بلند آواز سے جنگلیوں کو کوئی حکم دیا۔ جنگلی مرد اور عورتیں جو تعظیم کے بعد زمین پر بیٹھ چکے تھے۔ باری باری مکہ کے پاس آئے۔ مکہ وہ پہلے مکہ کے ہاتھ چومتے پھر بیروں میں گر کر انہیں بوسہ دیتے۔ شہزادی اور دوسرے لوگ اس چیز کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ تعظیم و تکریم کے اس سلسلے میں کافی وقت گزر گیا۔ انھیں الجھن می ہونے لگی۔ آخر تمام جنگلی تعظیم بجالائے۔

اسی وقت سردار کی آواز پھر بلند ہوئی۔ بوڑھے پوٹو گھر کر کھڑے ہو گئے۔ سردار ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ سردار خاموش ہوا تو بوڑھے پوٹو نے مارکو اور شہزادی کو بتایا کہ سردار نے ہمیں مکہ کی تعظیم کا حکم دیا ہے۔ میاں بادشاہ نہیں ہوتا۔ مکہ حکمرانی کرتا ہے۔ اس کی تعظیم کرنا ہر ایک کا فرض ہے۔ شہزادی کچھ گھبرائی۔ اس کے سامنے اب تک لوگ جھکتے رہے تھے۔ وہ کسی کے سامنے خم ہونے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ مارکو نے اسے سمجھایا کہ جان بچا نہ ہے تو حکم کی تعمیل کر دو۔ پہلے تمام کنیزیں ایک ایک کر کے مکہ کے حضور پیش ہو کر تعظیم بجالائیں۔ پھر پوٹو خاندان والے۔ مارکو پوٹو جس وقت مکہ کے پیر چوم کر کھڑا ہوا تو مکہ نے اسے بڑے پیار سے انداز سے دیکھا۔ مکہ نے کھڑے ہو کر مارکو کے سینے پر کئی بازو زور سے ہاتھ مارا اور خوش ہو کر سردار سے کچھ کہا۔ شاید وہ مارکو کی وجاہت سے متاثر ہوئی تھی۔ شہزادی کو کاجیں، مکہ کے پاس تعظیم کے لیے پہنچی تو مکہ اسے دیکھ کر خود ہی کھڑی ہو گئی۔ مکہ نے اپنے کانے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ شہزادی کو گھٹن پہنے لگی گلا سے ان ہاتھوں کو خمیں نینٹوں میں مرد اور عورتیں چوم کر غنیمت سمجھتے تھے۔ پھر ابو دینا پڑا۔ ہاتھ چومنے کے بعد شہزادی نے پیر چومنے کے لیے جھکا پڑا لیکن مکہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے چٹایا۔

جوانی جوانی سے لپٹ گئی۔

مکہ کا سینہ چولی سے آزاد۔ شہزادی کی کامداری چولی اس کے شباب کی بلند یوں کو روکے ہوئے تھی۔ مکہ کو شہزادی کے کپڑوں سے الجھن ہوئی۔ شاید سونے چاندی کے تار سے چھینے لگے۔

مکہ نے ہنسنے ہنسنے شہزادی کو اپنے سے الگ کیا۔ اس کی چولی کو گھورا اور پھر ہاتھ بڑھا کر اس زور سے کھینچا کہ

شہزادی کا سینہ سر ہاں ہو گیا۔ اس نے شراب سے بدن چرایا۔ مکہ نے فتنہ لگایا۔ پھر سینکڑوں قلعے جنگل کی گیسبہ غاموشی کو نوٹنے لگے۔ مکہ قلعے لگاتی جاتی اور شہزادی کے کپڑے نوچتی جاتی۔ شہزادی نے مدافعت شروع کر دی۔ مارکونے دیکھا تو وہیں سے آواز دی کہ:

مذاضت کتو جان سے ماری جاؤ گی۔

شہزادی ڈر گئی۔ اس کا سینہ برہنہ اور کپڑے تار تار ہو گئے۔ مکہ نے خوش ہو کر شہزادی کو اپنی گود میں بٹھالیا۔ وہ سردار سے دیر تک ان کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ سردار کو جو کچھ پوچھا خاندان کے بوڑھوں نے بتایا، جو کمانی سنائی۔ وہ سردار نے مکہ کے سامنے دہرایا۔

شہزادی سمجھتی ہوئی مکہ کی گود میں بیٹھ گئی۔ مارکو پولو کی بے تاب نظریں شہزادی کے سینے پر جمی ہوئی تھیں۔ دھول پھر بچنے لگے۔ یہ پوجا اور پرستش کا اعلان تھا۔ مکہ نے شہزادی کو الگ کیا اور اپنا تخت چھوڑ دیا۔ چار چھ آدمی چاندی کی بھدی مورتی کو اٹھاتی سے اٹا کر لائے۔ اس مورتی کو مکہ کے تخت پر رکھ دیا گیا۔

مکہ دورانہ پوک مورتی کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔ روشنی کی چڑیلوں پر سفید سفوف چڑھ گیا۔ جس سے شعلے اور بھڑک اٹھے۔ پھر مکہ سمجھے میں جھک گئی۔ اس کے ساتھ ہی تمام جنگلی مرد اور عورتیں سرسجود ہو گئیں۔

مکہ نے سر اٹھایا۔ پوجا اور پرستش ختم ہوئی۔ شراب کا دور شروع ہوا۔ پیڑوں کے تے کھان کر انہیں دریاں سے کھوکھلا کر کے شراب کے مشکے بنائے گئے تھے۔ ناریل کے خول جا آساغر کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ مکہ کا پیالہ اور مکہ اس کے قریب رکھ دیا گیا۔ بقیہ لوگوں کے لیے میدان کے وسط میں مشکے رکھے گئے تھے۔

مکہ نے ایک پیالہ منہ سے لگا کر اس کا آغاز کیا۔ پھر جنگلی مرد اور عورتیں شراب پر ٹوٹ پڑے۔ مارکو پولو کی نظر میں مغل دربار کی تصویریں گھوم گئیں۔ مسکوں مغلوں کے دربار میں ایسے موقعوں پر بھی ایک ترتیب و تنظیم ہوتی۔ یہاں جنگلات اور بے ترتیبی تھی۔ مرد اور عورتیں شراب کے پیالے پر پیالے چڑھا رہی تھیں اور کوسے مشکا کر عجیب بے سنگم تھیں کر رہی تھیں۔

مارکو پولو کو یہاں کی شراب بہت پسند آئی۔ تازہ پھلوں کی شراب۔ اس نے دل کھول کر شراب پی۔ شہزادی اب تک مکہ کے قریب تھی۔ مکہ نے پیالہ بھر کر اس کی طرف بڑھایا۔ مغل خواتین تو کبھی کبھی شراب کا استعمال کرتیں لیکن مغل شہزادوں کو شراب پیے کی سخت ممانعت تھی۔ شہزادی کو کاچین نے اب تک شراب کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ اس نے بڑی مایوسی سے مارکو کو دیکھا۔ مارکو کے ہاتھ میں بھی پیالہ تھا۔ اس نے اشارہ کیا کہ پی جلد تک شراب نہ ہو شاب و آتش

نہیں بنتا۔

شہزادی نے آنکھیں بند کر کے پیالہ منہ سے لگایا۔ شہزادی نے دو چار گھونٹوں کی تلی تو برداشت کی لیکن پھر پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اوردہ مکہ کی باہوں میں پھول گئی۔

مکہ نے ہنس کر مارکو کو دیکھا۔ مارکو اس کے پاس گیا۔ اب شہزادی کھدکے بجائے مارکو کے ہاتھوں میں پھول رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے ڈورے سرخ ہو گئے تھے اور بھاری پلکیں کھولنے نہ لگتی تھیں۔

شہزادی جھومتی رہی۔ مارکو شراب پیتا رہا۔ مکڑی کے پیالے سے زیادہ شہزادی کی آنکھوں کے چھلکے مافردوں سے دور چلتے رہے۔ رقص ہوتا رہا۔ جنگلی مرد اور عورتیں نازک ستر پوش۔ ناچ کی اچھل کود اور بدست ہاتھوں کی سیاہی لگی کھ بورش برداشت نہ کر سکے اور جیسوں سے الگ ہو گئے۔ کسی کو کسی کی فکر نہ تھی۔ وہ خود اپنی لکھ سے آزاد تھے۔ مکہ، مردار کی چھاتی سے چمٹی ناچ رہی تھی۔ عورتیں مردوں سے بڑی اودھم چا رہی تھیں۔ نہ کوئی کھنے والا تھا نہ پونچھنے والا۔ اس جام میں سب ہی تو شئے تھے۔ حقیقتاً شئے۔

مارکو پولو نے شہزادی کو زبردستی دو گھنٹ اور پیلا دیے۔ شہزادی سنبھلتے سنبھلتے پھر ہلک گئی۔ مٹھولوں کی آواز بلند ہوئی۔ میدانوں ایسی خاموشی طاری ہو گئی جیسے وہاں کوئی ذی نفس موجود ہی نہیں۔ مکہ باقی پر سوار ہو کر چلی گئی۔ مورتی سے دوسرے باقی پر بھیج دی گئی۔ مرد اور عورتیں اپنی اپنی جھوپڑیوں کو سدھارے۔ یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ یہی کچھ دیر پہلے شئے میں دھت اودھم چا رہے تھے۔

نشہ تھا تو صرف شہزادی کو کاچین کو۔ اس کی آنکھیں نہ کھل رہی تھیں۔

رقص کے دورانہ کنبڑوں نے بھی جی بھر کے شراب پی تھی اور جنگلیوں کے ساتھ خوب ناچی تھیں لیکن کسی جنگلی مرد نے ان کے جسم پر انگلی تک نہ لگائی تھی۔ شراب نے جو آگ بھڑکائی تھی اسے کوئی بجھانے والا نہ تھا۔ وہ نشے کے عالم میں اول ذل تک رہی تھیں۔

میدان میں اب صرف جنگلیوں کا مردارہ گیا تھا۔ وہ پوچھا خاندان کے بوڑھوں کے پاس۔ درانیوں کو سمجھنا رہا پھر اس نے منہ سے زور سے سیٹھا جانی۔ سیٹھی کی آواز پر چالیس پچاس جنگلی جوان آ گئے۔ مردار نے لڑکیوں (کنیزوں) کا طنز اٹا رہے تھے۔ ہونٹ کچھ مکھان کے سفید سفید دانت باہر نکلتے۔ ہر ایک نے ایک ایک لڑکی کندھے پر پھول لٹا کر اٹھائی اور جھوپڑیوں میں واپس چلے گئے۔

مارکو پولو اور شہزادی کو کاچین کو مردار نے اپنی جھوپڑی دی تھی۔ یہ جھوپڑی دوسری جھوپڑیوں کی بہ نسبت اونچی اور نمایاں تھی۔ مارکو پولو شہزادی کو سہارا دے کر جھوپڑی کی طرف چلا۔ مردار اور دونوں بوڑھے دوسری طرف روانہ ہو گئے۔

شہزادی پر نشہ چڑھا ہوا تھا۔ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ تن کے کپڑے ملکہ نے تار تار کر دیے تھے اور بدن اس وقت مارکو کے قبضے میں تھا۔

مارکو نے شہزادی کو ہوش میں لانے کی کوشش کی لیکن نشہ اتنا تیز تھا کہ اس کی آنکھیں نہ کھلیں۔ مارکو رات بھر مد توں کی تشدد آرزوؤں کے لب نہ کرتا رہا اور شہزادی رات بھر ہوش رہی۔ بنگوں کے نموں کی دھجیاں بکھرتی رہیں اور وینس کا یہ نصرانی تاجروں و نرخ، قتل خان سے اپنی دس سالہ قید کا انتقام لیتا رہا۔ صبح ہو گئی۔

شہزادی کو ہوش آیا لیکن ہوش تک آیا۔ جب وہ دوشیزہ سے عورت بن چکی تھی اور بچہ بچوں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

شہزادی نے خود کو مارکو کی آغوش میں پایا۔ اس نے چاہا کہ مارکو کو دھکیں کہ مارکو سے لیکن اس کی آغوش میں اسے کچھ ایسی لذت محسوس ہوئی کہ اس کی آنکھیں پھر بند ہونے لگیں۔ وہ پھر سو گئی۔ مست ہو گئی!



قتل خان نے جہن فح کرنے کے بعد چینی تمدن کی تفصیلات کو منہدم نہیں کیا اور نہ دشت کے چنگیزی و متوڑ معیشت کو عمل میں لانے کی کوشش کی۔ مغل ہونے کے باوجود اسے چینی تمدن مرغوب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سرحد کی دوہری طرف جیموں میں رہنے والے مغل اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ ان کا غصہ اور قتل خان سے نفرت بڑھتے بڑھتے قاتلوں خان کی صورت میں نمودار ہوئی جس نے قتل خان کے لیے مغرب کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے۔ تجارت منقطع ہو گئی۔ اور شاہراہیں ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں۔ قتل خان اب چینی حدود میں محصور ہو کر رہ گیا۔

شہزادی کو کاپچن کو حضرت کرنے کے بعد قتل خان نے اپنی سرحدوں پر نظر ڈالی۔ بے امن مغرب میں قائم تھا کا طوطی بول رہا تھا۔ قتل خان کی طرف رخ کرنے کی ہرأت نہ ہوئی۔ اس کا مایہ ناز مسلمان سپہ سالار اب تک شمال میں قائم دے چاہا ہمارے دوستوں سے الجھا ہوا انھیں آباؤی چراگا ہوں سے پیچھے دھکیلنے میں مصروف تھا۔

قتل خان خود گھٹیا کے مرض کی وجہ سے اب فوج کی سالاری سے معذور ہو چکا تھا۔ اس نے جنوب بعید کی طرف ایک فوج روانہ کی۔ یہ فوج دریاے یانگ تسی کے منبع کے مغرب کی جانب، گہری گھاٹیوں کے اس پار ان وحشی علاقوں میں پہنچی جو بہت کے ڈھلوانوں پر آباد تھے۔ قتل خان کی دوسری فوج دریائے پریم پتر تک پہنچی لیکن پھر ان کے

ہتھیار کا ناقابل عبور سلسلہ سکندری بن کر مائل ہو گیا اور اسے واپس لے آیا۔ یہ فوج واصل ہندوستان پہنچنے لگا۔ پوٹری تھی۔

قتل خان کی تیسری فوج جزیرہ سمندر کے کنارے کنارے ناقابل عبور پہاڑوں کے بازو سے ہوتی ہوئی ان کے جنگلوں میں داخل ہوئی جہاں جیات جیات کے لوگ رہتے تھے۔ یہاں کی گرم گو سے لوگ مرجاتے تھے۔ ان لوگوں پر بندہ سواری ماضی تھی۔

قتل خان کو پہلی بار اطلاع ملی کہ اس کی فوجوں کو شکست ہوئی ہے۔ یہ فوجیں یونان (برہما) میں گھس گئی ہیں لیکن یہاں بیماری اور خراب آب و ہوا کی وجہ سے ان کی سببیں گر گئیں اور ان کی فوجوں کو یونان والوں نے نکل باہر کیا۔ انھوں نے مین (شاہ برہما) کی باقی سوار فوج کو آتشیں تیروں نے شکست دے دی لیکن ایسی قوتی آب و ہوا میں ان کے لیے زندہ رہنا مشکل ہو گیا۔

دوسری طرف نامک گنگ کے جنگلوں کے باہی جنگلوں میں چھپ کر زمبریلے تیروں سے مغل فوج کو پریشان کرنے لگے۔ یہاں تک کہ انہیں شکست کھا کر لوٹنا پڑا۔

قتل خان کے دو چیتے مرد اس جنگ کی نذر ہو گئے۔ قتل خان نے اپنے اسے مٹی فوج بھرتی کر کے بھیج دی۔ مڑاؤ انہوں کے بعد بھی اس علاقے پر قبضہ نہ کر سکی۔ لیکن نامک گنگ کے سرداروں نے باہی مشورہ کر کے رسمی طور پر خان کا ماتحت قبول کر لی اور ایک خالص سونے کا مجسمہ تائی تو بھجوا دیا۔

اس عہد سے واپس آنے والے مغلوں نے بتایا کہ نامک گنگ کے علاقے میں سونے چاندی کے مینار تھے غالباً وہی علاقہ ہے جس کے ساحل سے شہزادی کو کاپچن گزری تھی اور اس نے کچھ دن جنگلوں کے ساتھ گزارے تھے۔

قتل خان نے جنوب میں جاوا اور شمال میں فی پون یا جیمہ پین کو بایا جاپان پر بحری بیڑوں سے حملہ کیا۔ ملکہ آرا مان تاکا یوریشوں کا کھرب اتنا بیٹھ لگا کہ قتل خان اپنے آپ کو کوہیو (کوریا) بتات، یاد دلایا، ساٹرا، یونان، لگ، تائی (سیام) اور کچھ کا شمشاد کہہ سکتا لیکن مغل اتنی جابن تلف کرنے کے بعد نہ تو استوائی خطوں میں بڑے اور ان ملکوں سے ملے برائے نام خراج وصول کرنے کے اور کچھ نہ ملا۔ جاپان پر تو قتل خان نے بیس ہزار آدمی اور چالیس ہزار چینی اور کوریائی فوجوں سے حملہ کر دیا تھا لیکن ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔

۱۲۹۲ء میں تائی ٹو (خان بائیں) کے باشندے ایک سندس ٹنگون کی وجہ سے پریشان ہو گئے۔ یہ سورج گہنی تھا۔ انہوں نے قتل خان کو صلاح دی کہ آسمان کو خوشنکس کرنے کے لیے وہ اپنے اعمال کا جائزہ لے۔ اسی سال کے دہوی میں ایک دھماکا تارہ نمودار ہوا جس کو دیکھ کر لوگ ڈر گئے۔

قتل خان کو شہزادی کو کاپچن کے ایران پہنچنے کی اب تک خبر نہ ملی تھی حالانکہ انہیں روانہ ہونے پر دو مہر سال تھا۔

قبلائی خان نے بایاں کو شمال سے طلب کیا تاکہ اس کا دل ہل سکے۔

قبلائی خان مانی ٹو کے اندر دئی صحن میں اپنے کمرے میں بیٹا اور صاحب فرانس تھا۔ وہ اب اس قابل نہ تھا کہ ہر پہاڑی کی سرکر کے اپنے چار ہاتھیوں پر سوار ہو کر سر کو بکے۔



بایاں، سٹوں کا عظیم مسلمان سپہ سالار نئی ٹرکوں سے ہوتا ہوا نئے شہر خان بالغ کے دروازے پر گھوڑے سے اتر آیا۔ بایاں جس میں اب وجہ ضعیفی تھا منوہات کی حکمت نہ رہی تھی، قبلائی خان کے حضور میں حاضر ہوا۔ قبلائی بارہ دری میں لیٹا ہوا تھا اور گردن گھا کر سبز پہاڑی پر نہر سے منوہر کے درختوں کو دیکھ رہا تھا اور بایاں نے اس بارہ دری پر کھڑے کھڑے دیکھا کہ دیوار کے بعد دیوار اٹھتا چلا گیا ہے۔ ان دیواروں کے اندر یہ بوڑھا شہنشاہ بند تھا۔ قید تھا۔ یہ قبلائی خان جو دشت کی کھلی ہوا میں پیدا ہوا اور انہی فضاؤں میں بڑھ کر جوان ہوا۔

قبلائی خان میں دشت کی خوبو باقی نہ رہی تھی۔ بایاں کے اصرار پر اس نے چنگ کم کے بیٹے تیمور خان کے باہ ولی عہد ہونے کا اعلان کر دیا۔

قبلائی خان کا انتقال ۱۲۹۴ء میں ہوا۔ اسی سال کی عمر پائی اور پینتیس سال سے زیادہ حکومت کی۔ اسی قبر ٹائی ٹو میں نہیں بنائی گئی بلکہ اس کی میت کے مطابق اس کی لاش برقان خالدون کے نیچے اس وادی میں پہنچی تھی جہاں کیرلان مذہبی بتی تھی اور چنگیز خان کی قبر کے اطراف اس کے خاندان والوں کی قبریں تھیں۔

شہزادی کو کاچین اب تک راستے میں تھی اور اس کا بحری سفر ختم ہونے میں نہ آتا تھا یا پھر اسے جان بوجھ کر طول دیا جا رہا تھا۔



چاندی کی کانوں اور چاندی کے سفید ذرات سے اٹے ہوئے اس جنگی علاقے کی مکہ اہلی لکھی کا خاندان کی حد سے یہاں حکمران تھا۔ خاندان کمرواری اور شہنشاہت ہمیشہ عورت کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ مکہ مرق تو اس کی بڑی بیٹی بن جاتی لیکن کسی کو یہ خیال نہ آتا اور نہ کوئی پوچھ سکتا کہ اس مکہ کا باپ یا شوہر کون ہے؟ اس خاندان میں باقا شادی کا کوئی رواج نہ تھا۔ مکہ کا دزیر یا سردار۔ مکہ کے نظم و نسق کا مالک ہونا مگر حکم مکہ کا چلا۔ یہی سردار عام

نیکہ کا باپ ہوتا۔ وہ ہر دم مکہ کے ساتھ رہتا۔ مکہ کے خیمے میں رہتا۔ اس کا ایک الگ خیمہ بھی ہوتا جہاں وہ اس شب سنا جس رات مکہ کی اور مرد کو اپنے خیمے میں سونے کی دعوت دیتی۔

سال کے سال بڑی پوچھا ہوتی۔ اس دن خاندان کی تمام نوازی لڑکیاں چاندی کے بھدے بت کے سامنے بن کر تھیں۔ ان کے ساتھ جوان لڑکے بھی شامل ہو جاتے۔ پھر وہ جس کا ہاتھ پکڑ لیتے وہی ان کی بیوی بن جاتی۔ اس لڑکی سے جتنی اولاد بن جوتی وہ اس کی کمالتیں لیکن اس لڑکی کو صرف ایک مرد پر قناعت کا حکم نہ تھا۔ وہ ماں اور جس کی چھوٹی بڑی میں چاہتی رات بسر کر سکتی تھی۔ مرد بھی اس سلسلے میں آزاد تھا صرف وزیر اعظم یا سردار کو کی لڑکی کا ہاتھ پکڑنے کی اجازت نہ تھی لیکن مکہ کے علاوہ ہر لڑکی کو وہ اپنے تعریف میں لانے کا مجاز تھا۔ اس کے لیے اسے صرف مکہ سے اجازت حاصل کرنا ہوتی تھی۔ مکہ کا عذر اجازت دے دیتی۔ برخلاف اس کے، اگر مکہ کسی اور کے ساتھ شب بسر کی خواہش کرتی تو سردار کو اس میں دخل دینے کا حق نہ تھا۔

پہلی رات کے بعد شہزادی کو کاچین اور مارکو پو لو کے درمیان سے حجاب کے پروے اٹھ گئے اور شرم و عیا کی اٹھی ہوئی کچی دیوار کو کرٹوٹ گئی۔ سات پردوں میں چھپائی جانے والی قبلائی خان کا خاندان چین کی بیٹی اور طفلہ چنگیزی کا ان ایک ملک حرام ہضرات کی آغوش میں یوں گری کہ پھر اس نے اٹھنے کا نام نہ لیا۔ اب وہ اور مارکو پو لو باس کے معاملے میں جھگڑوں کی طرح آزاد تھے۔

شہزادی نے دوسرے دن باس کا اس لیے بھی تکلف نہ کیا کہ رات کو پھر وہ تازہ ہوا جانے کا کیونکہ وہاں زہرات بھی ہنگامہ برپا تھا۔ ڈھول بجتے۔ موزی آتی۔ مکہ ای کی کچی موسیقی اور شباب و شباب کی محفل گرم ہوتی۔ مارکو پو لو کو شرم کی کیا ضرورت تھی۔ مغربی تمدن کو ہمیشہ ہی شرم و غیرت سے سیر رہا ہے۔ یہ تو صرف مشرقی ہیں۔ وہ بھی صرف چند علاقوں کے باقی جو مشرقی تہذیب کو آج بھی اپنے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ دنیا انہیں دیکھا تو کھکتی ہے لیکن یہ پڑھیں آباد اجداد کی وضعیتاری سے چپے ہوئے ہیں۔

شہزادی کو کاچین کی جوانی میں ایک بار جو طوفان اٹھا تو پھر ہر چیز بہت جی گئی۔ نہ قبلائی خان کا جاہ چشم اور نہ چنگیزی و قار و جلال اس کی متلاطم لہروں کو روک سکا۔ وہ شیرنگی کا بند ٹوٹ چکا تھا اور شہزادی کے الگ الگ سے ڈانٹا اس ٹپک رہا تھا۔ مست آنکھیں اور لڑکھڑاتے قدم ہر وقت خلوت کے مستحق رہتے۔ پھر مارکو پو لو کے قدم کوں گئے۔ شہزادی کے منہ کو شراب لگ چکی تھی۔ شراب کا نشہ ہر دم اس کے اندر ساگ بھڑکا رہتا اور مارکو پو لو اس آگ کو غذا کرنے کے لیے ہر وقت شہزادی کے پاس رہتا۔

شدید بارشوں نے سمندری راستہ بند و ش بنادیا۔ سفر نامکن ہو گیا۔ جنگی بے سہانہ نواز تھے۔ انھوں نے لوگوں کی خدمت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ جیس، دودھ اور بھنا ہوا گوشت ان کی غذا تھی۔ طرح طرح کی شرابوں کی تو

سمندر کے سینے پر اب مار کو تھا اور شہزادی کو کاجین سان کا ہر دن عید اور رات شبِ برات کی طرح گزرتی۔
ان کی راتیں ناز و ادا اور عشق و غم سے بھر گزرتیں اور دن خوش فطیلاں کتے گزر جاتے۔



جو دیرہ ساٹھ لاکھ لگا کر جب یہ کشتی کی سیلون کے قریب پہنچیں تو ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔
ساٹھ میں بھی انہیں ایک طویل عرصے تک بارشوں کی وجہ سے ٹھہرا پڑا۔ سیلون کے آگے کسی من مندا تھا۔ مار کو
کو وہاں بھی کئی ماہ گزارنے پڑے۔

اس تمام عرصے میں زندہ بچنے والی کینزوں کی ادا اسی طرح تھی۔ بہت سی کینزوں جھگیوں پر ایسی فریفتہ بوٹیں
کر ان میں سے کچھ نے ساٹھ اور سیلون میں شہزادی کا ساتھ چھوڑ دیا۔ بہت سی بوٹیں کے گرم دروازے کا مقابلہ نہ کر
سکیں اور مر گئیں۔ جو باقی رہیں ان کے دن رات ٹوٹے ٹوٹے گزرتے۔ ان میں جو باقی رہیں وہ بوٹے بولوں کی
کشتی میں چلی گئیں۔ ان میں شہزادی اور مار کو کے رنگین دن رات دیکھنے کا تاب نہ تھی لیکن بعض کینزوں بہت سی تھیں۔
رات کو جب مار کو اور شہزادی کو کاجین کشتی میں بنے ہوئے کھڑی کے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیتے تو وہ
دروازوں کی درزوں سے جھانکتی رہتیں۔

آخر مار کو کو کینزوں پر رحم آ گیا۔ وہ ان کی حق تلفی نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے خیال میں اس وقت ایسا میں دو
خاندان تھے ایک قاضی خان خاندان دشت۔ دوسرا قضاوی خان، خاندان جین۔ مار کو پوچھنے ایک تیسرے خاندان کا
ردپ دھارا وہ خاندان بحر (سمندر) بن گیا۔ اس نے بڑی دیدہ دلیری سے قضاوی خان کی خواب گاہ کی ریت جاری کی۔ وہ
قضاوی خان کی طرح ہر روز پچھونیزوں کا انتخاب کرتا۔ تین کینزوں دن کے واسطے اور تین رات کے لیے۔ اس نے اپنے
شب دروازے قضاوی خان کی طرح گزارنے شروع کر دیے۔ اسے ڈر کس کا تھا؟ شہزادی کو کاجین کبھی شکوہ کرتی تو وہ کہتا کہ
وہ تو اس کے باپ قضاوی خان کی رسم کو زندہ کر رہا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ اس کا سفر ختم ہونے سے پہلے ہی قضاوی خان
اپنی زندگی کی منزل کو پہنچ چکے ہیں اور اس کی روح اپنے بزرگوں کے مقبرے کے پیر کاٹ رہی ہے یا پھر وہ اپنے ارواح
میں آسیب یعنی منڈلاہ رہی ہے اور ایران میں شہزادی کو کاجین کے شوہر ارغون خان کی آنکھیں اپنی بوری کے انتظار
میں پھنکر کر ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی ہیں۔



کئی ہی نہ تھی۔

پھر ملکہ اہلی کچھی کی مہربانیاں اس وقت اور بڑھ گئیں جب ایک رات اس نے اپنے وزیر کے ذریعے مار کو کو
اپنے خیمے میں رات بسر کرنے کی دعوت دی۔ مار کو کیسے انکار کرتا۔ وہ ملکہ کا احسان مند تھا۔ پھر انکار کی صورت میں
اس پر کیا گزرتی، وہ یہ بھی جانتا تھا۔

مار کو نے دعوت قبول کر لی اور جانے کے لیے تیار ہوا۔

شہزادی کو کاجین نے سنا تو وہ حد سے ملگ اٹھی۔ اس نے چاہا کہ مار کو کو منع کرے لیکن مار کو اس کا
کون لگتا تھا۔ اسے مار کو کو روکنے کا کیا حق حاصل تھا۔ وہ خاموش ہو رہی مگر مار کو ہنستا ہوا چلا گیا۔
شہزادی کو کاجین رات بھر انگاروں پر لوٹتی رہی۔ وہ دل ہلانے کے لیے کینزوں کی جھونپڑیوں کی طرف کئی گھر
ہر کینز کے ساتھ جھونپڑی میں ایک مرد موجود تھا۔ کینزوں بھی ہر رات اپنی پسند کا ایک مرد منتخب کر کے وادیش دیتی تھیں
آخر وہ شہزادی سے پیچھے کیوں رہتیں۔ یہ سبق تو انہیں شہزادی ہی نے سکھایا تھا۔

شہزادی جتنی شکایت اپنے خیمے میں دہاں آئی۔ اس نے اندر قدم رکھا تو جھگی سردار کو اپنا منتظر پایا۔ وہ سفید سفید
دانت نکالے ہنس رہا تھا۔ وہ آج خالی تھا کیونکہ ملکہ مار کو کے ساتھ معروض تھی۔ سردار نے ملکہ سے شہزادی کے پاس
جانے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ اب اسے کوئی روک سکتا تھا اور کس میں حافظت تھی کہ سردار کے پاس سے میں آئے۔
چار سال قبل قضاوی خان نے جب اس علاقے پر یورش کی تھی تو ان جھگی باشندوں نے اس کی سخت مدافعت
کی تھی لیکن قضاوی خان کے طرفدارانے کو یہ نہ روک سکے اور شکست کھا کر قضاوی خان کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ قضاوی
ان پر سخت غصہ تھا۔ اس نے طیش کے عالم میں جوان عورتوں کے ننگے پستانوں کو کاٹنے کا حکم دیا تھا اور چار مال کے بے
اس کی بیٹی برہنہ سینے کے ساتھ اسی قوم کے ایک سردار کے سامنے موجود تھی۔ وقت اور تاریخ اپنے آپ کو دھسا
رہی تھی۔

شہزادی کو کاجین نے عقلمندی کا ثبوت دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت انکار کا ریکا اور مدافعت طاقت ہے۔ اس
خود کو بخوشی سردار کے سپرد کر دیا۔

صبح کو جب مار کو پوچھا اور شہزادی کو کاجین ایک دوسرے سے ملے تو گزشتہ رات کی کہانی نہ کسی نے پوچھی اور
نہ کسی نے دہرائی۔

تین ماہ بعد بارشیں رک گئیں اور مار کو پوچھنے اپنا بحری سفر دوبارہ شروع کیا۔
ملکہ اہلی کچھی نے انہیں بڑی خوشدلی سے رخصت کیا۔ پہلے وقت ملکہ نے پانڈی سے بھری کئی پیٹیاں مار کو کو
اپنے ساتھ بسر کی بوٹی راتوں کی یادگار کے طور پر سپرد کر دیں۔

۶۹۴ء میں قبلائی خان نے چین میں انتقال کیا اور اسی سال کے آخر میں دو سال کے طویل بحری سفر کے بعد مارکوپولو کی دو کشتیاں ایران کے ساحل سے آگئیں۔

ارغون خان مرحوم کا بیٹا تھا۔ شاہ غازان ایران کا حاکم تھا۔ شاہ غازان، مرحوم ارغون خان کی ہونے والی ملک کو عزت سے اتار کر لایا اور شہزادی کوکا چین کو اپنی ملکہ کے طور پر قبول کر لیا۔

مارکوپولو قبلائی خان کی امانت (جس میں وہ بددیانتی کر چکا تھا) غازان کے حوالے کرنے کے بعد واپس جانے لگا تو شہزادی کوکا چین نے اس کی خدمات کے سلسلے میں یا دو سال کی رنگین رفاقت کی یادگار کے طور پر قبلائی خان کی نوادرات کی وہ پیٹی بھی جس میں سبام کا ایک لعل بوندگی کے برابر تھا، ترشے ہوئے باقی دانت، نعل کے بھاری ترشے ہوئے جیہ، چڑیوں کے انڈوں جیسے بڑے بڑے موتیوں کے جوڑے اور صدائے قسم کے دوسرے جواہر تھے، مارکوپولو کے حوالے کر دی اور پھر اسے پختہ نم رخصت کیا۔



مارکوپولو اور شہزادی کوکا چین کے اس بحری سفر کا ایک حیرت انگیز پہلو یہ بھی ہے کہ چین سے چلتے وقت چار کشتیوں میں سوار دوسرے دو سوار اور عورتیں سوار تھیں جن میں سے صرف اٹھارہ ایران کے ساحل تک پہنچ سکے۔ ان زندہ بچے والوں میں شہزادی، مارکوپولو، چودہ کنیزوں کے علاوہ پولو خاندان کے وہ دو بوڑھے بھی تھے جن کا چلنا پھرنا ڈوبہ تھا۔ لقیہ تمام کے تمام موت کی نذر ہو گئے۔

کیوں اور کیسے؟

اس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔

مغرب کے مؤرخوں نے ڈرتے ڈرتے اس باب میں کچھ اشارے موزور کیے ہیں لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ مارکوپولو جیسا مؤرخ جو اپنی چرب زبانی اور لغاتی کے لیے مشہور ہے اس نے اپنے اس طویل سفر کا حال صرف یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ: "شہزادی کوکا چین ستو سال کی دو شیرہ تھی، بڑی حسین اور جاذبِ نظر لڑکی، وہ ہم سے جلد ہوتے وقت بہت دوستی، لیکن وہ حقیقت پر پردہ ڈالتے وقت یہ بھول گیا کہ مغربی مؤرخوں کے اشاروں کے پس منظر میں ابھرتی ہوئی اس داستان کے بہت سے رخ ہیں۔ اس کا ایک رخ یہ بھی ہے۔

اور شاید: تاریخ!



⑨

ماہِ پارہ

○

خاقان قبلائی خان کے پوتے نے ایک دم گھوڑے کی راسیں زور سے کھینچیں۔ سامنے در پر رہا، گردن بٹا، کابل اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھی بھی گھوڑے روک کر کھڑے ہو گئے۔

شہزادے نے ایک ادبیٹر عزیز سردار سے بوائے کچھ ہی دن پیشتر شاہگشاؤں آیا تھا، پوچھا: "یہ گزشتہ کسی اٹھ رہا ہے۔ کوئی دشمن تو نہیں آ رہا؟"

مغل سردار نے مسکرا کر جواب دیا:

"شہزادے تیور! آپ مغل خاقان اور چین کے شہنشاہ قبلائی خان کے دلی عہد میں دشمن تو آپ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا!"

"پھر بھی ہمیں دشمن سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔" شہزادے نے کہا:

"بزرگ کہتے ہیں کہ بہادر وہ ہے جس کی چار آنکھیں ہوں یعنی وہ سامنے ہی دیکھے اور پشت پر بھی نظر رکھے!"

پھر وہ سوچتے ہوئے بولا:

"تم نے ہمارے باپ کو تو دیکھا ہو گا۔ سنا ہے وہ بہت بہادر تھے۔"

"بہت بہادر" سردار نے کہا:

"آپ کے والد چنگ کم خاقان کے ساتھ کئی جنگوں میں شریک ہوئے۔ بالکے شمشیر زن تھے۔ تیرا انداز تو ایسے کہ اڑتی چڑیا کی آنکھ کا نشانہ باندھتے تو تیرا خاندان ہوتا تھا لیکن....."

مردار کتے کتے کہتے رکا۔

شہزادہ بے چین سا ہو گیا۔ اس نے پوچھا،
"ماں! ہاں ہو تم کتے کتے کہتے رک کیوں گے؟"

"بچی بات ذرا تلخ ہوئی ہے شہزادے! مردار نے کہا،

"ابھی آپ کم سن ہیں۔ کہیں میری بات آپ کو ناگوار نہ لگے؟"

شہزادے نے ذرا تلخی سے کہا:

"مغل مردار تمہیں ہمارے ساتھ رہنا ہے تو اس بات کا خیال رکھو کہ تم ادھوری بات سننا پسند نہیں کرتے
تمہیں اپنی بات پوری کرنا ہوگی۔"

گرد و غبار کے بادل قریب آگئے تھے۔

مغل مردار بات کہہ کر خود ہی چھٹس گیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ اس وقت بات ٹٹلنے کی کوشش کرے
گا تو اس کے حق میں اچھا نہ ہو گا اس لیے اسے ادھوری بات کو پورا کرنا ہی بہتر ہے۔

مغل مردار نے جی کوڑا کر کے بڑی ہمت سے کہا:

"شہزادے! تجور۔ آپ کے والد بڑی فوجیچہ کے مالک تھے مگر ان میں یہ عیب تھا کہ وہ انسان دوست تھے اور
مذہب دینا والوں سے محبت کرتے تھے۔"

شہزادہ تجور کی بھوس غصے سے کھپی ہوئی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ مغل مردار اس کے باپ کے متعلق کوئی سخت
بات کہنا چاہتا ہے لیکن مغل مردار کے منہ سے یہ بات سن کر وہ مسکولے بغیر نہ سکا۔ اس نے اپنا گھوڑا اسی کے بارے
لیے جا کر کہا:

"تم نے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیا مردار۔ میں نے طے کیا تھا کہ اگر تم نے میرے باپ کی ٹولہ در درجہ سے ذرا بھی
گستاخی کی تو میں تمہاری گردن اڑا دوں گا لیکن تم نے تو ان کی تعریف کہہ ہے۔ انسان دوستی اور مذہب لوگوں کی
عزت کرنا تو انسان کا بہت بڑا وصف ہے۔"

"لیکن یہ ماسا کے خلاف ہے! مغل مردار نے جرح کی:

"خاقان چنگیز خان نے ارشاد فرمایا تھا کہ وحشیوں کی تقدیر یہ ہے کہ وہ تمدن دنیا پر حکومت کریں۔ مغلوں
کے علاوہ تمام انسان صرف مغلوں کی چاکری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اب بتائیے کہ چنگیز خان کا یہ فرمان جو ملے
یادہ بزرگ جو ملے جس نے آپ کو انسان دوستی کا سبق پڑھایا ہے۔"

شہزادہ تجور کو ایک بار پھر غصہ آ گیا۔ اس نے ٹوک کر کہا:

"بزدل جو تو نے اس بزرگ کو چوٹا کہا۔ کیونکہ مجھے انسانیت کا یہ سبق پڑھنے والی ماں میرا ہاں شہزادی
لالہ رخ میں جن کی عزت خود خاقان کرتا ہے۔ ماں میرا ہاں کا سبق بھی انتہائی درست اور سچا ہے جتنا یا
(چنگیزی دستور) کا فرمان؟"

گرد گرد پادہ چاک ہر چکا تھا اور چالیس بیس مغل سوار گھوڑے بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ شہزادہ تجور اور
دوسرے تمام لوگ آنے والوں کی طرف دیکھنے لگے۔

خان قلعہ خان کا پوتا اور شہزادہ چنگ کم کا بیٹا شہزادہ تجور اس وقت تیرہویں سال میں تھا۔ شہزادہ تجور کی
پرورش اور نگہداشت کی پوری ذمہ داری چنگ کم کی حسین و جمیل بیوہ لالہ رخ پر تھی جو بہت کی ایک معمولی رقم
سے مغل دلی صمد چنگ کم کی بیوی بن گئی تھی لیکن چنگ کم کی عمر نے وفات کی اور اس نے عین عالم برائی میں وفات
پائی۔ لالہ رخ چ بچی ڈرٹ سے بڑے مغل سردار سے شادی کر لیتی لیکن لالہ رخ نے اپنے شوهر کی دوسری بیوی
کے رشتے تجور پر جوانی نثار کر دی۔

لالہ رخ نے تجور کو نہ صرف ماں کا پیار دیا۔ (تجور کی ماں احمد کے پیدا ہوتے ہی رگنی مٹی) بلکہ تجور کو ایک
بہادر مغل بنانے کے ساتھ انسان دوست بننے کا بھی سبق دیا تھا۔

آنے والے سوار گھوڑے غبار میں اٹھے تھے جو اس بات کا غماز تھا کہ وہ در دراز کے سبز سے آ رہے تھے۔ ہر
سوار کے آگے دو دو حسین لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ہر ایک سوار ایسا تھا جس کے آگے سرن ایک بڑی مٹی۔ اس لڑکی
کے ہاتھ رسیوں سے بندھے تھے جبکہ تمام دوسری لڑکیوں کے ہاتھ کھلے تھے۔

شہزادہ تجور کی دلی عیسی کا ابھی اعلان تو نہ ہوا تھا لیکن سب جانتے تھے کہ مستقبل کا خاقان اور شہنشاہ چین
تجوری ہو گا۔ آنے والوں نے شہزادہ تجور کو رکھا تو تعظیم کے لیے جلدی سے اپنے گھوڑے سے اتر پڑے۔ ہر
وہ سوار گھوڑے ہی پر بیٹھا۔ جس کے آگے رسیوں میں بچہ بڑی بیٹھی تھی۔

شہزادہ تجور نے اپنے گھوڑے کا رخ ادھر ہی موڑا اور اس گھڑی سے اس جا کر پوچھا:

"تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو اور ان لڑکیوں کو کیوں پکڑ رکھا ہے؟"

سوار جو تجور کو اپنی طرف آتے دیکھ کر پہلے ہی گھبرا ہوا تھا، شہزادے کے سوال سے اوپر پریشان ہو گیا۔ اس کی
گھبراہٹ اور پریشانی بے انتہی۔ اس لیے کہ اس نے آج تک شاہی خاندان کے کسی فرد سے مردار اور اس قدر قریب
سے بات نہ کی تھی۔

سوار نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"شہزادے! بہادر مجھے معاف کیجئے۔ میں اس رذیل لڑکی کی وجہ سے دوسروں کی طرح گھوڑے سے اتار کر

آپ کی تعظیم نہ کر سکا۔

شہزادہ تیمور کے کان سوار کی بات کی طرف اد نظر میں لڑکی پر جھمی تھیں۔ اس نے اسی حالت میں کہا:
"نکدہ کو سوار ہم نے پہلے ہی جان لیا تھا کہ کوئی ایسی غیر معمولی بات ضرور ہے جس نے تمہیں ہماری تعظیم سے باز رکھا۔ ہم نے تم سے جو سوال کیا ہے اس کا جواب دو۔"
سوار کی پریشانی کم ہو گئی اس نے کہا:

..... بہادر شہزادے یہ تمام چینی حسیناؤں، خاتان کے حرم کے نئے سال کاغذ ہیں۔ ہم نے انھیں بہت دودھ دھوپ کے بعد حاصل کیا ہے۔
"ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھ سوار۔" شہزادے نے وضاحت طلب کی۔

"شہزادہ عالم" سوار نے کہا:

"ان میں سے بعض لڑکیاں تو خاتان کے حرم کا نام سن کر خود بخود ہمارے ساتھ آنے پر آمادہ ہو گئیں۔ کچھ لڑکیوں کو ہم نے ان کے والدین کو قیمت دے کر حاصل کیا ہے۔ بعض لڑکیاں ایسی بھی ہیں جن کے لیے ہمیں تلواریں اٹھان پڑی اور ان کے عزیزوں کو جہنم رسید کرنا پڑا۔"

شہزادہ تیمور کے چہرے پر ناگوار کی آواز نمودار ہوئی۔ اس نے پوچھا:

"لیکن ہماری سبھی یہ نہیں آتا کہ ہمارے بوڑھے دادا جان خاتان قبلائی خان جو مقبر میں پیر رکھائے بیٹے ہیں وہ اتنی بہت سی جوان لڑکیوں سے ایک ساتھ کیسے شادی کر دیں گے؟"

سوار کو شاید شہزادے کی باتیں ناگوار گزریں۔ شہزادے نے جس انداز سے خاتان پر تہمت کیا تھا اس سے خاتان کی توہین ہوتی تھی لیکن اسے جواب تو آخر دینا ہی تھا۔ اس نے کہا:

"شہزادہ عالم! خاتان تو ان میں سے ایک سے بھی شادی نہیں کریں گے بلکہ ان تمام لڑکیوں کو لذت کدہ کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"کیا نام لیا تم نے؟" شہزادے نے حیرت سے پوچھا:

"یہ نامی تو کا دار دروغ ہے کیا، یا خاتان کے محل کا محافظ۔ ہم نے یہ نام پہلے نہیں سنا۔"

خاتان قبلائی خان کا یہ طریقہ تھا کہ وہ اپنی جائز اولاد کو عا طر سے اپنے سے دور رکھ کر تھاکا تاکہ خاتان کی شیطانی اور وحشیانہ عیاشی کا اثر ان پر نہ پڑے۔ شہزادی کو کاجین کو بھی اس نے ہمیشہ ملک ختام میں رکھا تھا اور شہزادے تیمور کو ٹائیٹ سے ہٹا کر شاہک تو کے جنگل میں اپنے بانسوں والے محل میں بیچ دیا تھا۔... شہزادی لارہ رخ اسے چپیں دیکھ سے میاں لے کر آگئی تھی۔ شہزادہ تیمور اسی وجہ سے اپنے دادا کی عیاشیوں سے پوری طرح

واقف نہ تھا۔

مغل گھر سوار کو شہزادے کے سوال پر بڑا تعجب ہوا۔ مختلف قبلائی خان کے لذت کدہ سے کون واقف نہ تھا۔ لذت کدہ قبلائی خان کا وہ محکمہ تھا جس میں اس کی ہزار ہا داشتہ لڑکیاں کدہ کدہ کچھ جال اندر پر درش ہوتی تھیں۔ اس کی نگہ ان ایک چالاک مغل خاتون تھی جو داشتہ لڑکیوں کے ناؤ سنگھار کی ماہر تھی اور ہر روز چھ لڑکیوں کا انتخاب کر کے انہیں خاتان کی دن رات کی عیاشی کی نذر کرتی تھی۔ ان میں سے تین لڑکیاں دن میں قبلائی کی ہوس کا شکار ہوئیں اور تین کچھوں کی پیگھر لڑکیاں ہر رات قبلائی خان کے ہاتھوں بکھر جاتیں۔

سوار نے حیرت انگیز جواب دیا:

"شہزادہ عالم! تعجب ہے کہ آپ کو اس محکمے کا علم نہیں۔... لذت کدہ سے میں خاتان کی داشتہ لڑکیاں رکھی جاتی ہیں اور حسب ضرورت خاتان معظم کا دل بدلنے اور خاتان سے لذت کا نفع حاصل کرتی ہیں۔"
شہزادہ تیمور نے اس بات میں کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ اس کی نظر اب اب تک گرفتار لڑکی پر لگی تھیں۔ اس نے پوچھا:

"کیا وجہ ہے کہ تمام لڑکیاں آزاد ہیں اور اس دوشیزہ کو تم نے رسیوں سے باندھ رکھا ہے؟"

"یہ بہت تیز طرار اور چالاک لڑکی ہے شہزادے۔" سوار نے ادب سے جواب دیا:

"ہم نے اسے پکڑنا چاہا تو یہ ہمارے گھوڑے پر بیٹھ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ تو ہم چاروں طرف پیچھے ہوتے تھے۔ بڑی مشکل سے ہم نے اسے گھیر گھا کر پکڑا ہے۔ پھر بھی اس نے ہمارے کئی ساتھیوں کو اپنے خیمے سے زخمی کر دیا ہے۔"

شہزادے کی نظر اب بھی لڑکی پر لگی تھیں۔ اس نے پوچھا:

"کیا یہ لڑکی چینی ہے؟"

"نہیں ہی لڑکیا، چینی ہیں شہزادہ عالی مقام۔" سوار نے جواب دیا۔

"گول چہرہ، گٹھا جسم، سرخ گالوں پر زردی کی ملامت، بظاہر یہ چینی نظر آتی ہے لیکن اس کی نیکی شکیلی مغرور آنکھیں چینی نہیں ہیں۔ اس کا تہ بھی چینی لڑکیوں سے زیادہ لانا ہے۔" شہزادہ جیسے عالم بے خودی میں لڑکی کا سراپا بیان کر رہا تھا۔

اس وقت سوار نے ان لڑکیوں کے ارد گرد کوئی چینی موجود نہ تھا۔ شہزادے کے تمام محافظ اور لڑکیاں پکڑ کر لانے والے تمام ہی مغل تھے وہ سب خالص مغل زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ زبان بھی وہ جو صرحت دشت قرقرم یا جیل بیکال کے ارد گرد کے لوگ بولتے ہیں۔ شہزادے نے اپنی منبولی ماں سے تہی زبان، چینی اہل کاروں اور

لازمین سے چینی سیکھی تھی لیکن اس کے محل میں جتنی کمزریں تھیں وہ سب مغلوں کے چار مشہور خاندانوں نکلوانے
تھا جو تہذیب اور انسانی مانگی ہو تھیں۔ قبلائی خان نے ان عورتوں کو تکرار کے محل میں شاہک زبھیجا تھا کہ
وہ مستقبل کے خاقان کو مغل آداب نشست و برخواست اور مغل زبان و گفتگو میں مامور کریں۔

شہزادے نے توڑکی کا سراپا بیان کیا تھا اس نے سوار سے سوال نہ کیا تھا۔ اس لیے وہ خاموش تھا۔ چینی
رہائیں مغل زبان سے واقف نہ تھیں اس لیے وہ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر کہہ جاتی تھیں۔
پھر شہزادے نے جیسے خواب سے چونک کر کہا:

"ہمارا خیال ہے کہ اس توڑکی کی ماں ضرور کسی مغل کی داشتہ...."

اتنا سنا تھا کہ گرفتار توڑکی کا چہرہ مغل سے سرخ ہو گیا.... وہ شہزادے کی بات کاٹھے ہوئے کھلی کاٹ
کوڑی اور بدل کے مانند گرجتے ہوئے بولی:

"خبردار جو تو نے میری ماں کے بارے میں ایک غلط بھی کہا۔ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔"

توڑکی کی بات سن کر ہر شخص کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ انہیں اس بات پر حیرت نہ تھی کہ توڑکی نے مستقبل کے
خاقان کو لگائی دی تھی اس کی توہین کی تھی۔ انھیں تعجب تو اس بات پر تھا کہ یہ چینی توڑکی خالص مغل زبان اور مغل
میں کوڑی تھی۔

"ہمارا خیال ٹھیک نکلا۔ تم چینی نہیں مغل توڑکی ہو۔ کیوں؟" شہزادے نے سب سے پہلے اپنی حیرت دہر کر
کی کوشش کی۔

"نہیں۔ میں چینی ہوں۔ توڑکی نے اسی کو ختم لے میں جواب دیا۔

شہزادہ اس جواب سے پھر راس ہو گیا۔ اس نے پوچھا:

"تم نے مغل زبان کہاں اور کس سے سیکھی؟"

"اپنے گھر میں اپنی ماں سے جس کی تم توہین کر رہے ہو۔" توڑکی غصے سے بتائی۔

"تمہاری ماں کہاں ہے؟ ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔" شہزادے نے معذرت کے انداز میں کہا۔

توڑکی کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ آنکھیں ڈبڈبائیں۔ اس نے کہا:

"تم اس سے نہیں مل سکتے۔ اس کی سولہ و نیلے جاودانی آسمان پر چل گئی ہے۔"

"یہ سن کے ہمیں انھوں نے ہوا توڑکی۔" شہزادے نے ہمدردی بتائی:

"لیکن تمہاری ماں ضرور مغل ہوگی۔ جاودانی آسمان تو مغلوں کے عقائد کا حصہ ہے۔"

"میں کسی عقیدے کو نہیں جانتی۔ میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ میری ماں چینی تھی۔" توڑکی نے بے دلت

"اور تمہارا باپ، توڑکی؟ شہزادے نے پوچھا۔

"وہ بھی چینی تھا۔ ہمارا پورا خاندان چینی ہے۔ ہم مغلوں سے نفرت کرتے ہیں۔" توڑکی کو جیسے غصہ آگیا۔
شہزادے نے بڑی محبت سے پوچھا:

"اس نفرت کی کوئی وجہ تو ہوگی؟"

"ہاں۔ ہے۔" توڑکی نے بے باکی سے کہا:

"مغل غاصب ہیں۔ انھوں نے چین پر زبردستی قبضہ کر رکھا ہے؟

"تو مغلوں کی توہین کر رہی ہے؟" شہزادے کو ذرا غصہ آیا:

"یہ عقل کی باتیں تجھے کس نے سکھائیں؟"

"میری ماں نے۔" توڑکی بے دھڑک بولی:

"جب میں آٹھ سال کی تھی تو وہ مر گئی۔ آج وہ زندہ ہوئی تو میں اس سے زیادہ عقل مند اور شہر زور ہوتی۔"

"تو خوش قسمت ہے توڑکی۔" شہزادہ افسردگی سے بولا:

"تجھے آٹھ سال تک ماں کی آغوش میں کچھن نصیب ہوا۔ میں تو اپنی ماں کی صورت بھی نہ دیکھ سکا لیکن تجھے
فریے کہ تجھے جس خاتون نے ماں بن کر پالا ہے اس کی تربیت سے میں تیرے سال کی عمر میں بھی خود میں اتنی توانائی
پاتا ہوں کہ میں اپنے بوڑھے دادا خاقان سے خود کو بڑے محسوس کرتا ہوں۔"

توڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تمام مغل سوار شہزادے اور اس شہزادے کی نوک جھونک بڑی دلچسپی
سے سن رہے تھے۔

شہزادہ تیمور نے یکایک سوار کو حکم دیا:

"توڑکی کے اٹھ گول دیے جائیں۔"

تمام سواروں نے حیرت سے شہزادے کو دیکھا۔ توڑکی بھی حیران نظر و دل سے شہزادے کو دیکھنے لگی۔ سوار
گولوں کی حالت میں تھا۔

شہزادے نے الفاظ دہرائے ہوئے کہا:

"توڑکی کو گولوں کا بجائے۔ یہ جہانگاہ کی توہم جو اسے پکڑ کر تمہارے حوالے کریں گے۔"

"تو مرد ہے۔ ایک توڑکی سے مقابلہ کرتے تجھے شرم نہیں آتی۔" توڑکی نے شہزادے کا مذاق اڑایا۔

شہزادے نے اپنا گھوڑا اس سے اور قریب کرتے ہوئے کہا:

"ہم جانتے ہیں توڑکی ہے مگر ہمارے ہم توڑکی سے نہیں ایک ہمارے سے مقابلہ کریں گے۔ مغل ہمارے

کی قدر کرتے ہیں۔

لڑکی کے ہاتھ کھول دیے گئے۔

اس کا خنجر کہاں ہے وہ بھی اس کے حوالے کیا جائے۔ شہزادے نے دوسرا حکم دیا۔

خنجر بھی لڑکی کے حوالے کر دیا گیا۔ لڑکی نے خنجر کمر میں لگا دیا۔ کلائیوں پر ہاتھ پھیرا۔ رسیوں کے نشان اس کی گوری کلائیوں پر سرخ دھبوں کی طرح ابھرائے تھے۔ وہ بولی:

”تو شہزادہ ہے۔ تو نے عمل میں پرورش پائی ہے۔ میں جھگ کی ہرئی ہوں۔ تو میری گرد کو بھی نہ پاسکے گا۔ میں بکلی ہوں۔ شرارہ ہوں۔ طوفان ہوں۔“

شہزادہ تیسرے سنا اور بولا:

”تو شرارہ اور طوفان ہے تو ہم بھی مستقبل کے خاقان ہیں۔ اگر آج ہم ایک لڑکی پر قابو نہ پاسکے تو کل شہنشاہ جہیں ہو کر اتنی بڑی حکومت کس طرح قابو میں رکھ سکیں گے؟“

لڑکی کی آنکھوں میں شرارت جھانکنے لگی۔ اس نے شوخی سے کہا:

”اگر تو ہار گیا تو کیا کرے گا؟“

”میں وہی کروں گا جو تم ہارنے پر کرتی ہو۔ شہزادے نے ہنس کر کہا۔

”میں اپنی ہار کبھی نہیں مانتی۔“ لڑکی نے تیزی سے کہا:

”اگر میں ہار گئی تو پھر کوشش کروں گی اور جیت کے دم لوں گی۔“

شہزادہ اس جواب پر دم بخود رہ گیا۔ اس نے کہا:

”لڑکی یہ اصول تو مغلوں کا ہے۔ تو نے یہ بات کس سے سنی؟“

”یہ اصول بھی مجھے میری ماں نے سکھایا تھا۔“ لڑکی نے لا پرواہی سے کہا۔

دو دنوں میں پھر اسے عجیب و غریب مقابلے کے لیے تیار تھے۔ جگلی ہرئی نے گھوڑے کی راسیں سنبھال

لیں۔ پھر نہ جانے کیا خیال آیا کہ گھوڑے سے اتار پڑی۔

شہزادے کو خیال ہوا کہ شاید لڑکی مقابلے سے سترارہ ہی ہے۔ اس نے تسخیر سے کہا:

”تو نے مقابلے سے پہلے ہی شکست تسلیم کر لی۔“

”نہیں یہ بات نہیں۔“ لڑکی بولی:

”میں اس گھوڑے پر سواری نہیں کروں گی۔“

”یہ تیری مرضی۔“ شہزادے نے کہا:

”تو جگھڑا پسند کرنے دیا جاسکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مقابلہ بالکل صاف اور بغیر جانبداریوں میں ہوتا کی۔“

بولی شکست کا ہانہ نہ تعلق کر سکے۔

لڑکی اپنے گھوڑے کے پاس سے ہٹ کر شہزادے کے گھوڑے کے پاس آگئی۔ شہزادے کا گھوڑا ہلتی تھا جس کے جسم کا زیادہ حصہ سیاہ مگر پیٹھ اور گردن پر سفید تھے۔ گھوڑے کی دونوں آنکھوں کے اوپر پیشانی کے بالکل درمیان میں بھی ایک سفید چھوٹا سا پٹہ تھا جس کی وجہ سے گھوڑا دیکھنے میں بڑا خوبصورت لگتا تھا۔

لڑکی نے شہزادے کے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

”میں تمہارے گھوڑے پر سواری کروں گی۔“

لڑکی نے پہلی بار تو ادب سے کہے بغیر لفظ ”تمہارے“ استعمال کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی کی گفتگو میں اب پہلی سی حقارت اور جھجک نہیں ہے۔

شہزادہ گھوڑے سے اتر پڑا اور بولا:

”ٹھیک ہے۔ میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا لیکن شکست سزاوردوں گا۔“ شہزادے نے بھی اپنا انداز گفتگو بدل کر ذرا اپنائیت اور بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔

لڑکی نے شہزادے کے گھوڑے کی راسیں پکڑ لیں۔ چاہا کہ اس پر سوار ہو۔ پھر نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس نے گھوڑے کی راسیں شہزادے کی طرف بڑھائیں اور بولی:

”نہیں۔ میں گھوڑے پر سواری نہیں کروں گی۔ تمہارا گھوڑا ایسا بہتر اور تیز رفتار ہوگا۔ کیونکہ تم شہزادے

ہو لیکن میں اپنی کامیابی کی صورت میں یہ نہیں چاہتی کہ لوگ کہیں کہ جیت سواری کی ہوئی سوار کا کوئی کمال نہ

تھا میں اپنی کامیابی میں گھوڑے کی محتاج نہیں بنتا چاہتی؟“

شہزادے نے گھوڑے کی راسیں واپس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

اس دقت چلی بار لڑکی اور شہزادے کی نگاہوں کا براہ راست تقابلی ہوا۔ جگلی ہرئی جو اب تک

بڑبڑ بڑ بڑ کے باتیں کر رہی تھی وہ نہ جانے کیوں شہزادے کی نظروں سے نظریں مار کر گھبرائی۔ جگلی اور اس کا ماتر

جو شہزادے کی طرف بڑھا ہوا تھا، تھوڑا سا کانپ گیا۔ گھوڑے کی راسیں اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہونے سے

بیچوٹک لگیں۔ شہزادہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ اس نے راسیں سنبھالنے کی کوشش کی۔

گدا اس کو کوشش اور محبت کے عالم میں شہزادے کا ہاتھ لڑکی کے ہاتھ سے ٹکرایا۔

لڑکی گھبرا کر ایک تھکے بڑ گئی۔ اس کی نظریں شاید غلط جاسے ایک لمحے کے لیے بھی برہنہ نہ ہو سکی۔

دوسرے ہی لمحے وہ تیزی سے واپس ہو کر پہلے گھوڑے کے پاس پہنچ گئی۔

شہزادہ بھی اس وقت تک خود کو سنبھال چکا تھا اور لڑکی بھی اپنے اوپر قابو پا چکی تھی۔

لڑکی گھوڑے کے پاس پہنچی اور ہلٹ کر بولی:

"میں مظلوم کے لیے تیار ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ شہزادہ بھڑ پر قابو نہ پاسکے گا اس لیے میں شہزادے کو دس قدم آگے کی رعایت دینا چاہتی ہوں۔"

شہزادے نے لڑکی کی رعایت کی پیش کش ٹھکراتے ہوئے کہا:

"تم مجھے رعایت دے کر موعوب کرنا چاہتی ہو۔ میں تمہیں اپنی طاقت، فراست اور فن سے زیر کر دوں گا۔ تم چاہو تو میں تمہیں یہ رعایت دے سکتا ہوں۔"

لڑکی نے مسکرا کر اس گھوڑے کو غور سے دیکھا جس پر وہ سوار ہونے والی تھی پھر بولی:

"شہزادے۔ مقابلہ شہزادہ ہو چکا ہے۔ میں جاری ہوں۔ مجھے کٹر سکے ہو تو کٹر دو۔"

شہزادے نے اپنے گھوڑے کی رامیں سنبھالیں اور گھوڑے پر بیٹھنے کے لیے تیزی سے رکاب میں پیر ڈالائیں وہ جنگی ہرنی اس وقت تک نہایت پیر تھی جست لگا کر بغیر رکاب میں پیر ڈالے گھوڑے پر سوار ہو چکی تھی۔ اور اس کا گھوڑا اڑ پڑا کر قدم اٹھا چکا تھا۔

شہزادے نے جس وقت گھوڑے پر سوار ہوا اپنے گھوڑے کو ہمیز دی اس وقت لڑکی اس سے پیس گز آگے نکل چکی تھی۔

یہ سب کچھ چشم زدوں میں ہوا۔

شہزادے کے سامنے اس وقت کوئی قبضہ نہ کر سکے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے تھا یا اب وہ کیا کریں۔ وہ تو صرف یہ دیکھنے میں مصروف تھے کہ میدان میں گز کے درمیان آگے پیچھے ہماگ رہے ہیں۔ ان کے سامنے فی الواقع میدان اور پشت پر وہ جنگل تھا جس سے نکل کر آنے والے سوار لڑکیوں کو لائے تھے۔

لڑکی پہلے میدان میں سیدٹ گھوڑا بھٹکانی رہی۔ پھر اس نے کاہ کاٹ کر شہزادے کو ایک بھٹکانی دی اور اتنی تیزی سے چلی کہ شہزادہ گھوڑا روکتے روکتے پیاس گز آگے نکل گیا جب اس نے گھوڑا موڑ کر دیکھا تو لڑکی اس سے سو گز کی دوری پر اس کے سواروں کی طرف جا رہی تھی۔

شہزادے نے گھوڑا تیز کر کے لڑکی کے پاس پہنچنے کی کوشش کی لیکن وہ تو جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی۔

لڑکی شہزادے کے سواروں کے سامنے سے برق رفتاری سے گزر کر جنگل کی طرف چلی اور دیکھتے ہی دیکھتے

جنگل میں داخل ہو کر غائب ہو گئی۔

شہزادے نے بھی اس کے تعاقب میں اپنا گھوڑا جنگل میں ڈال دیا۔



وہ رات چودھویں کی تھی۔

ماہتاب، شفاف آسمان پر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ستارے ماہتاب کی تابش سے نخل ہو کر ابرار اپنا منہ چھپا لیتے تھے۔

جس وقت لڑکی بستی میں پہنچی تو رات کافی گزر چکی تھی۔ یہ بستی ایک کچی پہاڑی کے دامن میں تیس بیستیس فٹ اوپر گھاس پھوس کی جھکیوں پر مشتمل تھی۔ بستی پر رات کا گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی جھکی میں بھی چراغ روشن تھا۔

اس کی جھکی بستی کے آگے ہی میں تھی۔ پھر بھی اس نے گھوڑے کی رفتار آہستہ کر لی تاکہ سونے والے بیدار ہو جائیں۔ وہ پہلے بیٹے میں شہزادہ تھی اور تھکن سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔

گھوڑے سے اتر کر لڑکی نے جھکی کے قریب درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ میں گھوڑے کی لگام چسوا دی۔ قدموں سے جھکی کی طرف بڑھی۔ اسے گھوڑا بھٹکانے اس وقت دس گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔

جھکی کے اندر بالکل خاموشی تھی۔ لڑکی نے پھوس کی دیوار میں ایک سوراخ سے جھانک کر اندر دیکھا۔ حیرے کی وجہ سے اسے کچھ نظر نہ آیا۔ مجبوراً اس نے بالوں کی ٹیٹی پر جو جھکی کے دروازے کے طور پر استعمال نہ تھی آہستہ سے ہاتھ قہقہا کیا۔

"کون ہے؟" اندر سے فوراً آواز آئی جیسے کوئی پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔

"ماروق۔ ماہ پارہ۔" لڑکی نے ٹیٹی میں منہ لگا کر مرگوشی کی۔

دروازہ فوراً کھل گیا۔ ماہ پارہ اندر داخل ہو کر دروازہ کھولنے والی بوڑھی عورت کے گلے میں ہاتھ ڈال کر لگئی۔ بالکل ایسے جیسے کوئی خزاں رسیدہ پتلا گرتے گرتے کسی شاخ میں اُلٹک جائے۔ بوڑھی عورت نے سینے سے پٹیا لیا۔

فاتر ہوں یہ مغل۔ میری بچی کو بھگان کر دیا۔ شک ہے کہ شاید مہنی (گوتم بدھ) نے تجھے بچالیا۔ ورنہ ان ظالموں نے ہاتھ پڑی ہوئی کوئی لڑکی کچھ تک واپس نہ آئی۔

بڑھیا بڑی جاتی تھی اور ماہ پارہ کو چٹائی پر لٹا جاتی تھی۔ ماہ پارہ کو لٹا کر اس نے جھونپڑی کا چراغ روشن کیا۔ پھر مٹری کے ٹوکے میں پانی لا کر ماہ پارہ کو پلایا۔

پانی پی کے ذرا اس کی طبیعت سنبھلی۔

’تو ان ظالموں کے ہاتھ سے کیسے بچی میری بچی؟ میں نے اور تمام بستی والوں نے تو تجھے صبر کر لیا تھا! بوری عورت نے بڑی رقت سے پوچھا۔

ماہ پارہ خلاؤں میں گھورنے لگی جیسے وہ سوچ رہی ہو کہ گزشتہ دس گھنٹوں کے دوران اس پر کیسے گوری اور کیسے گزری؟ بوری عورت جواب کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ پھر بھی اس نے ماہ پارہ کے خیالات کا سلسلہ توڑنے کی کوشش نہ کی۔

’یہ کہاں بڑی دلچسپ ہے ماں! ماہ پارہ نے جیسے خواب سے جگمگاتے ہوئے کہا:

’اس وقت میں بہت ٹھکی ہوئی ہوں۔ ذرا آرام کروں۔ صبح کو تفصیل سے بتاؤں گی۔

ماہ پارہ نے چٹائی پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی حالت میں اسے زمین پر جس پر اس کا ایک کان ٹکا ہوا تھا، ایک گھوڑے کے دوڑنے کی آواز سنا دی۔

ماہ پارہ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

’ماہلہ! وہ آگیا! ماہ پارہ کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

گھوڑا جھونپڑی کے پاس رک گیا۔ ماہ پارہ کو محسوس ہوا جیسے شہزادہ تیمور اس کی جھونپڑی کے بانس کے دروازے کے پاس کھڑا ہے۔

’کون آگیا بیٹی؟‘

بوری عورت نے ماہ پارہ کی پیشانی چھوئی۔ اسے خیال گزرا کہ شاید ماہ پارہ کو بخار ہو گیا ہے اور وہ ہائی

کیفیت میں بڑبڑا رہی ہے لیکن ماہ پارہ کو بخار نہ تھا۔

’بڑے دل میں ہول سا لگایا۔ آرام سے موجا کوئی نہیں آیا۔ یہ سارا تیرا دہم ہے۔ بڑھیا کی بڑبڑاہٹ

ختم نہ ہوئی تھی کہ بانس کے دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔

ماہ پارہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور بڑھیا خوف سے کاپ گئی۔ اس نے جلدی سے پھونک مار کر چراغ

بجھا دیا۔ جھونپڑی میں اندھیرا ہو گیا۔

دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

بڑھیا نے اندھیرے میں ماہ پارہ کو ٹٹول کر اپنی طرف کھینچا اور اس کے کان میں آہستہ سے کہا:

’جھونپڑی کے پیچھے ایک چٹائی ٹوٹی ہے۔ اس سے نکل کر بھاگ جا۔ اب میں تجھے منلوں کے حوالے نہ کروں گا۔ چاہے میری جان چلی جائے۔‘

ماہ پارہ بڑھیا سے انگ ہوتے ہوئے بولی:

’ماں! چراغ جلا دے اور دروازہ کھول دے۔‘

بڑھیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید وہ ماہ پارہ کے پاگل پن پر افسوس کر رہی تھی۔ ماہ پارہ خود اٹھی اور چراغ

جلا یا۔ بڑھیا کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

ماہ پارہ نے کہا:

’ماں! دروازہ کھول دے۔ مکان پر نشان ہو کر نہ لوٹ جائے۔‘

بڑھیا نے ڈرتے ڈرتے بانس کے دروازے میں اٹکی ہوئی ڈوری کھینچی۔ دروازہ کھل گیا۔ چراغ کی ہلکی

روشنی فوارہ کے چہرے پر پڑی تو بڑھیا بھگ کر ایک طرف ہو گئی۔

شہزادہ تیمد نے جھانک کر جھونپڑی میں دیکھا اور بڑے نرم لہجے میں کہا:

’ہیں اندر آسکتا ہوں؟‘

’جب یہاں تک آہی گیا ہے تو پھر اندر آنے میں کیا حرج ہے؟‘

ماہ پارہ چٹائی پر لیوں آتی پالتی ملے بیٹھی تھی جیسے کوئی بدھ گیان دھیان میں بیٹھا تھا۔ شہزادہ تیمور چٹائی

کے دوسرے کونے پر آ کر بکشتو کے مانند ادب سے بیٹھ گیا۔

دیوتا اور بکشتو آمنے سامنے تھے۔ دیوی کے سامنے بکاری!

ماہ پارہ نے بولنے میں پہلی کی۔ اس نے کہا:

’اس جھونپڑی میں بیٹھ کر تو کیا محسوس کر رہا ہے؟‘

’بہت سکون! شہزادہ بولا:

’ایسا سکون جو مجھے آج تک شامک ٹوکے محل میں بھی نہ ملا۔‘

شہزادے نے جھونپڑی میں ادھر ادھر دیکھا۔ بڑھیا ایک کونے میں کھڑی کاپ رہی تھی۔ اس میں یہ پیکاپٹ

نمایہ عمل کانام اس کی پیدا ہوئی تھی۔ اس نے ٹھیک ہی تو سوچا تھا۔ سب جانتے تھے کہ شامک تو محل میں بندائی خان کا

بڑا ناہن ہے۔

شہزادے نے بڑھیا سے کہا:

’بزرگی خاتون! آپ بھی بیٹھ جائیے۔‘

بڑھیا جلدی سے لکڑی کی چھوٹی سی پیٹی پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ پیر خون سے اب بھی کانپ رہے تھے۔
 "شہزادے تیمور! یکا یک ماہ پارہ بولی:
 "جب تو خاقان بن جائے تو فرود سوچنا کہ تیری رعایا ایسی ہی چھوٹی چھوٹی چھوٹی ہے جتنی لڑکیوں میں رہتی ہے اور تو ان کی دولت سے محالہ تعمیر کر سکتا ہے۔"
 بڑھیلے ماہ پارہ کو گھورا جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ شہزادے کی شان میں گستاخی نہ کر۔ ماہ پارہ نے بڑھیا کی تبلیہ آمیز نظروں دیکھ لیں مگر اس کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ شہزادہ یوں خاموش تھا جیسے اسے کوئی جواب نہ ہو رہا ہو۔
 "تو یہاں کیوں آیا ہے۔ مجھ سے بدلہ لینا ہے کیا؟" جیسے شاکر مینی نے اپنے ہلکے شوکو جھڑک دیا ہو یا دیوی نے بیماری کی پوجا بھڑادی ہو۔
 بڑھیا دور کر باہر گئی اور دم کے دم میں پتھر کے ایک چالے میں کچھ گول کر لے آئی۔ اس نے پیار شہزادے کی طرف بڑھا دیا۔ شہزادے نے پیالہ ہاتھ میں لیا۔ پھر منہ تک لے جا کر ہاتھ روک لیا۔
 "زہر نہیں ہے شہزادے، یہ شربت ہے۔" ماہ پارہ پہلی بار مسکرائی:
 "ہم جینی، ہمانوں کو زہر نہیں دیا کرتے۔"
 شہزادہ تیمور ایکسہی سانس میں پورا پیالہ حلق سے اتار گیا۔
 جب وہ شربت پی رہا تھا تو ماہ پارہ کی نظریں اس پر لگی تھیں۔ اسے شہزادے کے دائیں ہاتھ کی آستین کھائی کے پاس خون سے تر نظر آئی۔ تانہ تازہ خون آستین پر جمنا تھا۔
 ماہ پارہ کے گھوڑے نے بھاگتے بھاگتے ایک جگہ زبردست ٹھوکر کھائی تھی۔ ماہ پارہ توازن برقرار نہ رکھ سکی اور گر گئی۔ پھر سنبھلی اور گھوڑے پر سوار ہونے لگی لیکن شہزادے نے اس کے خرب پیچ کر اس کے بالوں کی ایک الجھی ہوئی ٹک کو پکڑ لیا اور پھر ماہ پارہ کا خنجر، شہزادے کی کھائی تک پہنچ گیا۔
 کھائی کا یہ زخم ماہ پارہ کے خنجر کا تھا۔
 اب تم جا سکتے ہو۔" ماہ پارہ نے شانہ انداز میں شہزادے کو حکم دیا لیکن بیماری تو دیوی کی پوجا کرنے میں مشغول تھا۔

شہزادہ، ماہ پارہ کی غلافی آنکھوں میں کھو یا ہو سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں ان جھیلوں کی گہرائی کتنی ہے۔ شہزادہ پر لہرائی ہوئی ماہ پارہ کی ان الجھی آنکھوں میں نہ جانے کتنے دل شکنے ہوئے۔ یہ سنگ مرمر سے تراشا ہوا بدن نہ جانے کتنی بھلیاں اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے اور جوانی کی چڑھتی ہوئی ان آتش فشاں چوٹیوں میں کتنا گرم لاوا

نول رہا ہو گا۔

وہ سوچ رہا تھا اور سوچتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ماہ پارہ کی زگرسی آنکھوں سے پھوٹے ہوئے ری دھاروں میں بہ جائے۔ سانپ جیسی لہرائی مٹیالی مٹوں کو وہ اپنی شہرگ کے گرد پیٹ لے۔ یہ سانپ اسے نہیں اور ماہ پارہ کے مرمری بدن کا سیمیں زہر اس کی رگ و پے میں گمزدش کرنے لگے۔ اسے ہوش کر دے۔

"جانے سے پہلے آنے کا مقصد بتانا ہو گا؟" شہزادے کے کان میں ماہ پارہ کی آواز گونجی۔

خیالات کا دھارا رک گیا۔

سوچ کے سوتے خشک پڑ گئے۔

ماہ پارہ نے شاید اس سے پہلے بھی کچھ کہا تھا لیکن وہ تو پوجا میں مصروف تھا اور پوجا کے دوران دنیا و مافیہ کے خبر ہوتی ہے۔

"میں تو اس لیے آیا تھا۔" شہزادے نے گلا صاف کیا:

"اس لیے کہ یہ دیکھوں تم خیریت سے گھر پہنچ گئیں۔"

ماہ پارہ مسکرائی اور بولی:

"بھولے شہزادے۔ دنیا کو اتنا بھولنا نہ سمجھو۔ کچھ اور کہنا ہو تو کہہ ڈالو۔"

شہزادے تیمور نے ایک لمحے میں کچھ سوچا۔ پھر بولا:

"کہنا تو بہت کچھ تھا لیکن شاید تم سننا نہ پسند کرو۔ اور وہ کہنا نہ چاہیے جو سننے والے کو نا پسند ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

ماہ پارہ سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے کہا:

"شہزادے۔ تم نے بڑی عقل کی بات کی۔ تم ایسی عقلندی کی باتیں کرتے رہے تو بڑے کامیاب خاقان

بات ہو گئے۔ جو بات دوسرے کو ناگوار ہو اسے زبان پر نہ لانا چاہیے اور وہ بات جو نا ممکن ہو اسے ذہن میں بھی جگہ نہ دینا چاہیے۔"

بڑھیا غریب خاموش بیٹھی ٹھوٹھو ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ یہ فلسفیانہ باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔

شہزادہ تیمور جانے کے لیے کھڑا ہوا۔

ماہ پارہ کے دل میں ہیجان سا پیدا ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ شہزادے کو تھوڑی دیر کے لیے اور روک لے

لیکن کیسے؟

یہ اس کی آغا اور خودداری کا سوال تھا۔ اس نے جی مار لیا اور دل کی آواز دہادی۔

شہزادہ دروازے کے پاس پہنچا تو ماہ پارہ کی آواز آئی:

”تھڑو شہزادے!“

شہزادے کے قدم رک گئے۔ ماہ پارہ بولی:

”یہ زخم میرے خنجر کا ہے نا۔“

شہزادے نے انتہات میں سر ہلادیا ماہ پارہ اس کے پاس گئی۔ اس کا ہاتھ پکڑا اور لاکر پھر چٹائی پر بٹھا دیا۔ ماہ پارہ کے ہاتھ کے لمس سے شہزادے پر ایک بلر پھر مدہوشی سی ماری ہو گئی۔

”مال۔ کوئی ریشمی کپڑا لے آ۔“ ماہ پارہ نے مان سے کہا اور شہزادے کی آستین الٹ کر دیکھنے لگی۔ زخم گہرا تھا۔ ماہ پارہ نے بھرپور وار کیا تھا۔

”اگر یہ وار شہزادے کے دل پر پڑا ہوتا تو.... ماہ پارہ گہرا گئی۔ شہزادے کی آستین اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

بڑھیا ایک دھلا ہوا ریشمی رومال لے آئی۔ گنگنا سا رومال۔ کبھی اچھے دنوں کی نشانی۔ ماہ پارہ نے چہراغ کی لڑ میں رومال جلا کر اس کی خاک بنائی اور شہزادے کے زخم میں بھر کر پیٹا باندھ دی۔ شہزادہ بت بنا اس کے سامنے بیٹھا رہا۔

جب شہزادہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر روانہ ہوا تو ماہ پارہ کلال زور زور سے دھڑک رہی تھی۔ وہ مان کا سہارا لیے لڑکھڑاتی جھونپڑی میں واپس آ گئی۔ دل کی دھڑکن بند ہوئی تو دل چھٹنے لگا۔

وہ چٹائی پر لیٹ گئی۔ بڑھیلے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ بڑھیا سادہ لوح ضرور تھی مگر تھی جہانگیرہ۔ اس نے ان دونوں کی گفتگو سے ان کی دلی کیفیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور کر لیا تھا۔ بڑھیلے ماہ پارہ کو بچوں کی طرح تعجب کیا دینا شروع کیا اور اسے سُلانے کے لیے کہانی سناتے لگی۔



”جب تو جین چنگیز خان کا بیٹا اور غنائی تھا کثرت سے نوشی سے مر گیا تو اس کی بیوہ تو راگینہ نے خود خاقان بننے کی کوشش کی لیکن جو سر سے مقل شہزادوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور تولائی خان کے بیٹے

و خان کو خاقان بنا دیا۔

اور غنائی خان کے خاندانوں نے بظاہر تو منگو خان کو خاقان تسلیم کر لیا مگر عین جیش کے دن منگو خان کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ یہ سازش انتہائی کپڑی تھی اور اور غنائی خان کو اسے گرفتار کر لے گئے۔ اور غنائی کی بہر اور غنائی جو اس سازش میں پیش پیش تھی، برہنہ کر کے مارا گیا۔ پھر سمور میں لپیٹ کر اس کی ہڈی پسلی توڑ کر پانی میں بہا لیا۔

خاقان منگو خان کے جاسوسوں نے خاندان اور غنائی کے ایک ایک عزیز اور سردار کو ڈھونڈ کر قتل کر دیا۔ ان دڑھیا عیسائی دُزر اور بغور چمکانا مارا گیا اور اس کے شہ زور دہست بوری کو بوری میں بند کر کے ختم کیا گیا۔ غرض کہ ادھر قتل آکس شہزادوں کوئی بھی منگو خان کے غصے سے محفوظ نہ رہا۔ اگر خاقان منگو خان کو کسی شہزادے پر ہاتھ کی جرات نہ ہوئی تو وہ قائد خان تھا اور غنائی کا بیٹا۔ خاتج تنگوری۔ کسی کو اس پر الزام لگانے کی ہمت نہ ہوئی پھر منگو خان نے اسے مغلوں کے وطن سے دور دیر یا تے ایل کے کنارے کا علاقہ دے کر جلاوطن کر دیا۔ یہ نوجوان غیر کوئی احتجاج کیے جلا وطن ہو گیا۔ صحرا میں دشت میں۔ اسی دشت میں جس نے اسے پہل کر خاقان دشت بنا دیا۔

منگو خان مرا تو قبلائی خان نے قراقرم پر قبضہ کر لیا۔ وہی قبلائی خان جو آج چین کا شہنشاہ ہے۔ قائد خان کا سینہ انتقام سے جلتا رہا۔ اس نے قراقرم کے خان کا جوا اپنے سر سے اتار چھینا اور خاقان دشت کا لقب اختیار کر کے خاقان کے مقابلے پر آیا۔

قائد و خان کی ایک بیٹی تھی آئی یاروق، جس کے معنی ہیں ماہ تاباں۔ یہ لڑکی بڑی خوبصورت تھی اور داڑھی گھٹت شیار۔ میدان جنگ میں وہ ہمیشہ اپنے باپ کے ہم کاب ہوتی۔ کبھی کبھی وہ اپنے باپ سے ہٹ کر دشمن پر اس طرح حملے جیسے عقاب تنکار پر چھپتا ہے۔ وہ ہمیشہ نوجوانوں کے مردانہ لباس میں رستی۔ آئی یاروق کو باپ سے اتنی فک کہ اس نے شادی سے انکار کر دیا۔ غل جو انوں نے حل کر باپ بیٹی کے ناجائز تعلقات کی افواہ اڑا دی۔ روق نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور پوری جوانی دشت کی لڑائیوں میں گھوڑے کی پیٹھ پر گزار دی یہاں تک کہ وہ سال کی عمر کو پہنچ گئی۔ پھر چلنے کیوں قائد و خان کو شہر کو غیرت آگئی کہ اس نے اپنی یاروق کی شادی زبردستی ایک چینی ملازم سے کر دی۔

آئی یاروق چینی رہی چٹائی رہی۔ اپنی خدمات اور وفاداریوں کا واسطہ دیتی رہی مگر قائد و خان نے جیسے کان بند کر کے کہ اب وہ خاقان دشت تھا۔ مشرق و مغرب جگہ درمیان ایک وسیع حکومت اس کے تئیں تھی۔

آئی یاروق کا دل ٹوٹ گیا۔ اسے قائد و سے نفرت ہو گئی۔ اسے مغلوں سے بھی نفرت ہو گئی۔ وہ نہایت خاموشی سے

صبر و شکر کرتی اپنے جینی شوہر کے ساتھ قائد و خان کے علاقے سے تلافی خان کے چہن میں آگئی۔
اب وہ جینی تھی۔

آئی یاروق نے خود کو جینی معاشرت اور زبان و لباس میں ڈھال لیا۔ اس نے اپنے شوہر سے پوری مفاداری برتی۔ کیونکہ اس کا نیا وطن جینی تھا۔ اسے جین سے محبت تھی اور وہ جین کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن انھوں نے اس کا ارمان دل ہی میں رہ گیا۔ اس کے ایک بچی پیدا ہوئی۔ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی آئی یاروق بستر سے لگ گئی۔ یوں تو وہ آٹھ سال زندہ رہی مگر بستر نے اسے نہ چھوڑا۔

اس کی آرزو تھی کہ اس کی بیٹی جینی ہے اور جینی ہی رہے۔ اس نے شوہر کو منع کر دیا کہ بچی کو اپنی خاندانی حقیقت نہ معلوم ہو سکے مگر اس کا شوہر تو اس سے پسے ہی چل بسا۔ پھر آئی یاروق بھی آٹھ سالہ بچی کو چھوڑ کر تمام ارمان دل میں لیے اس دنیا سے اٹھ گئی لیکن....

ماہ پارہ جینج ماراٹھ بیٹھی اور روتے ہوئے ملی:

”ماں۔ کیوں نہیں کہتی کہ اس بد نصیب آئی یاروق کا بد نصیب بیٹی ماہ پارہ ہے۔ آئی یاروق کی بیٹی
آئی ماروق“

پھر ماہ پارہ بڑھیا کے گلے سے لپٹ کر اتار دئی کہ اس کی بچکیاں بندھ گئیں۔ بڑھیا خود بھی اس کے ساتھ رونی رہی۔ اس کا جی کچھ ٹھنڈا ہوا تو ملی:

”بیٹی ماہ پارہ۔ میں نے تجھے اپنی بیٹی کی طرح پالا اور تیری ماں کی نصیحت کے مطابق تجھے اپنی اصلیت کی خبر نہ ہونے دی۔ آج بھی یہ کہانی نہ داستان تجھے نہ سنا لیکن تیرے اور شہزادے کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ اب میں تیری ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر یہ ذمہ داری خود تیرے سپرد کر دوں۔ تو جوان ہے اور سمجھ دار خود اپنے اچھے برے میں تمیز کر سکتی ہے۔ تجھے شک کہ منی نے اتنی شکست دی ہے کہ اپنی حفاظت بھی کر سکتی ہے آج سے میری ذمہ داری ختم ہوئی۔ اب چلے تو جینی بودھ لڑکی بن کے رہ یا عقل لڑکیوں کی طرح اپنی زندگی گزار۔ میں تیرے کسی معاملے میں غلغلہ نہ دوں گی۔ تو یہاں رہنا چاہے تو رہ جا۔ اور اگر کہیں دوسری جگہ جانا چاہتی ہے تو بھی جاسکتی ہے۔ یہ جو نیڑی باشہزادے کا محل، تو کہیں بھی رہ سکتی ہے۔ میں نے تمام پابندیاں اٹھائی ہیں۔“

ماہ پارہ کا روتا تھا کہ بند ہی نہ ہوتا تھا۔ اسے خود بھی اپنی اصلیت کے بارے میں شبہ تھا۔ چہن میں اس کی ماں بستر پر پڑے پڑے سینے سے جینی زبان کے ساتھ ساتھ عقل زبان بھی سکھاتی تھی۔ آئی یاروق اسے لڑکوں کے کپڑے پہنائی اور ان پر ویدیں ماروق (ماہ پارہ) کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ شہزادہ تیمور کو بھی اس کے نقش و اطوار پر شبہ تھا۔ اسی لیے وہ ماہ پارہ کو جینی لڑکی ماننے پر تیار نہ تھا۔ دراصل آئی یاروق (ماہ تاباں) کا دوسرا روپ آئی یاروق

(ماہ پارہ) تھا جو اپنی حسن و جوانی کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا تھا۔

ماہ پارہ نے صاف صاف اعلان کیا:

”ماں میں نہیں جاؤں گے تو نے مجھے پالا ہے۔ تو جی میری ماں ہے۔ میں اپنی ماں کے کہنے پر عمل کروں گی میرا باپ جینی تھا۔ میں بھی جینی ہوں۔ میری ماں کی بھی یہی خواہش تھی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ میں شاکہ منی کی قسم....“
بڑھیا نے جلدی سے ماہ پارہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے کہا:

”بیٹی۔ شاکہ منی کی قسم نہ کھا۔ دل کے معاملے بڑے ٹیڑھے ہوتے ہیں۔ محبت تو انسانی دلوں کو خدا سے بھی پھیر دیتی ہے۔ مستقبل کا کسی کو پتہ نہیں۔ ہاں تجھے شہزادے سے پوری طرح محتاط رہنا چاہیے۔“



پھر رات باقی تھی کہ شہزادہ ماہ پارہ سے رخصت ہوا تھا۔

اس کا عجیب حال تھا۔ اسے پتہ نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے صرف ایک خیال اسے بار بار پریشان کرتا۔ کیونکہ اس نے دل لکھال ماہ پارہ سے بیان کر دیا۔ کیا عجیب کہ اس کے دل میں بھی محبت پیدا ہو گئی ہو۔ مگر اسے خود ہی اس خیال کی تردید کرنا پڑتی۔ جو بات دوسروں کو ناگوار ہو اسے زبان سے نہ نکالنا چاہیے۔ شاید یہی اس کی جھگی جھگورنے کا تھا۔

رات گزری۔ سویرا ہوا۔ پھر دن چڑھ آیا مگر اس کے محافظ بہت اسے نظر نہ آئے تھے۔ اس نے محض اٹکل سے راستہ طے کیا تھا۔ آخر کسی نہ کسی طرح وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں اس نے اپنے ساتھیوں کو چھوڑا تھا۔ وہاں اس کا کوئی محافظ تو موجود نہ تھا لیکن گرفتار لڑکیاں اور ان کو کپڑے کر لانے والے بھوکے پیاسے اور پریشان اس کا انتظار کر رہے تھے۔

شہزادے کو دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ انھوں نے خوشی کے نعرے لگائے۔ شہزادے کو بتایا کہ اس کے محافظ سوار اسے جگہ جگہ ہر جگہ ڈھونڈنے پھر رہے ہیں۔ وہ سخت پریشان ہیں کہ اگر شہزادہ نہ ملتا تو وہ محل باہر شہزادی لالہ رخ کو کیا جواب دیں گے۔

دوپہر ہوئی تو اس کے ساتھی ایک ایک کر کے واپس آنے لگے۔ جو واپس آتے وہ شہزادے کو دیکھ کر پہلے حیران ہوتا پھر خوشی سے نلچے لگتا۔ ان کی خوشی بجا تھی۔ انھیں شہزادہ واپس مل گیا تھا۔

شہزادے کے حکم پر قیدی لڑکیوں اور سواروں کے کھانے کا انتظام کیا گیا۔ شہزادے نے سب کو ٹائی تو رخان بائی

شہزادے نے ان کے سردار کو تاکید کر دی کہ اس واقعہ کا ذکر خاقان قبلائی خان سے نہ کیا جائے۔ اس نے اپنے محافظوں کو بھی یہی تاکید کی۔ شام کے وقت شہزادہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شامگ ٹوکی طرف واپس ہوا۔ شامگ ٹو کے جنگل میں بانسوں والے محل میں کھرام پڑا ہوا تھا۔ لالہ رخ منہ چھڑ سر بچاؤ، ننگے پیر اور ہوا میں بھاگتی پھر رہی تھی۔ اس وقت تک اس کے منہ میں اڑکھیں تک نہ لگی تھیں۔ کہاں کا کھانا کیسا پینا۔ آنکھوں سے اشکوں کی جھری مٹی تھی۔ ایک ایک کامنہ دکھتی اور شہزادے کو پوچھتی۔ محل میں کوئی سوار آتا تو امید کا خیال لیے خود بھاگ کر اس کے پاس جاتی مگر سوار شرمندگی سے سر جھکا لیتا۔

رات دھلتی جاتی تھی اور اس کبے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ اس محل کو الگ لگا دے اور بانسوں کا یہ خوبصورت محل جل کر خاکستر ہو جائے۔ اس محل کو بانسوں سے جوڑ کر اس پر رنگ کیا گیا تھا اور بانسوں کو باندھنے کے لیے رہتی دھلا گے استعمال ہوئے تھے۔ ٹائی ٹیس محل بننے سے پہلے قبلائی خان کو یہ عمل بہت عزیز تھا لیکن اس وقت لالہ رخ کو بھاڑے کھا رہا تھا۔ وہ محل میں گھبراتا تو بے خواب آنکھیں لیے جھین پر جا بیٹھی۔

یہ جھین لالہ رخ کو بہت پسند تھی۔ اس کے کنارے ایک مری میں چوتھہ تھا اور مری پر تشکاریوں پر بندوں اور جانوروں کی زری تصویریں منقش تھیں۔ سامنے کینویشنس کا ایک مندر تھا لیکن لالہ رخ کبے چینی کوئی ہیر دور نہ کہہ سکتا بلکہ اس میں اور اضافہ ہو گیا۔

یہاں سے اٹھ کر لالہ رخ اس عجیب و غریب محل میں داخل ہو گئی جو مرحوم مغلوں کا محل کہلاتا تھا۔ چینی اسے ٹائی میاؤ کے نام سے پکارتے تھے۔ اس میں مرنے والے مغلوں کی تختیاں نصب تھیں۔ بے سہکائی، چنگیز، خان، اڈغائی، ناجار، اولاد جوجی، چغتائی، تولوئی، قوبوق اور منگو خان۔ اس میں اس کے شوہر چنگ کم کی تختی نہ تھی۔ اس کا دل چاہا کہ تمام تختیوں کو ٹھوکر میں مار کر توڑ ڈالے۔ اس نے رات آنکھوں میں گزار دی۔

صبح، دوپہر، شام اسی بے چینی میں گئی۔ مگر دوسری رات پیغامِ موت لائی۔ شہزادہ تیمور مددِ محافظ دستانے کے بخیریت واپس آ گیا۔

لالہ رخ نے ساتویں تک بھاگ کر استقبال کو آئی۔ شہزادے کو سینے سے لگایا اور فرطِ محبت سے اس کے رخسار چومنے لگی۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ خوشی کے آنسو چھلک اُٹے۔ شہزادہ ہی تو اس کی زندگی کا سہارا تھا۔ چنگ کم کی اس نشانی کو سینے سے لگائے اس نے پہاڑ جیسی جوانی کا ڈی۔ اب تو اس کے سر کے مڑے بال چاندی کے ستاروں

بدل گئے تھے۔

محل میں سپیچ کر لو پھوگچ اور پھر ڈانٹ پھٹکار شروع ہوئی۔ شہزادے نے دم نہ ملا۔ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا۔ وہ تمام شرارتوں اور بے حاشی کتوں کے باوجود لالہ رخ کے منے آنکھ نہ اٹھاتا تھا۔ لالہ رخ نے ہاتھ کے ذمہ کے بارے میں پوچھا تو بڑی صفائی سے جھوٹ بول گیا۔ اصل بات کیسے بتانا اور کیا یہ اور میں ہمت نہ تھی کہ زبان کھولنا۔ مستقبل کے خاقان سے سب ہی ڈرتے تھے۔ پھر شہزادے نے تو خاص طور پر اپنے محافظوں کو اس راز کو راز رکھنے کی تاکید کی تھی۔



قبلائی خان کے وزیر بریایات احمد کے قتل کے بعد مسلمانوں کا تو زور ٹوٹ گیا تھا۔ مسلمانوں کے قتل عام نے ان تعداد میں بھی کم کر دی تھی۔ جو پنج رہے تھے وہ ہجرت کر کے بت کی وادیوں اور جنوب میں فارس کی سرحد پر سانی علاقے میں جا بسے تھے۔ چینیوں کا ایک کانٹا تو نکل گیا تھا مگر مسلمانوں کے بعد تبتیوں نے زور پکڑا۔ شاید وہ عقل و فراست میں چینیوں سے تھے۔ بوڑھا رانا وینا بدر لاما فاس مریچکا تھا۔ پھر بھی تبتیوں کا سرکارِ دربار میں بڑا زور تھا۔ چینیوں کو یہ بت والے آنکھ نہ بھالتے۔ دونوں گروہوں میں ڈانڈا بندھی تھی۔ خوب خوب چینی، وہ ایک دوسرے کو پینچا دکھانے کی کوشش بنے مگر کوئی نہ مانا۔

احمد کے بعد وزیر بریایات اور وزارتِ عظمیٰ کا عمدہ سانکا کو ملا تھا۔ سانکا کو بت کے لالہاؤں سے سخت نفرت تھی۔ لالہاؤں سے خائف بھی تھا۔ قبلائی خان نے لالہاؤں کو بڑا منہ چڑھا رکھا تھا مگر اب قبلائی خان کا دور ختم ہو رہا تھا۔ سانکا جانتا کہ خاقان کچھ ہی دن کا ممان ہے۔ اس کے بعد تیموری خاقان بنے گا۔

قبلائی خان اپنے ٹائی ٹو کے محل کی ایک بارہ دری میں پڑا ایڑیاں دگر رہا تھا۔ خانہ دانی مرض گھٹیلنے اسے چلنے سے معذور کر دیا تھا۔ اس کا جسم گھوڑی کا دودھ پیتے پیتے اندر سے کھوکھلا ہو گیا تھا۔ سانکا گاون میں ایک بار سچی پراسے سلام کہنے جاتا۔ اس کا دل دو مانع تو شامگ ٹو کے جنگل میں ہونے والے خاقان تیمور میں لگا تھا۔ وہ زادے تیمور کو ابھی سے اپنی گرفت میں لینے کی فکر میں تھا۔ آخر سانکا کو ایک نئی ترکیب سوچی۔

اس کی بھانجی سانی سانی حسن و جمال میں اپنا ٹائی نہ رکھتی تھی۔ عقل بھی اس نے کہاں کی پائی تھی۔ چین بھر میں

اس جیسی خوبصورت اور فرزانہ لڑکی کوئی دوسری نہ تھی۔ سانگے اسے آکر لانا یا۔

سانگے سانی سانی کو سمجھایا کہ اگر وہ اپنی عقل و فراست سے شہزادے کا دل جیت لے تو وہ خاقان کی ملکہ بن سکتی ہے۔ سانی سانی کو اپنے حسن پر ناز اور عقل پر اعتماد تھا۔ اس نے ہامی بھری اور سانگے کی بساط سیاست کا مہرہ بننے پر تیار ہو گئی۔

سانگے کو شاہک تو میں اگر کسی سے خطرہ تھا تو شہزادے کی منہ بولی ماں لالہ رخ سے تھا۔ لالہ رخ بظاہر بے نیوں اور جبینوں کے جھگڑے میں غیر جانبدار تھی لیکن سانگے اسے بالکل پسند نہ تھا۔ پھر جب اسے معلوم ہوا کہ سانگے اپنی بھانجی سانی سانی کو شاہک کے عمل میں بیچ رہا ہے تو بڑی چراغ با ہوئی۔

سانگے پہلے ہی سانی سانی اور شہزادے کا سامنا کر اچکا تھا اور شہزادے نے اس میں اپنی دلچسپی کا اشارتاً اظہار بھی کیا تھا۔

پھر ایک دن جب شہزادے تیور نے خود اپنی زبان سے سانی سانی کو محل میں رکھنے کی اجازت مانگی تو لالہ رخ چھوڑ ہو گئی۔

لالہ رخ کو معلوم تھا کہ سانی سانی، سانگے کی بھانجی ہے اور اس کا شاہک تو میں بہن کسی خاص سبب سے خالی نہیں اور اس کے ساتھ سانگے کی چال کا ایک حل بھی نکال دیا۔

لالہ رخ نے فوراً شاہک کو سانگے کی چاب بازی سے آگاہ کیا اور بہت کی حسین ترین لڑکی کو شاہک تو بھیجنے کی درخواست کی۔ شاہک بہت کیا، موٹے مسلمانوں کے ایشیا اور یورپ کے تمام بادشاہ اور امیر اپنی بیٹیوں کو مغلوں کی حرم سرا میں بھیجنے کے لیے ہر دم تیار رہا کرتے تھے۔

بہت سے ایک لڑکی آگئی، ماندلی۔ وہ بہت کم سن کا بچہ تھی۔

سانی سانی بیلا، تو ماندلی جینیلی!

دونوں کی ٹوٹی اور کھیتی جوانی۔ آنکھیں دونوں کی گول اور قدر میاں تھیں۔ سانی سانی کے رنگ میں سرخی کے ساتھ زردی کی ایسی آمیزش تھی کہ اس کی رنگت چمکی ہوئی تھی۔ چاندنی دکھائی پڑتی تھی۔ ماندلی کی لال رنگت میں ملاحظہ نے شامل ہو کر قوس و قزحی رنگ پیدا کر دیا تھا۔ رفتی سانی میدان کی پروردہ، وہ نرم و نازک مورتی جیسے قدم اٹھاتی۔ ماندلی برف پوش چٹانوں کی تراشیدہ۔ وہ برہنہ کی طرح قلعہ بنی بھرتی۔ غرض ایک شعلہ و دوسری شبنم تھی۔

ماندلی نے محل میں آ کر اپنی شوخ و چھی اداؤں سے شہزادے کو بہت کچھ اپنی طرف راغب کر لیا تھا۔ شہزادے نے ماندلی سے اس لیے بھی دلچسپی لینا شروع کی کہ وہ ایک ماہرہ نامی لالہ رخ کی طرح۔

مغل چھوٹے ہوں یا بڑے۔ عورت تو ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ پھر اگر کسی میں خوبصورتی کے ساتھ قص کی خوبی موجود ہو تو کیا کہنا، سونے پر ساگہ۔ ماندلی، شہزادے کا دل ہلانے یا دل پر قبضہ کرنے کے لیے، دن میں دو ایک بار شہزادے کے سامنے رقص ضرور کرتی۔

شہزادے کو اس کی یہ ادا بہت پسند تھی۔ حسن و قص کی بدولت ماندلی نے شہزادے کے دل میں کچھ کڑوٹوں پر قبضہ کر لیا تھا لیکن ابھی بہت سے گوشے خالی تھے۔ عیاشی مغلوں کے دل، دل کے معاملے بڑے وسیع ہوتے تھے۔ ان میں ایک دو نہیں، مود و موصیائیں ایک وقت چھپ سکتی تھیں۔

ماندلی کا رقص ختم ہوتا تو سانی سانی آدھکتی سہ بھی شہزادے سے قربت کے بدلے ڈھونڈتی تھی۔ وہ رقص سے تو واقف نہ تھی لیکن اس کی آواز میں بلا کا رس اور لوچ تھا۔ پسینے کو گیت وہ اس طرح گاتی کہ سننے والا مست ہو جاتا رقص کے بعد سانی سانی کی موسیقی شروع ہو جاتی۔

سانی سانی، شہزادے کے سامنے غودار ہو کر گیت شروع کرتی اور پھر گیت کی تانوں کے ساتھ اس کے قدم شہزادے کی طرف بڑھنے لگتے۔ یہاں تک کہ جب گیت ختم ہوتا تو وہ شہزادے کے اتنے قریب پہنچ چکی ہوتی کہ شہزادے کی تشنگی کو اچھا کر رکھت ہو جاتا کرتی تھی۔

ماندلی کو لالہ رخ نے ہی سمجھا یا تھا۔ "شعلے بھڑکیں تو دامن بچانا!"

ماندلی اب تک شعلوں کی لپیٹ میں نہ آئی تھی۔ حالانکہ سانی سانی سیلاب جوانی میں کئی بار غوطے کھا چکی تھی۔ یہی اس کے گروہ، سانگے کا حکم تھا۔ "سیلاب میں خود ڈوبو اور دوسرے کو ڈبو دو!"



لالہ رخ نے شہزادہ تیور کو خاموش خاموش دیکھا تو اسے نگر ہوئی۔ ایک دو دن تک دماغ خیال میں رہی کہ شہزادہ شکاری سفر کی تکان سے معطل ہے۔ شہزادہ اپنے طہر پر بھی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے دل کا حال کسی پر ظاہر نہ ہو۔ اس نے اپنا زخم محل میں کسی کو نہ دکھایا بلکہ کسی نہ کسی بدلنے خود طیب کے پاس چلا جاتا اور وہاں مریم لگا کر پٹی بندھوا تا کہ شہزادے کی اداسی، ماس کی احتیاط کے باوجود لالہ رخ سے چھپی نہ رہ سکے۔ لالہ رخ کی کچھ میں شہزادے کی اداسی نہ آتی تھی۔ اسے آخر کیا غم ہو سکتا تھا۔ دنیا جان کے عیش و عشرت اور تفریح کے سامان تو اس محل میں اکٹھے کر دیے گئے تھے۔ شہزادے کو اب کس چیز کی خواہش تھی۔ وہ کیوں پریشان ہے۔ لالہ رخ خود سے الجھتی رہتی پر جواب نہ پاتی۔ لالہ رخ نے ایک دو بار اشارتاً شہزادے سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن شہزادہ

مسکرا کر مثال گیا۔

شہزادہ، مانڈی اور سائی سائی دونوں میں اپنی دلچسپی کا اظہار کرتا۔ وہ دونوں سے ہنستا، ہنستا اور کہتا۔ مانڈی اور سائی سائی دونوں ہی شہزادے کو اپنا بھتیجی تھیں لیکن دل کا حال کسی کو معلوم نہ تھا۔

ایک رات شہزادہ کچھ زیادہ پریشان نظر آیا تو لالہ رخ نے مانڈی کو اس کے پاس بھیجا۔ لالہ رخ، رات کے وقت مانڈی کو شہزادے کے کمرے میں نہیں بھیجتی تھی لیکن اس نے خود ہی مانڈی کو شہزادے کے پاس جانے کا حکم دیا۔

مانڈی نے پہلے تو تعجب سے لالہ رخ کو دیکھا۔ پھر مسکراتی ہوئی تعین حکم کو چلی۔ یہ تو اس کے دل کی آرزو تھی کہ شہزادہ اسے تنہا کرے۔

مانڈی، کیف و مستی کے عالم میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی شہزادے کے کمرے کی طرف چلی۔ اس کا دل آج نہ جانے کیوں دھڑک رہا تھا۔ اس کے قدم کچھ ٹھیک نہ پڑ رہے تھے۔ کبھی اس کے قدم تیزی سے اٹھتے اور کبھی ان میں سستی پیدا ہو جاتی جیسے اس کا جسم ٹوٹ رہا ہو یا وہ بہت تھک گئی ہو۔

کیسے کیسے ارمان لیے وہ شہزادے کے پاس جا رہی تھی۔ اس کا دل بول رہا تھا۔ باتیں کر رہا تھا لیکن دل کی باتیں دل ہی میں رہ گئیں۔ اس کے ارمان یوں منتشر ہو گئے جیسے تیز ہوا بادلوں کو اڑا دیتی ہے۔ اس کی تھناؤں پر اس پر اداس پڑ گئی۔ وہ صد در وقت کی آگ میں جل اٹھی۔ سائی سائی تیز قدم اٹھاتی مانڈی کے آگے آگے شہزادے کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ مانڈی، بانس کے ایک ستون کی آڑ میں ہو گئی۔

پھر ضرور سے بادل گر جا اور کونڈا پکلا۔ بجلی کی چمک سے بانسوں کے محل کی دیواروں پر چڑھے ہوئے سونے چاندی کے پتر چمک اٹھے۔

شہزادے کے کمرے پر کنیزوں کا پرہ تھا لیکن سائی سائی کو کون روک سکتا تھا۔ وہ تو شہزادے کا کھلونا تھی۔ اس جیسے کتنے ہی کھلونے شہزادہ توڑ پھوڑ چکا تھا۔ شاید کنیزیں اس کھلونے کے ٹوٹنے کا انتظار کر رہی تھیں کہ کب کھلونا ٹوٹے اور کب وہ اس کے ٹکڑے اور کرب جس اٹھا کر محل کے باہر پھینکیں۔

سائی سائی تیزی سے کمرے میں داخل ہو گئی۔ کسی کنیز نے اسے روکنے کی کوشش نہ کی۔ وہ تو ایسی کٹھ راتوں کی عینی شاہد تھیں۔ جب سائی سائی اندر چلی گئی تو کنیزوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا کر رہ گئیں۔

بول گرجتے رہے۔ برستے رہے۔

بجلی چمکتی رہی۔ کونڈی رہی۔

اس رات طوفان سا آہٹا۔ شاگستہ کا تمام جنگل اور جنگل میں استلاب یہ بانسوں کا محل جھیل بن گیا۔ جل جل ہو گیا۔ اگر طوفان کاظم ہوتا تو اس محل کو اکھاڑ کر کسی بلند جگہ پر نصب کر دیا جاتا۔ تاکہ اس میں پانی داخل نہ ہو سکے۔ یہ مرموق تھا۔ اسے جہاں چاہتے تھے جا سکتے تھے۔ پھر بھی محل کو اس طوفان سے کوئی نقصان نہ پہنچا۔ اس کے کمرے میں سے کافی بلندی پر بندے لگے تھے۔ طوفان کا ان پر کیا اثر ہوتا رہا۔ اندر جو طوفان اٹھ رہا تھا۔ جل جل ہو رہا تھا۔ بادل گرج رہے تھے اور بجلی چمک رہی تھی اس طوفان سے پتہ نہیں کہ نقصان پہنچا۔ کون نفع میں رہا اور کون نقصان میں۔ !

ادھر مانڈی بنار میں پہنچ رہی تھی۔

رقابت کے بنار میں اس کی ہڈیاں جل جلی جا رہی تھیں۔ بچھلی جا رہی تھیں۔ لالہ رخ اس کے سر پر پانی کی ٹپیاں رکھ رہی تھی۔

مانڈی دن بھر بخار میں جلتی رہی۔ شاگستہ کا اس کا بنار اترا اور اس نے آنکھیں کھولیں۔ لالہ رخ کے چہرے پر رونق آگئی۔ اسے مانڈی کے دل کا حال معلوم تھا۔

احساس شکست نے مانڈی کو نڈھال کر دیا تھا۔ وہ خود کو سائی سائی کے مقابلے پر کمزور محسوس کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر لالہ رخ نے اسے پہلے اجازت دی ہوتی تو وہ سائی سائی کو شکست دے سکتی تھی لیکن اب اب تو سائی سائی، شہزادے کے دماغ پر سوار تھی۔ اعصاب پر قابض تھی۔

پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے شہزادے کے کمرے کے اندر سے سائی سائی کے لقرنی قہقروں کی آواز آرہی ہے اور جیسے شہزادہ سائی سائی پر بے حد مہربان ہے۔

مانڈی کو غصہ آنے لگا۔ اس کا جسم پھر سے جلنے لگا۔ بنار پھر تیز ہو گیا۔ لالہ رخ رات بھر ٹپیاں بدلتی رہی اور مانڈی ہڈیاں کے عالم میں نہ جانے کیا کیا کرتی رہی۔



شہزادے کا زخم بھر گیا تھا۔ پٹیاں اتر گئیں تھیں۔ اس کے دلی راز کے کھلنے کی ایک نشانی ظہور ہوئی تھی۔ لیکن اس کے دل میں جو زخم پڑ گیا تھا اس کا علاج وہ کس سے کرانا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اسے ظاہری اور باطنی زخم دینے والی کون ہے۔ اس کا ناکا کیا ہے اور وہ کس ذات برادری سے تعلق رکھتی ہے۔

شہزادے کی افسردگی دور نہ ہوئی۔ سائی سائی کے ساتھ گزرنے والی مسلسل کئی راتیں اس کے دل کے

زخم کا مہم نہ بن سکیں۔

لالہ رخ کو اس کاشت سے احساس ہوا اور اب اس نے بڑی سنجیدگی سے شہزادے کی پریشانی پر غور شروع کیا۔ پھر نہ جانے کیوں اسے خیال آیا کہ کہیں شہزادہ مانڈی کے عشق میں تو گرفتار نہیں ہو گیا اور لالہ رخ کے لحاظ کی وجہ سے وہ مانڈی کو اپنی خواب گاہ میں بلانے سے ڈرتا ہے۔ لالہ رخ نے واقعی مانڈی کو شہزادے کی خواب گاہ میں رات نہ جانے سے منع کیا تھا اس بات کا شہزادے کو بھی علم تھا اس لیے شاید شہزادے نے اب تک مانڈی کو رات کے وقت کبھی اپنے پاس نہیں بلایا تھا۔۔۔۔۔ اس رات پہلا موقع تھا کہ لالہ رخ نے اپنے ہاتھوں سے بنا سنوار کر شہزادے کے پاس اسے بھیجا تھا۔

کئی دن بعد جب مانڈی کا بخارا تڑا تو لالہ رخ نے بڑے چاؤ سے اس کا بناؤ سنگھار کیا اور سرخ جوڑا اسے پہنایا۔ سرخ کپڑے لالہ رخ کو بہت پسند تھے۔ اس کا آنجنابی شوہر چنگ کم بھی لالہ کپڑے بہت پسند کرتا تھا جب وہ لالہ کپڑے پہن کر چنگ کم کے سامنے آئی تو وہ ہنس کر کہتا:

"لالہ رخ! تو ان کپڑوں میں لالہ پری دکھائی دیتی ہے۔"

اور لالہ رخ شہزادہ جانی کی یاد آئی تو اس کی آنکھیں بھی لال ہو گئیں اور دو قطرے آنسوؤں کے ٹپک پڑے۔

"کیا ہوا ملکہ ماں۔ آپ رو رہی ہیں۔" مانڈی نے محسوسیت سے پوچھا۔

لالہ رخ نے بات ٹٹلنے کی کوشش کی۔ بولی:

"کچھ نہیں مانڈی۔ بس تیری بیماری سے ذرا پریشان ہو گئی تھی۔"

مانڈی سمجھ گئی کہ لالہ رخ بھانہ بنا رہی ہے۔ وہ سر ہونٹھی۔ جلدی سے لالہ رخ کی طرف پلٹی اور اس کے گلے

میں جھول گئی۔

"یہ پٹی تو بندھوا لے مانڈی! لالہ رخ نے پوری مادرانہ محبت سے کہا۔

لالہ رخ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ پہلے اپنی منشا شہزادے پر بچھاؤ کرتی رہی۔ اب جب سے مانڈی آئی تھی اس

کا عتا کا دھارا اس کی طرف گھوم گیا تھا۔

لالہ رخ کو اگر شہزادے کی آنکھوں میں چنگ کم چمکا دکھائی دیتا تو مانڈی کی جوانی اور رُپ میں وہ اپنا جواں عکس منعکس دیکھتی رہی۔ وہی سٹول جسم، دکھتا چہرہ، آنکھوں کے گلاب بھرے کُڑے، وہی جال ڈھال۔ مانڈی جب بائیں پیر کو جھاکر اور دائیں پیر کے پتے پر زور دے کر ایڑی اوپر اٹھاتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے مور نے پُر کھول دیے ہوں۔ اور جب وہ موسیقی کی مدھن تان پر بھاڑ بتاتی تو مانڈی کے سینے میں سے سرگرم سا چوٹ پڑتا۔

یہ سب خوبیاں لالہ رخ میں تھیں اور یہ تمام کی تمام مانڈی میں منتقل ہو گئی تھیں جیسے مانڈی اس کی ہی بیٹی ہو۔

مانڈی اسے کچھ سمجھتی ہو یا نہ سمجھتی مہنگمہ لالہ رخ تڑاب اس کو اپنی بیٹی سمجھ کر سینے سے لگاتی تھی شہزادہ ایک آنکھ تو مانڈی اس کی دوسری آنکھ تھی۔

تو شہزادہ بھی بندھوا لے۔ کوئی اگلیا تو کہے گا کہ کتنی بے شرم لڑکی ہے! لالہ رخ نے مانڈی کا گلہ زبردن اپنے سینے سے ٹکراتا محسوس کیا تو محبت سے بولی۔

مانڈی کب مانسنے والی تھی۔ لالہ رخ کے لاؤنے اسے بہت شوخ بنادیا تھا۔ وہ جھٹ اس کے سینے سے ہٹ کر اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئی اور ٹھنک کر بولی:

"ملکہ ماں۔ جب تک روئے کا سبب نہ بتاؤں گی میں پٹی نہ بندھواؤں گی۔"

لالہ رخ نے پہلے تو سامنے بیٹھی ہوئی مانڈی پر ایک بھر پور نظر ڈالی۔ پھر فوراً نظریں نیچی کر لیں:

"اچھا گھوک کے بیٹھ۔ میں بتاتی ہوں۔" لالہ رخ نے جیسے اپنی شکست تسلیم کرن۔

مانڈی ہنستی ہوئی گھوم کر بیٹھ گئی۔ لالہ رخ نے پھر پٹی کشا شروع کی۔ بڑی مشکل سے پٹی اپنی جگہ پر آ کر ٹھہری۔

"بتاؤ ملکہ ماں۔" مانڈی نے پھر خند شروع کر دی:

مہنگمہ سچ بتاتا تو روئے میں روٹھ جاؤں گی اور کھانا بھی نہیں کھاؤں گی اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ شہزادے کے پاس۔۔۔۔۔ مانڈی کھی کھی کھی کھی کرنے لگی۔

مانڈی: "لالہ رخ نے آہ بھر کر کہا،

"تجھے دیکھ کر مجھے اپنی جوانی یاد آگئی تھی۔" لالہ رخ کی آواز زندہ گئی۔

مانڈی لالہ رخ کے پاس کھسک کر آگئی اور بولی:

"ملکہ ماں۔ بچلی باتیں یاد کرنے سے کیا فائدہ۔ بیٹے دن بے دعا ہوتے ہیں۔ وہ لڑک نہیں آتے۔ ہیں تو موجودہ دنوں پر ہی صبر کرنا ہے۔ مستقبل پر بھی ہم اعتبار نہیں کرتے۔ جانے لگا کیا ہو جائے۔"

لالہ رخ ایک زمانے کے بعد آج روٹی تھی۔ غلوں کا بند جیسے ٹوٹ گیا۔ وہ دیر تک روٹی چن رہی۔ مانڈی اسے رستے سے لگائے تسلیاں دیتی رہی۔

روئے سے لالہ رخ کا پی بھلا ہو گیا۔ بادل چٹک گئے اس نے کہا:

"مانڈی! اگر آج شہزادہ چنگ کم زندہ ہوتا تو وہ خاقان بنا اور میں ملکہ۔۔۔۔۔ مجھے اپنے ملکہ بننے کا شوق نہیں لیکن میں چنگ کم کو خاقان دیکھنے کی سزا دیکھ رہی ہوں۔"

مانڈی جانتی تھی کہ گفتگو کا رخ ماضی سے حال کی طرف کسی طرح آجائے۔ اس نے سوچتے ہوئے کہا:

"لکھ ماں - میں نے سنا ہے کہ شافان بہت بیمار ہے اور اب کچھ ہمدردوں کا مکان ہے۔ اس کے بعد شہزادہ تیمور شافان بنے گا۔"

"ہاں بیٹی۔ تو نے ٹھیک سنا ہے۔" لالہ رخ نے کہا:

"تو کوئی سان کا یہ سپاہ نام میا شافان جو اپنے گرد سفید پریوں کا جنگی لگانے رکھتا تھا اپنے انجام کو پہنچے والا ہے۔ اس کا کوئی ہمدرد نہیں۔ کوئی دوست نہیں۔ لاکھوں بے گناہوں کا خون اس کی گردن پر ہے۔ اس نے اپنے وفادار مسلمان وزیرایات احمدایلی کو جینیوں اور ویشی تاجر مارکو پولو کے کہنے پر قتل کر دیا۔ پھر مسلمانوں کا قتل کیا۔ چینی بھی اس سے خوف نہیں۔ وہ شہنشاہ چین ہے لیکن خود کو دنیا کا خاقان کہتا ہے۔ اس کا دل جینیوں کے ساتھ نہیں دھڑکتا۔ قوط، طاعون اور خشک سالی کے لیے اس نے کچھ نہیں کیا۔ اس نے نوادرات اکٹھے کیے۔ خزانے بھر لیے۔ اب مرتے وقت کوئی چیز اس کے کام نہیں آ رہی۔ جین کے تاج محل سرشار اور غریبوں جینی عہد سے دار، ٹائی ٹو کے بجائے شامک تو کے چکر لگا رہے ہیں۔ وہ انتظار کر رہے ہیں کہ کب بتلانی خان کا دم نکلے اور وہ تیمور کو خاقان بنائیں۔"

لالہ رخ اور ماندلی کو باتیں کرتے کرتے شام ہو گئی۔ موی شمعوں کی روشنی سے شامک تو کا بانسوں والا محل بقیعہ نور بن گیا۔

ماندلی کو آج شہزادے کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ دن اس نے سولہ سنگھار کرنے میں گزارا تھا۔ شام ہوتے ہی وہ اپنی تمام تر حشر سامانوں کے ساتھ قدامتے جگاتی اور عیش پر مار کر قی شہزادے کی خواب گاہ کی طرف روانہ ہوئی۔

پتہ نہیں کہ ماندلی کے ارادوں اور اس سنگھار کی خبر مانی سانی کو کس طرح ہو گئی کہ عین اس وقت جب ماندلی شہزادے کی خواب گاہ کے سامنے پہنچی تو ٹھیک اسی وقت مانی سانی بھی وہاں آ موجود ہوئی۔

دو آفتاب، دو آفتاب، دو شمعیں کچی ہوئی تو محافظ کینزوں نے انھیں گھیر لیا۔ مانی سانی بھی کچھ کم تیار کر کے نہ آئی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دونوں کی تیاریاں برابر تھیں۔

مانی سانی نے ماندلی کو دیکھا اور ماندلی نے مانی سانی پر نظر ڈالی۔ دونوں کے دل جل اٹھے اور سر گھبرا گئے۔ شمع برسنے لگیں۔

کینزوں کی وجہ سے بے بات کی ان دہنوں کو دیکھ رہی تھیں اور ایک دوسرے کو اشارے کر رہی تھیں۔ انھیں یہ فیصلہ کرنا مشکل نظر آیا تھا کہ ان میں کون سا آفتاب ہے اور کون سا آفتاب۔ کون شمع ہے اور کون چراغ۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خود حسن و شہب، دو انسانی پیکروں میں دھل گیا ہے۔ دو حسن کی قد میں ہیں جو

روشنی کی لہریں کھیر رہی تھیں۔

ماندلی دیدہ زیب غنچہ تھی تو مانی سانی کھٹا کھٹا گل داؤدی۔

ماندلی کی آنکھوں میں دو شیزنگی کی جیسا کہ سر تھا تو مانی سانی کی آنکھوں میں بے باک جوانی کا دریا بہا رہا تھا۔ مانی سانی نے ماندلی کو شاید جملانے کے لیے آج خود بھی سرخ لباس پہنا تھا اور اب یہ دوسرے شعلے شہزادہ تیمور کے گلستان کی طرف یک رہے تھے۔

کینزوں میں اس انتظار میں تھیں کہ ناز وادا اور عشوہ وغیرہ کے یہ پیکار زبانیں کھولیں گے۔ ایک دوسرے پر گرجیں گے، بریں گے تو ان کا حسن اور دوبالا ہونے کا گمردوں طرف خاموشی رہی۔ سولے تیز تر نظر دے کے انھوں نے زبان دیباں کا سارا نہ لیا۔

وزیرایات ساٹھ کی سیاسی فطرت کا نہرو مانی سانی بالکل خاموش تھی اور لالہ رخ کی منہ بولی بیٹی ماندلی زبان پر قفل ڈالے ہوئے تھی۔

مانی سانی اور ماندلی بغیر کسی تحریک کے خود ہی قدم قدم کا سہا سہا ہنستا ہنستا منہ سے، سنگی گورتوں جیسی خاموشی چہروں پر طاری کیے شہزادے کے کمرے کے دروازے پر پہنچ گئیں۔ کمرے کا بانسوں کا دروازہ جس پر سونے کے پتھر چڑھے تھے کھلا ہوا تھا۔ یہ دروازہ ہر وقت کھلا ہی رہتا۔ خواہ اندر کچھ ہی ہوتا ہو، دروازہ بند کرنے کا حکم نہ تھا۔

مانی سانی اور ماندلی کے قدم دروازے کے پاس آ کر رک گئے۔ دروازے کا انتخاب کا پردہ لہرا لہرا انھیں خوش آمدید کہہ رہا تھا لیکن وہ بت بنی کھڑی ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ پہلے تم داخل ہو۔ ماندلی کے پیروں میں ہلکا سا ارتعاش تھا کیونکہ رات کے دوران شہزادے کے کمرے میں جانے کا اس کا یہ پہلا موقع تھا۔ یہی بات اسے پس کرنے سے روک رہی تھی حالانکہ اس کا دل اندر جانے پر بے چین کر رہا تھا۔ مانی سانی یوں قدم داخل کرنے سے گریز کر رہی تھی کہ کہیں اس پر بے شری کی تھمت نہ لگ جائے حالانکہ وہ شرم کو تو بہت پہلے اودانا کہہ چکی تھی۔

حسن، جب عشق کے آستلنے تک پہنچ جانے تو پھر اٹھل کیوں نہ پئے۔ طوفان کیوں نہ اٹھے۔ آخر عشق نے کھوالی پر دہا اٹھا دیا۔

شہزادہ تیمور امتحان کے لیے دروازے پر آ گیا لیکن جب وہ دیکھا کہ اس پر ایک مانتہ گرین تو ایک لمحے کے لیے اس کے قدم لرز گئے اور آٹھ انھیں خبر ہو گئی۔

ماندلی اور مانی سانی کے آفتاب حسن کی شمعیں، شہزادے کی آنکھوں سے گزرتی ہوئی دمانا تک پہنچیں اور

دماغ کو جھوٹی دل تک اتر گئیں۔

مانڈلی اور سانی سانی جگہ کر آداب بجالائیں۔

شہزادے کا وجود پیسے ہی نرانا تھا اس ادا پر اوپر لکھ گیا لیکن شہزادہ تیمور میں اس کمسنی میں بھروسے فرنائی ہو ہو دیتی۔ اس کے سامنے دوسری کی دیویوں کا قصاص نہ تھا دو جوانیاں دست دگر۔ بدن نہ تھیں بلکہ یہ دو قوموں کا قصاص تھا۔ دو فکروں کا قصاص تھا۔

ایک طرف بہت کے مرغ لالوں کا نایابہ تلوار کھینچے کھڑا تھا تو دوسری طرف چین کے وطن پرستوں کا خنجر سانی سانی کا روپ دھار کر شہزادے کے سامنے آیا تھا۔ جن کا مقصد سامانوں کے بعد بہت کے لالوں کو چین سے نکال باہر کرنا تھا۔

ایک لالہ رخ کا دماغ اور دوسرا سانگا کی عیارانہ فرنائی۔

شہزادے کا دل تو چاہو گا کہ دربارِ حسن میں نذرانہ پیش کرے۔ ان بھڑکے شعلوں میں ہوس کی آگ بھی شامل کر دے۔ ایک ہاتھ سے شے کو ملے اور دوسرے ہاتھ سے گل کی پکھڑیاں بکھیر دے۔ اس کے دونوں پہلو گرم ہو سکتے تھے۔ دونوں آنکھیں مکوں پاسکتی تھیں لیکن اس کے حوائی کے جوش بہ جہانانی کا ہوش غالب آگیا۔ وقت اسے زندگی کے ایسے دور ہے پر لے آیا تھا جہاں ذرا سی غشی اس کا مستقبل تباہ کر سکتی تھی۔

شہزادہ تیمور دونوں میں سے کسی کو مسترد نہ کر سکا۔

اس لیے نہیں کہ دونوں برابر کی حسین تھیں اور وہ دونوں سے اپنی محض سجانا چاہتا تھا بلکہ اسی لیے کہ اگر وہ مانڈلی کو رد کرتا تو بہت کے طاقتور لالہ اس کے مخالف ہو جاتے اور وہ منہ بولی لالہ رخ کی شفقت سے محروم ہو جاتا۔ . . . اور سانی سانی کو مسترد کر کے ان سانگا جیسے عظیم جینی مدبر اور وطن پرست کی دشمنی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

وہ اپنے دادا قلاتی خان کی حکمت عملی پر بڑا آسان سے عمل کر کے ان دونوں جیناؤں یا قوموں کو ٹوٹا سکتا تھا۔ لیکن وہ "لڑاؤ اور حکومت کر دے" کے فلسفے کا قائل نہ تھا۔ اسے اپنے مستقبل کے لیے دونوں کی ہمدردیاں درکار تھیں۔

شہزادے تیمور نے اپنے حواس درست کیے اور حسن کے سامنے سے باہر نکلے جہڑے کہا:

"شہزادہ تیمور اپنے معزز معازن کو خوش آمدید کہتا ہے۔"

سید حسن شہزادے کے کمرے میں راض ہو گیا۔ پردہ گر گیا۔

اڈتا ہوا طوفان قہم گیا۔

مانڈلی اور سانی سانی کے دھڑکتے ہوئے دل ٹھہر گئے۔

کھیزیں شہزادے کے اس فیصلے پر سیران رہ گئیں۔

لالہ رخ کو مانڈلی اور سانی سانی مامی کے بچا ہونے کی خبر مل چکی تھی اور وہ اس کے انجائے سے باہر ہونے کے لیے سخت مضطرب تھی۔ اسے فوراً اطلاع دی گئی۔

لالہ رخ اس فیصلے سے بہت خروش ہوئی۔ خوشی کے ساتھ ساتھ اس کے دل و دماغ سے ایک اور آواز اٹھ:

"تیمور حسن مغل شہزادہ ہی نہیں ہے۔ اس میں تو خاندان بننے کی پوری صلاحیت مہرزد ہے۔"

پھر سے دارنیز میں کمرے کے اندر کاحاں معلوم کرنے کے لیے بے چین تھیں مگر کمرے کے باہر کی طرف سونے کے موٹے موٹے پتھر چڑھتے اور اندر بدست آکر پڑناں تھے۔ انھیں کچھ ہی لمحہ ہی نظر نہ آتا۔ پھر بھی دیواروں کے مائلہ لکے کھڑکی ہو گئیں کہ شاید ان کی گفتگو کا کوئی فقرہ ان کے کان پہ چلتے اور اسے رات بھر کے لیے درد و غم بن سکیں۔

شہزادے کے کمرے میں بیش قیمت قالینوں کا فرش تھا۔ ایران کے نرم و نازک قالین۔ جگہ جگہ گدی کے رکھے تھے اور درمیان میں زرنگار مسند تھی۔ شہزادہ تیمور اپنی مسند کے پاس جا کر ٹھہرا۔ اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے نئے والے دونوں فنون کو دیکھا۔ پھر مندر بہتتے ہوئے انھیں بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ہمیں بڑی خوشی ہے کہ آج ہمارے عشرت کدے میں دو قد بلبلیں روشن ہیں۔ شہزادے نے پُر مذاق مذا میں کہا۔

مانڈلی اور سانگا سانی شہزادے کے سامنے دو زانو ہو کر ادب سے بیٹھی تھیں۔ انھوں نے ایک دوسرے کا نہ دیکھا مگر جواب کسی نے نہ دیا۔

"سنگ مرمر کی خاموش مورتوں میں کتنا حسن ہوتا ہے۔" شہزادے نے دونوں کی پھر پھر پڑا۔

اس دفعہ سانی سانی سے جو پہلے سے بے باک تھی، نہ مانگا اور اٹھلا کر بولی:

"مورتیاں تو پختہ کی ہوتی ہیں شہزادے۔ ان کے دل میں دھڑکن نہیں ہوتی۔"

شہزادہ تیمور نے سنا کر مانڈلی کی طرف دیکھا۔ شاید وہ اس بار سے مانڈلی کے خیالات معلوم کر کے دونوں

مغلوں کا موازنہ کرنا چاہتا تھا۔

مانڈلی نے شہزادے کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو جواب دینے پر عجب بد ہو گئی۔ اس نے ایک اداٹے خاص

سے پوچھ دیا اور پیروں میں پیر ڈال کر شاکہ میمنی کی عبادت کا آس بناتے ہوئے بولی:

"شہزادے ہمارے پتھر کی مورتیاں اگرچہ بے جان ہوتی ہیں لیکن محبت کہہ سوائے تو پتھر کے کیسے

میں دھڑکنے والے دل کی آواز بھی سن لیتے ہیں۔

شہزادے کا بے ساختہ دل چاہا کہ وہ ماندلی کی تعریف کرے مگر کچھ سوچ کر خاموش رہا۔

مانڈلی نے جلی کر ماندلی کو گھورا اور ماندلی نے مسکرا کر نظر اٹھائی۔ یہ وہ اداسی تھی کہ شہزادے جیسا دل چھیک دینے والی تھی مگر اس کے پاس تو اب دل ہی نہ رہا تھا۔ وہ اپنا دل تو ایک جنگلی ہرن کے حوالے کر کے اس کی یاد میں تڑپ رہا تھا۔ اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا۔ یہ عشرت کے سامان تو اس نے اپنے راز پر پردہ ڈالنے کے لیے اکٹھا کر رکھے تھے۔

شہزادہ تیمد نے اندر سے اٹھتی ہوئی ایک مرد آہ کو دہاتے ہوئے نالی بجائی۔ کینز پر وہ اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ شہزادے نے حکم دیا،

”تین گلاس شربت کے حاضر کیے جائیں۔“

شربت کا نام سن کر کینز حیران ہوئی۔ اس مغل میں شربت۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ مغل شربت تو صرف بیماری کے زمانے میں استعمال کرتے تھے۔ ان مغلوں کی زینت و سائز و مینا تھے۔ کینز انتظار کرنے لگی کہ شاید شہزادے نے شربت کا حکم غلطی سے دیدیا ہے اور اب وہ دوسرا حکم دے گا۔ کینز نے حکم کی تعمیل نہ کی تو شہزادے کو غصہ آگیا۔ اس نے ڈپٹ کر کہا،

”شانیں تو نہ ہم تین گلاس شربت حاضر کرنے کا حکم دیا ہے و کینز گھبرا کر بھاگی۔ شہزادے کو غصہ آ جانے سے محل کا رنگ بدل گیا۔ ماندلی اور مانڈلی سانی کو بھی شربت نہ ملنے پر تعجب تھا۔ شہزادہ شراب کا مادی تھا۔

شہزادے نے یہ عقدہ خود ہی حل کر دیا۔ بولا،

”کچھ دنوں سے ہماری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ہم نے شراب پینا بہت کم کر دیا ہے۔ شربت کے گلاس آگئے۔“

شربت پینے کے بعد شہزادے نے ذرا پھیل کر اس انداز سے تکیے کا سہارا لیا جیسے اسے بیٹھنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ ماندلی نے اندازہ لگایا کہ شہزادہ آرام کرنا چاہتا ہے۔ اس نے فوراً کہا،

”شہزادہ عالم کی طبیعت نامناسب ہے۔ آرام فرما، زیادہ بہتر ہو گا۔“

شہزادے نے یہ مکر اسی لیے کیا تھا اس نے انہیں چھپاتے ہوئے کہا،

”ہم معانوں کے شکر گزار ہیں کہ انہیں ہمارے آرام کا اتنا خیال ہے۔“

مانڈلی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ سانس مانا جاتا ہے جتنی تھی لیکن اسے مجبوراً ماندلی کی تقلید میں اٹھنا پڑا۔ وہ

”دونوں سلاطین کو کے دروازے کی طرف بڑھیں۔ کینز شربت کے گلاس سمیٹ رہی تھی۔ شہزادے نے کینز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا،

”خیال رکھو، ہم کچھ بجائیں۔ رات کے وقت ہمیں کوئی پریشان نہ کرے۔ یہ کہہ کر شہزادے نے آنکھیں بند کر لیں۔

مانڈلی اور مانڈلی نے بھی شہزادے کا یہ حکم سنا۔ اس حکم کے پس پردہ کیا تھا یہ تو انہیں اندازہ نہ ہو سکا۔ لیکن یہ حکم ان دونوں کے لیے کھلا ہوا انتباہ تھا۔ شہزادے نے صاف الفاظ میں ان دونوں کو بتلایا تھا کہ اب وہ رات کے وقت اس طرف آنے کی کوشش نہ کریں۔

○

صبح ہوتے ہی پورے شانگ تو میں شہزادے تیمور کی ناسازی طبع کی خبر پھیل گئی۔ سب سے زیادہ پریشانی لالہ رخ کو تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ شہزادے کو ایک دم کیا ہو گیا۔ جب شہزادہ شام تک اپنے کمرے سے نکلا تو وہ اور پریشان ہوئی۔ آخر اس سے برداشت نہ ہوا اور وہ حال دریافت کرنے کے لیے شہزادے کے پاس گئی۔

شہزادے نے کینزوں کو حکم دے رکھا تھا کہ اسے بالکل پریشان نہ کیا جائے اور جب تک بلایا نہ جائے کوئی کمرے میں آنے کی کوشش نہ کرے۔

صبح سے ماندلی کئی بار اور مانڈلی سانی دو چکر لگا چکی تھی مگر کینزوں نے انہیں اندر جانے سے روک دیا لیکن لالہ رخ کو بھلا کون روک سکتا تھا۔ وہ شہزادے کی ماں و نہ تھی مگر اسے ملکہ ماں کا درجہ اور لقب حاصل تھا۔ کینزوں نے کمرے کا پردہ اٹھا دیا۔ لالہ رخ اندر چلی گئی۔

شہزادہ تیمور قابین کے فرشتے پر اونٹن لٹایا تھا۔ آہٹ ہوئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لالہ رخ کو سامنے دیکھ کر جلدی سے اٹھ بیٹھا اور مسکانے کی کوشش کر بھلا وہ اس سے ماں کو ملایا کیا۔

کیسی شہیت ہے میرے بیٹے کی! لالہ رخ اس کے پاس فرشتے پر بیٹھ گئی۔

شہزادے کا چہرہ پھیکا پھیکا تھا۔ اس نے چہرے پر ہنسناس پیداکرتے ہوئے کہا،

”زیادہ تو نہیں مادرِ مہرمان۔ دو ایک دنوں سے طبیعت پریشان سی ہے۔ محل کے ہنگاموں میں جی نہیں

مانڈلی اسی لیے.....“

لالہ رخ کو اس بات سے خندہ سے مدد نہ ہوا۔ اسے پورا یقین تھا کہ شہزادے کو ضرور کوئی مار مار لاتی ہو گی۔
 کہاتے اور اگر مرض پر فوراً بونہ پایا گیا تو مشکل پیدا ہو سکتی ہے۔ پھر بھی اس نے شہزادے سے نہ تو بیک
 اور نہ اس پر زیادہ زور دیا۔ وہ خود ہی دیر تہر اس کے پاس بیٹھی اور پھر یہ کہہ کر کہ:
 "شہزادہ اپنی صحت کا پوری طرح خیال رکھے۔"
 اس نے چلی آئی۔

مستقبل کا خاقان بیمار ہو جائے اور اس کی خبر ملک میں نہ پھیلے۔ یکے کے بعد ایک وزیر ماییت کے گر گئے
 بلکہ جاسوسوں کی ایک پلڑی فرج شاہک تو میں موجود تھی۔ سب سے بڑی جاسوسہ تو اس کی بھانجی سانی سانی تھی۔
 اس نے ایک دن رشتہ خاندان کے ذریعے سانگا کو اس کی اطلاع بھیجی۔

سانگا کو شہزادے کی بیماری کی خبر تو اس کے ہاتھ کے رشتے خاقان قبلائی خان کے بعد اس کی
 خبر سے بہت دن بعد ہی والستہ تھیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ شہزادے پر پوری طرح جاری ہو سکتا ہے۔ تیور بھی اسے
 پسند کرتا تھا۔ اور جب بھی دونوں میں ملاقات ہوتی تو وہ آپس میں بڑے بڑے لطفی سے گفتگو کرتے۔
 سانگا کو یہ نیکو درایت ہو گئی کہ قبلائی خان جس کی زندگی کا چرچہ کسی وقت سن چکے ہوتے۔ اگر اس کے
 ساتھ ہی کہیں تیور بھی چل بسا تو اس کی امیدوں اور منصوبوں پر پانی چھلنے کا یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ پھر نیا خاقان کن
 بنے اور وہ کس طبیعت کا ہو۔

سانگلے چار چینی طبیب معہ دواؤں کے اپنے ساتھ لیے اور بھاگ بھاگ ٹائی رُسے شاہک تو پہنچ گیا۔
 لے کر یہ خبر خاقان قبلائی خان تک پہنچانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

شہزادہ تیور کو جب سانگا کے آنے اور چار طبیب ساتھ لانے کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوا۔ وہ
 بہت میں بیمار تو تھا نہیں اور جو بیماری اس کی تھی اس کا علاج تو دنیا کے کسی بھی طبیب کے پاس نہ تھا۔ شہزادے
 سانگا کو اس شرط پر بار بار کی اجازت دی کہ وہ طبیعوں کو اپنے ساتھ نہ لائے۔

سانگا حکم کے مطابق تباہ دوسری کے لیے حاضر ہوا لیکن شہزادے کے سامنے پہنچے ہی اس کے پیروں سے
 گیا اور اعلان کر دیا کہ جب تک شہزادہ اس کے سامنے ہوئے چینی طبیعوں سے علاج کے لیے سامنے نہ ہو گا وہ
 دے کے پیر نہ چھوڑے گا اور نہ کھانے پانی کو ہاتھ لگائے گا۔
 شہزادے کے گلے اچھی بنا دی گئی۔

سانگا اتنی دیر سے چل کر اس کے پاس آیا تھا۔ اس کی دل نشینی بھی اسے منظور نہ تھی۔ آخر اس نے مجبور ہو کر
 ناچار اپنے محلے کی اجازت دیدی۔

"تیور نہ میری گود میں چل کر جوان ہوئے ہو۔ لالہ رخ نے پُر وقار انداز اختیار کیا۔
 تجھے اپنی بیماری چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ میں تمہاری ماں ہوں شہزادے۔ اگر کوئی پوچھتا ہے
 بیماری لاتی ہو گئی ہے تو مجھے بتاؤ۔ ماں، اولاد کی سب سے بڑی راز دار ہوتی ہے بیٹے؟
 لالہ رخ کی مشفقانہ گفتگو سے شہزادے کی بڑی دھارس بندھی۔ اس کا دل چاہا کہ دل کا راز اگلی دس مگر
 فوراً اسے خیال آیا کہ لالہ رخ نے اس کے لیے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔ ماندی اس کی بھی پسند تھی اور اس
 نے سوچ رکھا تھا کہ اگر مکی مصلحت کی بنا پر اسے سانگا کی بھانجی کو ملے بنا پڑا تو بھی ماندی اس کی دوسری مکتبہ ہوگی۔
 لیکن جنگل کے شکار میں وہ جس کا شکار ہو گیا تھا اس کی یاد دل سے نہ نکلتی تھی۔ اب اگر وہ یہ راز مان پرنا ہو کر سے گا تو
 ماں کا دل ٹوٹ جائے گا اور یہ بات اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

شہزادہ تیور نے جھوٹ کا سہارا لیا اور بولا:
 "مادر میرا ماں، آپ میری نگرہ نہ کریں۔ کوئی بیماری نہیں۔"
 تیزی سرخ آنکھیں اور مٹھے ہوئے چوٹے چٹکی کھا رہے، میں شہزادے! لالہ رخ نے اسے گھورتے
 ہوئے کہا:

"کیا یہ غلط ہے کہ تو رات بھر نہیں سو یا؟"
 شہزادے نے کوشش کی مگر جھوٹ نہ بولی سکا:
 "آپ کا خیال درست ہے رات میں درد تھا اس لیے پوری طرح آرام نہ کر سکا۔"
 لالہ رخ نے شکوے کے انداز میں کہا:

"ایسی صورت میں کیا یہ تمہارا ذہن نہ تھا کہ مجھے اطلاع دیتے۔ بلوایتے۔ میں تمہارا سر دباتی۔ میری
 لوریاں تمہیں ضرور خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیتیں۔"
 شہزادے کو کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس نے شرمندگی سے سر جھکا دیا۔

"میں ابھی کسی طبیب کو بلواتی ہوں۔ لالہ رخ تو شہزادے کو ایک لمحہ ہمارے دیکھ سکتی تھی:
 "اچھا یہ تو بتاؤ شہزادے تم کسی چینی طبیب سے علاج کرانا پسند کر دو گے یا میں بہت کے کسی طبیب
 کو بلواؤں؟"

"ابھی آپ رخصت نہ کریں۔ شہزادے کو طبیعوں کی گتھی اور یہی ہونے والا ہے کہ خیال سے ہی اگلیں
 آئے گی۔"

"جب مجھے ضرورت ہوئی تو میں آپ کے احکامات دروں گا۔"

سے اپنا علاج کرتے تھے۔

لالہ رخ کو فاما نگ پر بڑا اعتماد تھا اور تمام اہم معاملوں میں وہ اس بزرگ طبیب سے مشورہ لیا کرتی تھی۔ ملک کے اندرونی معاملات سے بھی اسے پوری واقفیت تھی لیکن وہ کبھی کسی معاملے میں دخل نہ دیتا تھا۔ فاما نگ کی نظریں ہمیشہ سنجی رہتیں۔ اس وقت بھی وہ سر ہٹکاٹے نظریں زمین پر جمے لالہ رخ کے ساتھ آہستہ آہستہ شہزادے کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر ایک گیر واز چڑھا ہوا بالکل عیسائی راہوں کی طرح کارگلے سے پیروں تک لٹکا ہوا سفید چھدری ڈاڑھی سر کے لہنے بال چاندی کی طرح سفید جین کی دو چڑیاں بندھی تھیں۔

حافظ گنیز نے پرزہ اٹھایا۔

لالہ رخ اور فاما نگ شہزادہ تیمور کے کمرے میں داخل ہوئے۔ شہزادے نے سند سے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔

فاما نگ نے تعلیم کے طور پر سر کو قدرے خم کیا مگر نہ منہ سے بولا اور نہ نظریں زمین سے اٹھیں۔ شہزادہ مند میٹھ گیا۔ فاما نگ اس کے سامنے آکڑوں میٹھ گیا۔ اس کی نظریں اب بھی نیچی تھیں۔ اس نے نظر اٹھا کر ایک بابھی مراد سے اس کی طرف نہ دیکھا۔

معاف فاما نگ نے شہزادے کی طرف اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں بکڑی کے دانوں کی چاروازی پٹی ہوئی تھی۔

شہزادے نے لالہ رخ کا اشارہ پا کر اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ فاما نگ نے شہزادے کی منہ پر اپنی دو انگلیاں پس۔

لالہ رخ اٹھ کر چلی۔ شہزادے نے روکنا چاہا مگر لالہ رخ نے یہ کہہ کر شہزادے کو باز رکھا کہ معاف اور مرخص رہا۔ تیسرے شخص کا ہونا کسی طرح مناسب نہیں۔

یہ بات فاما نگ ہی نے لالہ رخ کو سمجھائی تھی۔ اس نے لالہ رخ کو منع کر رکھا تھا کہ جب وہ کسی مرخص کو لے کر اس کے پاس سوائے مرخص کے اور کوئی نہیں ہونا چاہیے۔

شہزادہ اس عجیب العینیت طبیب کو دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرایا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جو طبیب نے اسے دیکھے وہ علاج کیا کرے گا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ آدھا مرخص و مرخص کے چہرے پر جھلکتے تھے۔ شہزادہ بھی کچھ سوچ رہا تھا کہ فاما نگ نے بوننا شروع کر دیا۔ وہ یوں بول رہا تھا جیسے اپنے آپ سے ابور۔

سانگا کے چاروں طبیبوں نے سر جوڑ کر شہزادے کا ہر طرح سے معائنہ کیا مگر مرخص ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ مرخص ہوتا تو سمجھ میں آتا بھی۔ دل کی اسی ایسا مرض ہے جسے دیکھا نہیں جاسکتا۔ اسے تو صرف سمجھا جاسکتا ہے اور یہ سمجھ ہر طبیب میں موجود نہیں ہوتی۔

دو ہفتے تک چاروں طبیب سر جوڑے سر ہاتھ رہے مگر ان کے گلے کچھ نہ پڑا۔ آخر انھوں نے شہزادے کے بالکل تندرست ہونے کا اعلان کر دیا۔ شہزادہ بھی یہی چاہتا تھا۔ اس کی جان چھوٹی اور سانگا اپنے طبیبوں کو لے کر خوش خوشی لٹائی ٹو واپس چلا گیا۔

لالہ رخ کا طبیب خاص فاما نگ، سانگا کو میں رہتا تھا۔ لالہ رخ اسے بہت کم ملاتی تھی۔ فاما نگ کو لالہ رخ نے خانقاہ قبلانی خان کے لکھیا کے علاج کے لیے بت سے بلوایا تھا۔

فاما نگ نے خانقاہ کے سامنے شرط پر رکھی کہ وہ گھوڑی کا دو درہہ بیٹا چھوڑ دے تو لکھیا کا علاج ہو سکتا ہے اور یہ مرض ہمیشہ کے لیے ختم کیا جاسکتا ہے۔ خانقاہ نے یہ شرط قبول نہ کی اس لیے خانقاہ کا علاج نہ ہو سکا۔

لالہ رخ نے فاما نگ کو بت واپس نہ جانے دیا بلکہ خانقاہ سے اجازت لے کر اپنے خاص طبیب کے طور پر ساتھ ہی رکھ لیا۔

فاما نگ کی عمر سو سال سے اوپر تھی اور وہ ملک ملک گھوم چکا تھا۔ دس سال اس نے بھارت میں دیدوں کی خدمت کی اور ان سے جڑی بوٹیوں سے علاج کے نسخے حاصل کیے۔ پھر وہ قندھار مغربی ہوتا ہوا در اسلام آباد گیا۔ یہ شہزادہ ابن کاسر کہتا تھا۔ یہاں اس نے مسلمان طبیبوں کی شاگردی کی اور فن طب میں مکہ حاصل کیا۔ پھر وہ مصر گیا۔ مصر بھی علم طب کے لیے مشہور تھا۔ مرلیف کی بغض دیکھنے کے جتنے طریقے تھے سب اس نے مسلمانوں سے حاصل کیے۔ اسی طرح چالیس سال کے تجربے، مشاہدے و دیدوں اور طبیبوں کی صحبت میں گزار کر جب وہ بت واپس آیا تو وہ ایک اعلیٰ پایے کا وید اور مرخصین بغض شناسی طبیب تھا۔

شہزادہ تیمور سانگا کے چار چینی طبیبوں کو معائنے کی اجازت دے چکا تھا۔ لالہ رخ نے جب فاما نگ کو دکھانے کو کہا تو شہزادہ انکار نہ کر سکا۔ جب اس نے سانگا کی بات رکھی تھی تو پھر لالہ رخ کو کیوں ناراض کرتا۔ فاما نگ کو معائنے کا دن اور وقت بنا دیا گیا۔

لالہ رخ کو امید تھی کہ اگر شہزادے کو کوئی پوشیدہ مرض بھی ہوگا تو فاما نگ اس کا پتہ مرض کے ذریعے ضرور چلائے گا۔ فاما نگ بعض مغل شہزادیوں اور ملکاؤں کے پوشیدہ امراض ان کے منہ دیکھ کر بتا چکا تھا اور ان کا بڑا کامیاب علاج کیا تھا۔

خانقاہ کے علاوہ مٹائی ٹو اور سانگا کے تمام شاہی خاندان سے وقت ضرورت لالہ رخ کے ذریعے فاما نگ

فاماگ کی آواز بالکل صاف اور واضح تھی۔ اس کی نظروں اس وقت بھی نیچی تھیں۔ شہزادہ اس کی باتیں تو بے سے سنتے رہا۔

فاماگ کہہ رہا تھا:

”بعض بادشاہ اور شہزادے عجیب و غریب طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کی پسند بھی عجیب و غریب ہوتی ہے۔ ہمارے خاقان کو یورپ کی لڑکیاں بہت پسند ہیں حالانکہ چین میں ایک سے ایک بہتر لڑکی موجود ہے۔ بہت کی لڑکیاں بھی کچھ کم خوبصورت نہیں ہوتیں۔ جن لوگوں نے لالہ رخ کی جوانی دیکھی ہے وہ اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔“

شہزادہ تہجد رول میں سخت بیچ و تاب کھا رہا تھا کہ یہ بوڑھا اسی فضول باتیں کر رہا ہے مگر مادرملکہ کے لحاظ سے خاموش بیٹھا تھا۔

فاماگ کہہ رہا تھا:

”بہت کی لڑکیاں بڑی وفادار ہوتی ہیں۔ سچی خوبصورت اتنی ہی وفا شعار لیکن یہ ضروری نہیں ہر کوئی چینی یا تبتی حسن کو پسند کرے۔ کسی کو دیہاتی حسن پسند نہ آتا ہے کسی کو جنگلی حسن۔ دیہاتی لڑکی گلے کی طرح سیدھی ہوتی ہے اور جنگلی دوشیزہ ہرنی کی طرح کلیلیں بھرتی۔“

”جنگلی ہرنی!“ شہزادہ تہجد کا دل سینے میں زور سے دھڑکا۔

”جنگلی ہرنی!“ اس کے دل نے جیسے آواز لگائی

فاماگ خاموش ہو گیا۔ پھر جب وہ دوبارہ بولا تو اس نے وہیں سے بات شروع کی جہاں تک کہ وہ رک گیا تھا:

”اور جنگلی دوشیزہ ہرنی کی طرح.....“

شہزادے کا دل پھر دھڑکا۔

فاماگ ہنس چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مرضی کی تشخیص ہو چکی تھی۔ فاماگ نے کھڑے ہو کر سر کو پھر ایک بار بغ

کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا۔ ہر نکل گیا۔

شہزادہ تہجد منہ کھو۔ اے اے دیکھتا ہی نہ گیا۔

لالہ رخ کو بڑی بے چینی تھی لیکن فاماگ نے واپس آتے ہوئے راستے میں اسے کچھ نہ بتایا۔ لالہ رخ فاماگ کو لے کر بانسوں کے محل کے اس حصے میں آگئی جہاں اس نے اپنے رہنے کے لیے مٹی کا ایک محل بنوایا تھا۔

بانسوں کے محل کے گرد بڑا میدان تھا اور اس پورے علاقے کو بانسوں ہی کی فصیل سے گھیرا گیا تھا۔ شاہی محل کے علاوہ بھی اس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے محل بنائے گئے تھے لیکن تھے وہ بھی سب بانس کے۔ لالہ رخ کو ان محلوں سے الجھن ہوتی تھی اسی لیے اس نے اپنے لیے مٹی کا ایک خوبصورت ساحل تعمیر کرایا تھا۔

فاماگ کو لالہ رخ کی بے چینی کا احساس تھا۔ اسی لیے اس نے کمرے میں بیٹھتے ہی اس سے پوچھا:

”شہزادے کو یہ بیماری کب لگی؟“

”کون سی بیماری؟“ لالہ رخ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا:

”کیا آپ نے بیماری معلوم کر لی۔ یعنی شہزادہ واقعی بیمار ہے؟“ لالہ رخ نے جواب دینے کے بجائے گہرا کہ خود ہی کئی سوال کر ڈالے۔

فاماگ کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی مسکراہٹ نمودار ہوئی جیسے کوئی سوتے میں مسکراتا ہے۔ پھر اس نے کہا:

”بیماری بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم میرے سوال کا جواب دو لالی!“

فاماگ بیمار میں لالہ رخ کو لالی کہتا تھا۔ لالہ رخ نے جواب دیا:

”پچھلے دو مہینے سے شہزادے کی یہی حالت ہے۔“

”دو مہینے؟“ فاماگ بڑبڑایا:

”دو مہینے پہلے شہزادہ کسی جنگل میں لگ گیا تھا؟“

”ہاں! لالہ رخ نے کہا:

”شہزادہ شکار کو گیا تھا وہاں سے واپس آتے ہی اس کا یہ حال ہو گیا۔“

”شہزادہ ایک جنگلی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہے۔“ فاماگ نے اعلان کیا۔

لالہ رخ سن پڑ گئی۔ اس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا:

”کیا یہ بات شہزادے نے آپ کو خود بتائی ہے؟“

”نہیں۔ یہ مرض اس کی مرض نے بتایا ہے۔“

فاماگ کے چہرے پر اب بھی پھکی پھکی سی مسکراہٹ تھی۔ ممکن ہے کہ یہ فسفیانہ مسکراہٹ ہو جو فلسفی کے

چہرے اور لبوں پر اس وقت نمودار ہوتی ہو جب وہ کسی گتھی کو سلجھانے میں کامیاب ہو جاتا ہو۔

لالہ رخ کی سچھ میں اب بھی نہ آیا۔ اس نے پوچھا:

”میں کبھی نہیں حبیبِ حرام۔ کیا کبھی نبض بھی باتیں کرتی ہے؟“

فاماگ نے اسے سمجھاتے ہوئے بتایا:

”لالہ۔ نبض کے ذریعے مرض معلوم کرنا خاص اسلامی فن ہے۔ اس فن میں مسلمانوں نے جو ملکہ حاصل کیا، وہ کسی دوسری قوم کو نصیب نہیں۔ حالانکہ طب کا ہنر انھوں نے یونانیوں سے سیکھا لیکن اس کو مزوج رسے کر اپنا بنایا۔“

”لیکن نبض کے طبیب تو دل کی دھڑکن اور چہرے کی رنگت سے مرض معلوم کرتے ہیں۔“ لالہ رخ نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

”میں تمہیں سمجھاتا ہوں لالی۔“ فاماگ کی سکراہٹ میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے کہا:

”اسلامی طب میں نبض کی دو قسمیں یاد و طرح کی حرکتیں ہیں۔ پھر ان قسموں کی جھجھ اور قسبیں ہیں اور ان چوچہ قسموں میں سے ہر قسم کا بارہ قسبیں ہیں۔ پس جس نے نبض کی تمام قسموں یا حرکتوں پر عبور حاصل کر لیا وہی کامل طبیب ہے۔“

لالہ رخ منہ کھولے سن رہی تھی۔ اس کی سچھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ وہ تو بس یہ جانتی تھی کہ نبض چلتی ہے۔ ہر ایک کی نبض چلتی ہے اور نبض تو ہمیشہ ایک ہی طرح چلتی ہے۔ نبض رک جانے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔

”لیکن نبض نے یہ کیسے بتا کر شہزادے کو جنگلی لڑکی سے محبت ہو گئی ہے؟“ لالہ رخ نے الجھتے ہوئے

سوال کیا۔

”میں نے شہزادے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔“ فاماگ بتانے لگا:

”میں نے شروع کا ذکر کیا۔ ثانی ڈوکا ذکر کیا۔ ثالثک تو کی بات کی۔ چینی لڑکیوں، ہیتی دوشیزاؤں اور دیہاتی حسیناؤں کا تذکرہ کیا۔ شہزادے پر کوئی اثر نہ ہوا لیکن جب میرے منہ سے جنگل اور جنگل میں ہر نیوں جیسی مد و شون کی بات نکلی تو شہزادے کا دل ایک دم دھڑکنے لگا۔ میں نے ڈارک کر پھر اپنی بات دہرائی۔ شہزادے کا دل پھر دھڑکا۔ جب شہزادے کا دل تیسری بار دھڑکا تو مرض خود ہی سامنے آ گیا۔ . . . لالی! میں نے مرض بتا دیا۔ اب اس کا علاج تم کرو۔“

فاماگ یہ کہتے ہوئے اٹھا اور لالہ نے لالہ نے ڈگ بھٹا کچے مکمل سے نکل گیا۔

لالہ رخ نے جب ٹھنڈے دل سے فاماگ کی باتوں پر غور کیا تو اسے آہستہ آہستہ شہزادے کے مرض یاد آ

کے سبب پر یقین کرنا پڑا۔ اسے صرف یہ بات کھٹکتی تھی کہ اگر شہزادے کو واقعی کسی جنگلی لڑکی سے محبت ہو گئی ہے تو اس کا ذکر اس نے کیوں نہ کیا اور اس کے حاصل کرنے میں شہزادے جیسے بااثر انسان کو کون سی چیز مانع ہے پھر اس نے یہ سوچ کر اپنے دل کو مطمئن کر لیا کہ ہو سکتا ہے شہزادے نے اس خیال سے نہ کہا ہو کہ لالہ رخ کو اس بات سے تکلیف پہنچے گی۔ کیونکہ وہ تو نازلی کو ملکہ بنانے کا خواب دیکھ رہی تھی۔

لالہ رخ نے فوراً ٹانگ تو کے ان تمام جراحوں کی فہرست طلب کر لی جو پوڑوں اور زخموں کا علاج کرتے تھے ان میں جینی، بتی، اور کچھ غریب مسلمان بھی تھے۔

لالہ رخ نے باری باری ایک ایک جراح کو اپنے پاس بلا کر ان سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کس نے شہزادے کے زخم کا علاج کیا ہے۔ اس میں اسے زیادہ وقت نہ ہوئی۔ ایک چینی جراح نے اس کا اقبال کر لیا۔

لالہ رخ نے اس سے نہایت نرم انداز میں پوچھا:

”جب شہزادہ تمہارے پاس علاج کے لیے خود پہنچا تو کیا تمہیں تعجب نہ ہوا؟“

”ملکہ مہربان۔ میں تو شہزادے کو اپنے مطلب میں دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ جراح نے کہا:

”میں سمجھا کہ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے اور شہزادہ مجھ سے جواب طلب کرنے آیا ہے۔“

”شہزادے کو تمہارا پتہ کیسے معلوم ہوا؟“ لالہ رخ نے وضاحت چاہی۔

جراح کچھ سوچتے ہوئے بولا:

”میں نے بھی شہزادے سے ہمارے یہ سوال کیا تھا کہ انہیں میرا پتہ کیسے معلوم ہوا لیکن شہزادے نے یہ کہہ کر مجھے خاموش کر دیا کہ معالج کو صرف علاج کے بارے میں بات کرنا چاہیے۔“

”زخم کتنا گہرا اور کس چیز کا تھا۔“ یہ مطلب ہے کہ زخم کسی اسلحے کا تھا یا“ لالہ رخ نے بات مختصر کی۔

”ملکہ مہربان۔ شہزادے کی کٹائی کے پاس زخم تھا۔ نہ زیادہ گہرا نہ ہلکا لیکن خفے یقین ہے کہ وہ زخم

تکوار یا خنجر کا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے جراح گہرا گیا۔ اس نے خواہش مند کہتے ہوئے مزید کہا:

”ملکہ مادر۔ اگر شہزادے کو خبر ہو گئی کہ میں نے یہ باتیں آپ کو بتائی ہیں تو وہ شاید مجھ سے ناراض ہو جائیں اور“ جراح اور زیادہ گہرا گیا۔

لالہ رخ نے اسے رخصت کیا اور چلتے ہوئے تسلی دی:

”تم بالکل فکر نہ کرو۔ تم پر کوئی آہنچ نہ لگے گی۔“

تھوڑی دیر بعد لالہ رخ نے غافظ دستے کے اس سردار کو بلایا جو شکار میں شہزادے کے ساتھ تھا۔ اس کا ناکھیل خان تھا۔ اس کا قبیلہ کبھی یہاں کے کنارے رہتا تھا۔ اسی مناسبت سے یہ لوگ جیسا فی کہلاتے تھے۔

جھیل خان، شہزادہ تیمور کا بڑا جان نثار اور معتمد ساتھی تھا اور اسی وجہ سے کچھ خود مراد و مغرور بھی تھا۔
شاہک تو کے بغیر فوجی چینی افسروں کو نو وہ گھاس ہی نہ ڈالتا تھا۔

جھیل خان، لالہ رخ کے سامنے جیسے ہی پیش ہوا اس نے پوچھا،

”جھیل خان تمہیں دنیا میں سب سے زیادہ کون کی چیز عزیز ہے؟“

جھیل خان اس سوال پر گھبرا گیا۔ بڑا عجیب سا سوال تھا۔ اس نے سوچتے ہوئے کہا:

”مکہ مادرِ مرنے والوں میں خانِ اعظمِ توحیدین (جنگیز) کی سولدو (دوج) اور زندوں میں شہزادہ تیمور سب

سے عزیز ہے۔“

”اور یا سا کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟“ لالہ رخ نے سوال کیا۔

”مادرِ بہرمان“ جھیل خان نے بڑے استعجال سے کہا:

”خانِ اعظم کا بنایا ہوا دستور یا سا اور خانِ اعظم کی سولدو و ایک ہی چیز کے دو نام ہیں کیونکہ خانِ اعظم کی سولدو اس کے قانون یا سامین حلوں کی ہے۔“

”اچھا۔ تو ہم تمہیں خانِ اعظم کی سولدو کی قسم دے کر پوچھتے ہیں کہ بتاؤ ننگار کے دوران شہزادے کے ہاتھ پر زخم کیسے آیا۔ شہزادے پر کس نے حملہ کیا۔ وہ تلوار یا خنجر کہاں ہے جس نے شہزادے کے خون میں نہانے کی کوشش کی؟“

جھیل خان، یہ سوالات سن کر بہت گھبرا اٹھا۔ لالہ رخ اگلے چہرے پر نظریں گاڑے جواب کا انتظار کر رہی تھی اور وہ نگاہیں نیچی کیے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لالہ رخ کو جواب نہ ملا تو اس نے اپنا سوال دہراتے ہوئے کہا:

”جھیل خان! ہم جانتے ہیں کہ تم شہزادے کے معتمد اور رازدار ہو لیکن جو سوالات ہم نے تم سے کیے ہیں ان کا تعلق شہزادے کی سلامتی اور زندگی سے ہے۔ اگر شہزادے نے تم کو رازداری کی قسم بھی دلائی ہے تو یہ معاملہ شہزادے کی موت اور زندگی کا ہے۔ تمہیں ہم سے نفاق نہ کرنا چاہیے۔ تم شہزادے کے بھی خواہ ہو تو میں اسکی ماں ہوں۔ میں اسکی بھلائی کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتی۔“

جھیل خان، لالہ رخ کی باتوں سے متاثر تو بہت ہوا لیکن ابھی اس کا پوری طرح اطمینان نہ ہوا تھا۔

جھیل خان نے بڑے ادب سے پوچھا:

”مکہ مادر! آپ ان سوالات اور شہزادے کی زندگی کے تعلق پر روشنی ڈالیں تو میں نہ صرف بہت شکر گزار ہوں گا بلکہ پورا تعاون کروں گا۔“

شہزادہ تیمور بیمار ہے۔ یہ تمہیں معلوم ہے؟“ لالہ رخ نے کہا:

”میں بتایا گیا ہے کہ شہزادے کی بیماری اور ننگار کے دوران کسی غیر معمولی واقعے میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس واقعے کا سبب کوئی جنگی لڑکی بھی ہو سکتی ہے۔“

”مکہ مادر! اندازہ سو فیصدی ٹھیک ہے۔“ جھیل خان کو لالہ رخ کی طرف سے اطمینان ہو گیا تھا اس لیے اس نے حقیقت کا اظہار کیا،

”مجھے پورا یقین ہے کہ شہزادے کے ہاتھ پر جو زخم آیا ہے وہ اس لڑکی کا پہنچا ہوا ہو گا۔ وہ لڑکی بہت کوشش تھی۔ اس نے ان آدمیوں کو بھی نقصان پہنچایا تھا جو اسے پکڑ کر لے گئے تھے۔۔۔۔۔ شہزادے نے جہیں رازداری کا حکم دیا تھا اس لیے میں ان سے کچھ نہ پوچھ سکا۔“

اس کے بعد جھیل خان نے تمام واقعات جو ننگار کے دوران پیش آئے تھے، لالہ رخ کے سامنے الف سے نیے تک بلا کم و کاست بیان کر دیے۔

لالہ رخ تمام باتیں بڑے غور سے سنتی رہی۔

جب جھیل خان تمام باتیں بیان کر چکا تو لالہ رخ نے کہا:

”جھیل خان! ہم بغیر تمہارے حوالے کے شہزادے سے گفتگو کریں گے پھر بھی اگر کوئی ایسی دسی بات ہوئی تو ہم تمہاری حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔“

لالہ رخ نے جھیل خان کو مکمل کرنے کے بعد اسے رخصت کر دیا اور اسی وقت شہزادے سے ملنے کیلئے چل پڑی۔ اب وہ اس معاملے کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتی تھی۔

وہ شہزادہ تیمور کے کمرے میں پہنچی تو اسے پہلے سے بھی زیادہ مغموم پایا۔

شہزادہ، لالہ رخ کو دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا اور زبردستی مسکرائے کی کوشش کی لالہ رخ نے شہزادے سے بلا کسی تمہید کے کہا:

”شہزادے بیٹے۔ ہمارا خیال ہے کہ میرا ننگار سے تمہاری صحت پر اچھا اثر پڑے گا اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ کل تم ننگار پر جاؤ گے۔“

شہزادے نے کچھ کہنا چاہا مگر لالہ رخ اس سے پہلے سی بول پڑی:

”اگر تم ننگار پر جانے سے انکار کرو گے تو میں مدعو ہو گا۔“

شہزادے کے لیے اب انکار یا احتجاج کی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی اس لیے اس نے خاموش رہنا ہی بہتر خیال کیا اور اظہارِ اطاعت کے طور پر سر جھکا دیا۔

پچھلی دفعہ ہم یہاں تک شکار کھیلے کہ بڑے فخر سے

لالہ رخ نے اپنا گھوڑا بڑھاتے ہوئے کہا:

”جھیل خان - ہم آگے جا رہے ہیں تو اپنے دھنکے کے ساتھ منتظر رہو۔“

شہزادہ تیمور بڑی بے دلی اور محض لالہ رخ کا دل رکھنے کے لیے شکار کے لیے آگیا تھا ورنہ اس کا دل بالکل نہ چاہ رہا تھا۔ اسی لیے وہ تمام اسٹے خاموش رہا اور اس نے کسی بات میں دخل نہ دیا۔

لالہ رخ نے گھوڑا اڑھایا تو وہ بھی گھوڑے کو ہمیز دے کر اس کے ساتھ ہویا۔ اس مقام کے شہزادے کی پرانی یادیں وابستہ تھیں۔ اس لیے اس کا دل اور بھی ہل ہل گیا لیکن مادرِ مرہبان کی خوشنودی کے لیے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

تھوڑی دور جا کر لالہ رخ نے لکھن میں کھینچ لیں اور گھوڑا روک کر کھڑی ہوئی۔ شہزادے نے بھی گھوڑا روک لیا اور لالہ رخ کو حیرت سے دیکھا۔

لالہ رخ نے مسکرا کر شہزادے سے کہا:

”شہزادے بیٹے! ابھی کچھ دن پیشتر اس مقام پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ آگے بڑھنے سے پیشتر ہمیں بھی وہ کہانی سنا دی تاکہ ہم سمجھ سکیں اسے اختیار کر سکیں۔“

لالہ رخ خاموش ہو کر اور شہزادے کے پہرے کے دھڑکے دیکھنے لگا۔ شہزادے کی نگاہیں اب تک کچھ نہ آیا تھا اس لیے اس کے پہرے پر حیران کے سوا اور کوئی تاثر نہ تھا نہ رہا۔

لالہ رخ نے پھر کہنا شروع کیا:

”وہ کہانی کچھ اس طرح ہے کہ کچھ دن تو ایک نوجوان اسی جگہ شکار کھیلنے آیا۔ اتفاق سے اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہو گئی۔ وہ لڑکی جھلی ہرن کی طرح تیز تھی۔ جوان نے اس کے ساتھ گھوڑا دوڑانے کی شرط لگا کر دوڑ شروع ہوئی۔ ہرنی شہسوار میں بھی بڑی ماہر تھی۔ وہ جوان کے تابوں سے آسکی۔ پھر ایک دفعہ جوان نے اسے کسی نہ کسی طرح پکڑ لیا لیکن وہ جوان کی کمان اپنے پنجے سے زخمی کر کے نکل گئی۔“

شہزادے کے کان تو گونجنے لگے۔ وہ پتہ تو پٹٹی پٹٹی نظروں سے لالہ رخ کو دیکھتا پھر برداشت نہ ہو سکا تو اس نے لالہ رخ کی بات کاٹ دی اور بولا:

”لیکن مادرِ مرہبان آپ میری بات تو سنیں۔ میں.....“

لالہ رخ نے ڈراستی سے کہا:

”شہزادے بیٹے! کہانی سننے وقت اچھے پنجے بیچ میں نہیں ہونا کہتے۔ کہانی ختم ہو جانے کے بعد پھر جو چاہے

لالہ رخ فوراً واپس ہوئی اور دروازے کے پاس پہنچ کر بولی:

”صبح کو شکار پر ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔“

یہ کہہ کر لالہ رخ تیزی سے باہر نکلی اور اپنے کپے محل کی طرف روانہ ہو گئی۔



شام تک تو کے بانسوں والے بڑے گیٹ سے جب یہ شکار یوں کا مختصر قافلہ نکلا تو لالہ رخ شہزادے کے گھوڑے سے گھوڑا اٹھا کر چل رہی تھی۔

لالہ رخ نے ماندی کو کچھ نہ بتایا تھا۔ شکار کے اس اچانک پروگرام پر سانی سانی بھی حیران تھی۔ اس کے خیال میں لالہ رخ کا شہزادہ تیمور کے ساتھ شکار پر جانا کوئی گہری سیاسی چال تھی۔ اس نے فوراً پرہیز نہیں کر کے دریغ اس کی خبر مانگا تو بھجوا دی۔

جب یہ قافلہ محل سے کافی دور نکلا تو لالہ رخ نے ایک مگر گھوڑا روکا اور شہزادے سے پوچھا:

”پچھلے شکار میں شہزادے بیٹے کے محافظ کا سردار کون تھا؟“

شہزادے نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ پھر کہا:

”جھیل خان!“

جھیل خان اس وقت محافظ دستے کا سردار تھا۔ وہ ذرا فاصلے سے ان دونوں کے پیچھے اور اپنے دستے کے آگے آگے آ رہا تھا۔

لالہ رخ نے قافلہ کے اشارے سے جھیل خان کو بلایا۔ جب وہ قریب آیا تو لالہ رخ نے کہا:

”جھیل خان - ہمیں اس مقام پر لے چلو جہاں پچھلی دفعہ شہزادہ تیمور شکار کھیلنے آیا تھا۔“

جھیل خان نے ایک اچھٹی نظر سے شہزادے کو دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ آپ کہاں کیا حکم ہے مگر لالہ رخ کی نظریں پہلے ہی شہزادے کے چہرے پر لگی تھیں۔ شہزادہ جھیل خان کی معنی خیز نظر پر کسی رد عمل کا اظہار نہ کر سکا۔

جھیل خان شہزادے کو خاموش دیکھ کر بڑی خاموشی سے شکاری قافلے کے آگے آگے ہویا حالانکہ یہ اس کا شہزادے کو محض ایک دکھاوا تھا۔ اس میں اور لالہ رخ میں پیسے ہی طے پایا تھا کہ جھیل خان لالہ رخ کو اس جگہ پہنچ دے گا۔ جلد سے شہزادہ زخمی ہو کر واپس آیا تھا۔

جھیل خان نے اسی جگہ جا کر اپنا گھوڑا روکا اور لالہ رخ سے کہا:

کہہ دینا

شہزادہ تجور پر گھڑوں پانی پڑا گیا۔ اس نے شرمندہ ہو کر نظریں نیچی کر لیں۔

لالہ رخ نہ رہی تھی:

”تو ان نے گھر پہنچ کر ان کو کچھ نہ بتایا لیکن اس لڑکی کی محبت اس کے دل میں گھر کر چکی تھی اور اس کی یاد بڑھنے بڑھنے بیماری کی شکل اختیار کر گئی۔ اس سے شاید اس نے یہ بات اس لیے پوشیدہ رکھی کہ اس کی ماں پہلے ہی اس کے لیے ایک لڑکی کا انتخاب کر چکی تھی لیکن اس بیٹے نے یہ نہ خیال کیا کہ اس مادہ بیٹا ہی اس کی زندگی کا واحد سارا ہے۔ ایک لڑکی کی یاد تو اپنے پیچھے پر چین اور رشتہ کی تھاکر کیاں ترزاں کر سکتی تھی یہی نہیں اگر وقت پڑتا تو وہ بیٹے پر زور بھی نثار ہو جاتی۔“

لالہ رخ اس قدر جذباتی ہو گئی کہ اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ شہزادے کا بھی حیران تھا۔ وہ بری طرح دردمند تھا اور ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

آخر لالہ رخ نے آنسو پونچھے اور افسردہ لہجے میں بولی:

”اب شہزادے بیٹے، تمہیں اب اگر کچھ کہنا ہے تو کہو۔ شاید کہنے کی کوئی بات نہیں رہی۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں اب ہمیں اس کے پاس لے چلو۔ ہم تمہارے لیے اس سے بھیک مانگنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ اگر تم اس کا گھرا گاؤں نہیں جانتے تو چورہ کیڑے سے تلاش کرتے ہیں۔ ہم قسم کھاتے ہیں بغیر اس لڑکی کو ڈھونڈنے سے شام تک تو کہ محل نہ جائیں گے۔“

اب تو ہر بات آئینے کی طرح عیاں ہو گئی تھی۔

شہزادے کو جو کچھ کہنا تھا وہ خود لالہ رخ نے اس کی طرف سے کہہ دیا تھا اور اس کا جواب بھی دے دیا تھا۔ شہزادہ تجور نے نہایت فرمانبرداری سے لالہ رخ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنا گھوڑا اگے بڑھاتے ہوئے کہا:

”مادرِ مہربان! میں معاف کر دیجیے۔ چلیے ہم آپ کو اس کے پاس لیے پلتے ہیں لیکن اس نے لڑن ایک چلے میں ہماری محبت اور قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا۔“

”کیا کہا تھا اس نے؟“ لالہ رخ نے دلچسپی سے پوچھا۔

”اس نے کہا تھا: شہزادے نے یاد کرتے ہوئے کہا:

”کہ کسی کو منہ سے ایسی بات نہ نکالنا چاہیے جس کے لیے یہ خیال ہو کہ وہ سننے والے کو مار مار کر مرے گی۔“

لالہ رخ نے ایک طوفان برپا کیا۔ پھر بولی:

”کیا عمر ہوگی جیسا اس کی؟“

تیرہ چودہ سال۔ شہزادے نے بتایا:

”شاید اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہر چیز دولت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔“

لالہ رخ کو ہنسی آگئی۔ اس نے کہا:

”لڑکی کافی ذہین معلوم ہوتی ہے لیکن اس لڑکیوں کی بات کو نہ مقرر کی گئیر کچھ لینا بڑی نادانی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بہت سے خیالات بجا بجا کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اب اسے اپنے گھر پر انوس ہو گئیں وہ انوس کا انصار کیسے کرے۔ سن بڑا معزور ہوا کہ اب بیٹے۔ یہ بڑی مشکل سے سر ہو جاتا ہے۔“

پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی:

”تو اٹھو۔ لڑکی سرکش معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس کے قبیلے یا گاؤں والے بھی اسی کی طرح سرکش افراد ہوں۔ وہاں تنہا جانا مناسب نہیں۔“

لالہ رخ نے گھوڑا اموڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ جیسا خان اپنے ساتھیوں کے ساتھ ادھر ہی کو بیکر رہا تھا۔

لالہ رخ نے اسے اشارے سے بلایا۔ جیسا خان گھوڑا اموڑ کر خشتی خوشی اس کے پاس آگیا۔

لالہ رخ نے کہا:

”جیسا خان۔ تجھیں تیس سو اموں کو لے کر چارے پیچھے پیچھے آؤ۔ باقی سے کہو کہ ہماری واپسی کا انتظار کریں۔ ہم ایک خاص مقام پر جا رہے ہیں۔“

لفظ ”خاص“ پر لالہ رخ نے خاص طور پر زور دیا اور مسکرائی۔

جیسا خان تعین حکم کے لیے اپنے دست کی طرف لوٹ گیا۔

لالہ رخ اور شہزادہ تیمور جب جھونپڑی پر پہنچے تو لالہ رخ کے اشارے پر شہزادہ نے گھاس پھوس کے دروازے کو ہلایا۔

ماہ پارہ نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ تیمور اور اس کے ساتھ ایک پُر رعب خاتون کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔
 ”گھبراؤ نہیں ماہ پارہ۔ یہ میری ماں ہیں۔ شہزادے تیمور نے اسے تسلی دی۔
 ماہ پارہ فوراً سامنے سے ہٹ گئی اور ان لوگوں کو اندر لے جا کر بیٹھے پرانے کپڑے کی چادر پر بٹھا دیا۔

لالہ رخ نے جھونپڑی میں بڑی بڑی کو دیکھ کے دریافت کیا:

”یہ کون ہیں تمہاری ماہ پارہ؟“

”میری ماں ہیں یہ!“ ماہ پارہ نے مختصر سا جواب دیا۔

”اچھا۔ تم دونوں باہر چلے جاؤ۔ میں ماں سے کچھ بات کروں گی۔“

لالہ رخ نے دونوں کو حکم دیا اور وہ دونوں مرھٹکائے ہوئے باہر نکل گئے۔

لالہ رخ اور بڑی بی ایک گھنٹہ تک بات کرتی رہیں پھر باہر آئیں۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ انہو نے ماہ پارہ سے کہا:

”ماہ پارہ۔ میں نے شہزادے کے لیے تمہیں مانگ لیا ہے۔ انہوں نے شادی کی اجازت دے دی ہے۔ اگر تمہیں انکار ہے تو بتا دو۔“

ماہ پارہ نے نظر اٹھا کر لالہ رخ کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔

”ماں نے اجازت دے دی ہے تو پھر میں کیسے انکار کر سکتی ہوں؟ ماہ پارہ نے خالص فراقیہ والی مگول زبان میں لالہ رخ کو جواب دیا۔ لالہ رخ نے بھی اس سے مگولی زبان میں سوال کیا تھا۔

لالہ رخ نے علی پہنچ کر قبلائی خان کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ قبلائی خان ان دونوں صاحبزادہ

تھا۔ اس نے فوراً اجازت دے دی۔

اس کے بعد ہی قبلائی خان نے مغلوں کے پرانے مرض گنھیا سے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔